بسم الله الرحمن الرحیم

زادِ سفر

سلسلہ معارفِ اسلامی

کتابِ دوم

المہدیؑ ادارۂ تربیتِ اسلامی
آئی ایس او پاکستان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

اے ایمان والو! مصیبتوں پر صبر کرو دشمن کے مقابلہ میں استقامت کا مظاہرہ کرو، اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرو اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم کامیابی حاصل کرسکو۔ (آل عمران:۲۰۰)

اَللّٰهُمَّ كُنْ لِوَلِيِّكَ الْحُجَّةِ بْنِ الْحَسَنِ

صَلَوَاتُكَ عَلَيْهِ وَعَلٰى آبَائِهِ فِيْ هٰذِهِ

السَّاعَةِ وَفِيْ كُلِّ سَاعَةٍ وَلِيّاً وَحَافِظًا وَ

قَائِدًا وَنَاصِرًا وَ دَلِيْلاً وَعَيْنًا حَتّٰى تُسْكِنَه

اَرْضَكَ طَوْعًا وَتُمَتِّعَه فِيْهَا طَوِيْلاً

جمله حقوق بحق ناشر محفوظ هيں.

المہدیؑ ادارۂ تربیت اسلامی

آئی ایس او پاکستان

زادِ سفر
سلسلہ معارف اسلامی
کتاب دوّم

سال طبع: رجب المرجب ۱۴۳۸ ہجری، اپریل 2017ء

طبع: دوّم

تعداد: ۱۰۰۰

ناشر: المہدیؑ پبلیکیشنز لاہور، پاکستان

برائے رابطہ:

المہدیؑ ادارۂ تربیت اسلامی

5/A المصطفیٰ ہاؤس، مسلم ٹاؤن موڑ، وحدت روڈ، لاہور، پاکستان

فون: 04237078339,0334-4327768

ای میل: almahdi.isopak@gmail.com

انتساب

یہ قلیل سی سعی و کوشش

رہبر کبیر انقلاب حضرت آیۃ اللہ العظمی روح اللہ الموسوی الخمینی رضوان اللہ تعالی علیہ

اور

رہبر معظم انقلاب حضرت آیۃ اللہ العظمی سید علی خامنہ ای دام ظلہ العالی

کے نام کہ جنہوں نے تاریکیوں اور جہالتوں کے منجلاب میں پھنسی بشریت کو

انقلاب نور کے ذریعے آسمانی راستوں کی دوبارہ نشاندہی کی اور خالص محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کا احیاء کیا۔

ہماری دعا ہے کہ خدا رہبر معظم کو طول عمر عنایت فرمائے

اور

اس انقلاب کو انقلاب امام زمانہ (ع) کے ساتھ متصل فرمائے۔

آمین

فہرست

مقدمہ ۱

پہلی فصل

زندگی کی حقیقت ۳

پہلا سبق: تخلیق انسانی کا مقصد ۵

خلاصہ ۸

سوالات ۸

مطالعہ کیلئے: نیکی، معرفت کے مطابق ہوتی ہے ۹

دوسرا سبق: میں کیسے سعادت مند ہوسکتا ہوں؟ ۱۱

خلاصہ ۱۶

سوالات ۱۶

مطالعہ کیلئے: خدا کو کبھی فراموش نہ کرنا ۱۷

تیسرا سبق: زندگی کا انجام ۱۹

خلاصہ ۲۴

سوالات ۲۴

مطالعہ کیلئے: تشیعِ جنازہ کے آداب ۲۵

چوتھا سبق: مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ ۲۷

خلاصہ ۳۱

سوالات ۳۱

مطالعہ کیلئے: قبرستان جانے کے آداب ۳۲

دوسری فصل

راستے کے سنگ ہائے میل ۳۵

پہلا سبق: توبہ ۳۷

خلاصہ ۴۱

سوالات ۴۱

مطالعہ کیلئے: امام مہدیؑ کے نائبین خاص ۴۲

دوسرا سبق: دو گرانقدر چیزیں: نبی کریمؐ کی وصیت ۴۷

خلاصہ ۵۳

سوالات ۵۳

مطالعہ کیلئے: امام محمد بن علی الجوادؑ ۵۴

تیسرا سبق: صلۂ رحمی ۵۵

خلاصہ ۶۰

سوالات ۶۰

مطالعہ کیلئے: شیخ عبدالکریم الحائریؒ اور محتاج کی پکار ۶۱

چوتھا سبق: راہِ خدا میں جہاد ۶۳

خلاصہ ۶۷

سوالات ۶۷

مطالعہ کیلئے: آخری خواہش ۶۸

پانچواں سبق: لوگوں کے ساتھ معاشرت ۶۹

خلاصہ ۷۴

سوالات ۷۴

مطالعہ کیلئے: محفل میں بیٹھنے کے آداب ۷۵

چھٹا سبق: کامل ترین نماز ۷۷

خلاصہ ۸۱

سوالات ۸۱

مطالعہ کیلئے: نمازِ وتر ۸۲

تیسری فصل

سفر میں درپیش خطرات ۸۳

پہلا سبق: عزتِ نفس ۸۵

خاتمہ ۸۹
خلاصہ ۸۹
سوالات ۸۹
مطالعہ کیلئے: شیخ انصاری اور سہم امام کا ایک ریال ۹۰
دوسرا سبق: زبان کی آفات (جھوٹ، غیبت، فحش گوئی) ۹۱
خلاصہ ۹۶
سوالات ۹۶
مطالعہ کیلئے: مریض سے ملاقات کے آداب ۹۷
تیسرا سبق: حرام نگاہ ۹۹
خاتمہ ۱۰۳
خلاصہ ۱۰۴
سوالات ۱۰۴
مطالعہ کیلئے: پڑوسیوں کے آداب ۱۰۵
چوتھا سبق: حرام آوازوں کا سننا ۱۰۷
خلاصہ ۱۱۱
سوالات ۱۱۱
مطالعہ کیلئے: امام خمینیؒ کی ایک وصیت ۱۱۲
پانچواں سبق: حرام کھانا ۱۱۳
خلاصہ ۱۱۷
سوالات ۱۱۷
مطالعہ کیلئے: روز قیامت فقیر کا حساب ۱۱۸

چوتھی فصل

عبادات کے فقہی احکام ۱۱۹
پہلا سبق: علم فقہ حاصل کرنا ۱۲۱
خلاصہ ۱۲۴
سوالات ۱۲۴
مطالعہ کیلئے: امام مہدیؑ سے تعلق کے آداب ۱۲۵
دوسرا سبق: ولایتِ فقیہ ۱۲۹
خلاصہ ۱۳۲
سوالات ۱۳۲
مطالعہ کیلئے: مکاشفہ ۱۳۳
تیسرا سبق: نجاسات اور ان کے احکام ۱۳۵
خلاصہ ۱۳۷
سوالات ۱۳۷
مطالعہ کیلئے: مجھے نیند آرہی ہے ۱۳۸
چوتھا سبق: مطہرات ۱۴۱
خلاصہ ۱۴۴
سوالات ۱۴۴
مطالعہ کیلئے: امام سجادؑ کا فقراء کی خبر گیری کرنا ۱۴۵
پانچواں سبق: وضو ۱۴۷
خلاصہ ۱۵۰
سوالات ۱۵۰
مطالعہ کیلئے: مومن کی وضع قطع (۱) ۱۵۱
چھٹا سبق: غسل اور تیمم ۱۵۳
تیمم ۱۵۶
خلاصہ ۱۵۷
سوالات ۱۵۷
مطالعہ کیلئے: مومن کی وضع قطع (۲) ۱۵۸
ساتواں سبق: مقدماتِ نماز ۱۶۱
خلاصہ ۱۶۴
سوالات ۱۶۴
مطالعہ کیلئے: حضورِ قلب ۱۶۵

آٹھواں سبق: افعالِ نماز ۱۶۷
خلاصہ ۱۷۰
سوالات ۱۷۰
مطالعہ کیلئے: نمازِ غفیلہ ۱۷۱

گلستان جوانان

امام خمینیؒ اور انقلاب اسلامی ۱۷۵
رہبر معظم انقلاب سید علی خامنہ ای کی مختصر سوانح حیات ۱۸۷
رہبر معظم کے اخلاقی فضائل و علمی مقام ۱۹۴
رہبر معظم انقلاب اسلامی فقہاء و علماء کی نگاہ میں ۱۹۶
حسینی تحریک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عنصر: حصہ اول ۲۰۱
حسینی تحریک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عنصر: حصہ دوم ۲۲۱
حزب اللہ لبنان ۲۳۷
دین اور سیاست میں ربط ۲۴۵
آئین پاکستان کا تعارف ۲۶۳
شبہات اور ان کے جوابات ۲۷۹
آیات موضوعی ۳۰۵
احادیث موضوعی ۳۱۱

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و الصلاۃ و السلام علی اشرف خلقہ و اعزّ
مرسلیہ محمد بن عبد اللہ و آلہ الطیبین الطاہرین المعصومینؑ

معرفت، ایمان اور عمل صالح، کمال وسعادت کے حصول کی بنیادی شرائط ہیں، جب انسانِ سالک قرآن و اہلبیت علیہم السلام کے سائے میں اس گراں قدر توشے کو لیکر "آغازِ سفر" کرتا ہے تو اس راہ کے طولانی ہونے اور "زادِ سفر" کی قلّت کو شدّت سے محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولائے کائنات امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام تاریکی شب میں مصلائے عبادت میں کھڑے ہو کر حزین حالت میں آہ و نالہ کرتے ہوئے کائنات کی اس حقیقت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

آہِ مِنْ قِلَّةِ الزَّادِ، وَ طُولِ الطَّرِيقِ، وَ بُعْدِ السَّفَرِ

آہ! زادو توشہ کس قدر قلیل ہے اور راستہ وسفر کس قدر بعید وطویل۔

کتاب ہذا سلسلہ معارف اسلامی کی دوسری کڑی ہے کہ جس میں گذشتہ کتاب "آغاز سفر" کی طرح علمی انداز کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تربیتی پیرائے میں معارف کو تنظیم کیا گیا ہے۔ اور جوانوں کے ذہن میں ابھرنے والے سوالات اور انکی روزمرہ زندگی کے عقیدتی، اخلاقی اور شرعی مسائل کو تربیتی انداز میں منظم کر کے ان کے زادِ سفر کو مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں مباحث کو سلیس اور روان انداز میں جذاب اور نوجوانوں کے مزاج کے مطابق لکھا گیا ہے۔

زادِ سفر کے عنوان سے یہ کتاب کالج اور یونیورسٹی سطح کے طلاب کو مدنظر رکھتے ہوئے ترتیب دی گئی ہے البتہ دیگر سطوح کے افراد بھی اپنی بساط کے مطابق اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ کتاب قرآنی معارف واہل بیت علیہم السلام کے علوم سے مزین ہے اور سالک طریق کو توشہ راہ مہیا کرتی ہے تاکہ وہ ان علوم کو اپنی زندگی میں اپنا کر کمال کی بلندیوں کو چھو سکیں لہٰذا قارئین محترم اس کے متن کو تدبر اور تفکر کے ساتھ پڑھیں اور ان نکات کو عملی جامہ پہنانے میں سعی وتلاش کریں۔

خداوند متعال ہم سب کو اس الٰہی راستے میں بہترین زادِ سفر عنایت فرمائے۔

(آمین)

المہدیؑ ادارہ تربیت اسلامی
(آئی ایس او پاکستان)

پہلی فصل

زندگی کی حقیقت

- تخلیق انسانی کا مقصد
- میں کیسے سعادت مند ہو سکتا ہوں؟
- زندگی کا انجام
- مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

افراد اپنی قدر کو پہچانیں

ڈاکٹر محمد علی نقویؒ نوجوانوں کی خداداد صلاحیتوں کے معترف تھے۔ باصلاحیت نوجوان سے مل کر آپ کو دلی مسرت ہوتی۔ آپ فرماتے کہ خدا کی بے مثال نعمتوں میں سے صلاحیت، ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ جو شخص خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کو قوم، ملک اور اسلام کی خدمت کیلئے بروئے کار لاتا ہے وہ عدل کرتا ہے اور عدل تو بہت بڑی نیکی ہے۔ آپ ملازم پیشہ نوجوان سے اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے راہ خدا میں ضرور استعمال کریں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ دو گھنٹے جلسے، جلوس، میٹنگ یا دروس میں صرف ہوں بلکہ ان دو گھنٹوں میں دین شناسی کیلئے مطالعہ کر لینا بھی وقت کا بہترین مصرف ہے۔ بعض اوقات بعض باصلاحیت نوجوانوں کے بارے میں فرماتے کہ "فلاں نوجوان ضائع ہوگیا" حالانکہ وہ بظاہر کسی نہ کسی نیک کام میں مصروف ہوتا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ وہ شخص جتنی صلاحیتوں کا مالک ہے اور اس کی صلاحیتوں سے قوم کو جس قدر فائدہ پہنچ سکتا ہے نہیں پہنچ رہا۔ ایسے نوجوانوں سے بالمشافہ ملتے تو علامہ محمد اقبال کی فکر کو اپنے لبوں پر لاتے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تخلیق انسانی کا مقصد

- اللہ تعالیٰ نے مجھے کیوں پیدا کیا ہے؟
- مجھے دوسری مخلوقات کے مقابلے میں کونسا امتیاز عطا کیا گیا ہے؟
- میرا مقصدِ حیات کیا ہے؟

مقدمہ

اس دنیا میں انسان ہمیشہ سے اس سوال سے دو چار رہا ہے کہ وہ کونسا ہدف ہے جس تک اسے پہنچنا ہے اور وہ کونسا راستہ ہے جو اس ہدف تک پہنچا سکتا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ اجمالی طور پر اس حقیقت کا بخوبی ادراک رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے عبث پیدا نہیں کیا اور نہ ہی اسے کھیل کود کی غرض سے خلق فرمایا ہے، بلکہ اس کی تخلیق میں کوئی حکمت و دانائی کارفرما ہے جس کی وجہ سے اللہ عزوجل نے انسان کو خاص عزت و عظمت سے سرفراز کیا ہے۔ جیسا کہ قرآنی آیت میں تاکید کی گئی ہے کہ:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ

کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تمہیں عبث خلق کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹائے نہیں جاؤ گے؟

(المومنون: ۱۱۵)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ عزوجل نے ہمیں کیوں پیدا کیا ہے؟ اور وہ کونسا مقصد ہے جس کی طرف وہ ہمیں متوجہ کرنا چاہتا ہے؟

مقصد و ہدف کی ضرورت:

آغازِ کلام میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس وسیع و عریض کائنات میں پھیلی ہوئی تمام اشیاء کے خلق کرنے کا کوئی ہدف و مقصد ضرور ہے، اس کی کوئی غرض و غایت ہے اور ان کی کوئی ایسی ذمہ داری ہے جسے وہ سب سرانجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ زمین، چاند، سورج، سیارے اور ستارے الغرض تمام اشیاء اس کائنات کے عجیب و غریب نظام میں اپنا اپنا کردار نبھاتے ہوئے اپنا مقررہ فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ اسی طرح کرۂ ارضی میں مٹی، پانی، ہوا، نباتات اور حیوانات وغیرہ میں سے ہر ایک کو اپنا

اہم کردار سونپا گیا ہے جو اس نظامِ ہستی میں زندگی کے انتظام اور اس کی برقراری کیلئے لازمی حیثیت رکھتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ انسانی زندگی میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔

کائنات کے اس عظیم الشان نظام میں موجود تمام مخلوقات اپنی تخلیق اور تکوین میں خالق حکیم اللہ عزوجل کی طرف منسوب ہیں جس نے اپنی حکمت سے انہیں پیدا کیا اور اپنے علم کی بدولت ان کی حدود مقرر فرمائیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا

اور اس نے ہر شئے کو خلق کیا اور صحیح اندازے کے مطابق درست کیا (الفرقان: ۲)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ

یہ اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شئے کو محکم بنایا (النمل: ۸۸)

انسانی امتیاز:

یہ درست ہے کہ انسان بھی اسی قانونِ خلقت کے تحت اس کائنات میں موجود دوسری تمام اشیاء کے ساتھ مشترک ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے عقل جیسی خوبی سے آراستہ فرمایا اور اسے علم وفہم کی نعمت سے نوازا ہے۔ کیونکہ عقل اللہ عزوجل کی عطا کردہ ایسی عظیم نعمت ہے جو ہمیں شعور وادراک، مقاصد واہداف کے انتخاب کی صلاحیت، اور ان میں سے بہترین کو اختیار کرنے کی استعداد فراہم کرتی ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ تمام کائنات کی دوسری مخلوقات کے مقابلے میں ہم بنی نوع انسان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ہم جن مقاصد واہداف کو متعین کر کے ان تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان اہداف کے انتخاب میں اختیار بھی رکھتے ہیں اور انہیں پوری سمجھ بوجھ اور مکمل ارادہ کے ساتھ اپنی عقل کے ذریعے ان پر غور وفکر کر کے قبول کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اطمینان وتسلّی کے ساتھ ان کے نتائج کے بارے میں بھی سوچتے ہیں۔ چنانچہ کبھی انسان کو سخت بھوک لگی ہوتی ہے لیکن وہ کسی دنیوی مصلحت مثلاً بیماری وغیرہ کی حالت میں ہونے کی وجہ سے یا کسی اُخروی مقصد کی خاطر مثلاً جب وہ واجب روزہ کی حالت میں ہو تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ اسی طرح انسان عقل کی بدولت اپنی طبیعت اور فطرت پر قابو رکھتا ہے۔

عقل کی فضیلت میں کثیر احادیث وارد ہوئی ہیں۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنی مخلوقات میں عقل سے بڑھ کر زیادہ محبوب شئے پیدا نہیں کی ہے اور اللہ تعالیٰ جس سے راضی ہوتا ہے اسے عقل کامل عطا فرماتا ہے۔ اس کے علاوہ غور وفکر کرنے کے بارے میں انتہائی ترغیب دی گئی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سَنَةٍ

''ایک لمحہ غور و فکر کرنا سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔'' (مستدرک الوسائل، ج ۱۱، ص ۱۸۳)

اب اس تناظر میں، کیا ہم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اور ہمیں کونسی راہ اختیار کرنی چاہیے؟

ہدف کا تعیّن:

انسان جو کام بھی کرتا ہے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے جسے وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کھاتا ہے تاکہ اپنی بھوک مٹا سکے یا لذت حاصل کر سکے۔ اور نیند بھی لیتا ہے تاکہ آرام و سکون حاصل کر سکے۔ وہ کوئی نہ کوئی پیشہ اپناتا ہے اور مال و دولت جمع کرتا ہے تاکہ اپنی خوراک فراہم کر سکے اور دوسری ضروریاتِ زندگی پوری کر سکے۔ وہ اس لئے تعلیم حاصل کرتا ہے تاکہ مستقبل میں کامیاب زندگی بسر کر سکے۔ یہاں تک کہ کھیل کود میں بھی اپنی دلی تسکین اور توانائی کو بحال رکھنا اس کے مدنظر ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے ضروری کام سرانجام دینے کے قابل ہو جائے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی کے معمولات میں انتہائی مصروف رہتا ہے، اور اس دوران اس کی عقل و فہم اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے قاصر نظر آتی ہے کہ وہ کونسا اصلی ہدف ہے جسے میں اپنی زندگی میں حاصل کرنا چاہتا ہوں؟

مثلاً جب انسان کسی تجارتی کمپنی کا افتتاح کرتا ہے تو وہاں پر خرید و فروخت، ملازمین کے معاملات، اوقاتِ کار کی مناسب تقسیم بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ اس کا اصلی مقصد و ہدف صرف اپنی کمپنی کے لئے زیادہ سے زیادہ منافع کا حصول پیشِ نظر ہوتا ہے۔ اس طرح سے انسان کی روزمرہ سرگرمیوں کے ضمنی اہداف کی اہمیت اس کی زندگی کے اصلی ہدف کی بلندی اور اہمیت سے طے پاتی ہے۔

سعادت ہی اصلی ہدف ہے:

ہر انسان کا اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی ہدف ہوتا ہے، کسی انسان کا ہدف مستقبل میں ڈاکٹر یا انجینئر بننا ہوتا ہے، یا کوئی اس لئے محنت کرتا ہے کہ وہ کسی تجارتی کمپنی کا مالک بن جائے یا کسی پیشے میں مہارت حاصل کر لے۔ کسی کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح کوئی حکومتی عہدیدار، سیاسی و سماجی رہنما یا معاشرے کی کوئی مشہور و معروف شخصیت بن جائے۔ جبکہ کچھ دوسرے لوگوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو دین کی تبلیغ کریں اور انہیں دنیا و آخرت میں خیر و بھلائی کی طرف رہنمائی کریں۔

اس دنیا میں کثیر تعداد میں اہداف و مقاصد اور متعدد قسم کی خواہشات اور اُمنگیں سامنے آتی ہیں۔ لیکن کیا یہ مختلف خواہشات اور مقاصد ایک حقیقت کی طرف پلٹتے ہیں یا مختلف حقیقتوں کی طرف؟

کیونکہ ہم کسی ڈاکٹر سے جب یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا ہے؟ تو وہ کہتا ہے میرا مقصد اپنی اور

دوسروں کی جسمانی بیماریوں کا علاج معالجہ کرنا اور انہیں صحت مند رکھنا ہے ۔اور یہ چاہنے کی کیا وجہ ہے؟ تا کہ ہم سب صحت وعافیت اور سعادت کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں ۔اب اگر اس سے پوچھیں کہ عافیت اور سعادت کیوں چاہتے ہیں؟ تو وہ جواب دے گا: عافیت اور سعادت کی چاہت ایک فطری امر ہے اور ذاتاً مطلوب ہیں نہ کسی اور چیز کی خاطر ۔

اسی طرح انجینئر اور تاجر، سماجی کارکن اور رہنما، یہاں تک کہ عبادت گزار اور دینی عالم جو لوگوں کو رُشد وہدایت دینے کی خاطر قربانی پیش کرتا ہے، یہ سب کے سب سعادت کے طلبگار ہیں ۔اور اپنی پوری کوشش اور محنت صرف کرتے ہیں تاکہ سعادت مند ہوں اور آرام وسکون محسوس کرسکیں ۔ یہی وہ اصل ہدف ومقصد ہے جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم اس ہدف کو حاصل کرلیں ۔اللہ تعالیٰ زمان ومکان کی حدود سے بلند وبالا ہے ۔اس کی حکومت ہر شئے پر چھائی ہوئی ہے ۔اس کے اسمائے حسنیٰ اور بہترین مثالیں موجود ہیں ۔اس کی ذات کبریاء کی لاتعداد نعمتیں ہیں جن میں کوئی کمی نہیں کرسکتا ۔اس نے ہمیں اپنی رحمت کاملہ سے پیدا کیا اور وہ ہم سے کوئی منفعت یا فائدہ حاصل نہیں کرنا چاہتا ۔وہ غنی ہے اسے کسی چیز کی کوئی احتیاج نہیں ہے بلکہ اس نے ہمیں کمال وسعادت وخوشحالی کی منزل تک پہنچنے کیلئے خلق کیا ہے ۔

نتیجہ یہ کہ: انسان کی زندگی کا ہدف، سعادت کا حصول ہے ۔

سوالات

١۔ ہر موجود شئے کا کوئی نہ کوئی ہدف ومقصد ہے جسے حاصل کرنے کی خاطر وہ مشیّت الٰہی کے مطابق مصروف کار ہے ۔

٢۔ انسان کا امتیازی وصف عقل ہے جس کے ذریعے وہ پورے شعور واحساس کے ساتھ اپنے ہدف کو اختیار کرسکتا ہے ۔

٣۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں اصل ہدف متعین کرلینا چاہیے ۔

٤۔ سعادت ہی اصلی ہدف ہے جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا ہے اور اس کے حصول کی خاطر ہر انسان جدوجہد کررہا ہے ۔

خلاصہ

١۔ انسان اور دوسری مخلوقات کے لئے یقینی طور پر کسی ہدف کا ہونا کیسے ظاہر ہوتا ہے؟

٢۔ انسان کا وہ کونسا امتیاز ہے جو اسے اشرف المخلوقات بناتا ہے؟

٣۔ انسان مختلف اہداف کے حصول کی کوشش کرتا ہے، اس کا اصلی ہدف کونسا ہے؟

مطالعہ کیلئے

نیکی ،معرفت کے مطابق ہوتی ہے

امام حسینؑ کے پاس ایک اعرابی (بدو) آیا۔اس نے کہا اے فرزند رسولؐ!مَیں نے ایک پوری دیت ادا کرنے کی ضمانت دی لیکن اسے ادا کرنے سے قاصر رہا۔ چنانچہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ سب سے سخی وفیاض آدمی سے دست سوال دراز کروں گا جبکہ آلِ محمدؐ سے زیادہ مجھے کوئی سخی دکھائی نہ دیا۔

یہ سن کرامام حسینؑ نے اس سے فرمایا،مَیں تم سے چند سوال پوچھوں گا،اگرتم ایک سوال کا جواب دو گے تو مَیں تمہیں ایک تہائی مال دوں گا،اگرتم دوسوالوں کا جواب دو گے تو مَیں تمہیں دوتہائی مال دوں گااوراگرتم سب سوالوں کا صحیح جواب دو گے تو مَیں تمہیں (پوری دیت کا) مال دے دوں گا۔

اعرابی نے کہا اے فرزند رسولؐ! کیا آپ جیسے عظیم انسان مجھ جیسے عرب بدو سے سوال پوچھیں گے حالانکہ آپ علم وعظمت کے مالک ہیں؟

امام حسینؑ نے فرمایا،جی ہاں۔مَیں نے اپنے جد بزرگوار رسول اللہؐ سے سُنا،آپؐ فرماتے ہیں،نیکی علم کے مطابق ہوتی ہے۔

اعرابی نے عرض کی،آپ جو چاہیں سوال کریں،اگر مَیں صحیح جواب دے سکوں گا تو ٹھیک ہے ورنہ آپ سے سیکھ لوں گا۔

امام حسینؑ نے پوچھا: بہترین عمل کونسا ہے؟

اعرابی نے جواب دیا: اللہ پر ایمان رکھنا۔

امام حسینؑ: ہلاکت وتباہی سے نجات کیسے ممکن ہے؟

اعرابی: اللہ پر بھروسہ رکھنا۔

امام حسینؑ: انسان کے لئے باعث زِینت کیا ہے؟

اعرابی: ایسا علم جس کے ساتھ تحمل اور بردباری شامل ہو۔

امام حسینؑ: اگر انسان کے پاس یہ خوبی نہ ہوتو پھر کیا ہو؟

اعرابی : ایسا مال و دولت ہو جس کو خرچ کرنے میں اس کے دل میں سخاوت ہو۔

امام حسینؑ: اگر اس میں یہ خوبی موجود نہ ہو تو پھر کیا ہو؟

اعرابی: ایسا فقر و ناداری ہو جس میں وہ صبر کرے۔

امام حسینؑ: اگر اس میں ایسا کرنے کی ہمت بھی نہ ہو تو پھر کیا ہو؟

اعرابی: تو پھر آسمانی بجلی گرے اور اسے جلا کر راکھ کر دے کیونکہ وہ اسی لائق ہے۔

یہ سن کر امام حسینؑ مسکرا پڑے اور اسے ایک تھیلی عطا فرمائی جس میں ایک ہزار اشرفیاں تھیں۔ اس کے علاوہ آپؑ نے اسے اپنی انگوٹھی بھی عطا فرمائی جس میں ایک قیمتی نگینہ جڑا ہوا تھا اس کی قیمت دوسو درہم تھی۔ آپؑ نے اس سے فرمایا: یہ اشرفیاں اپنے قرض خواہوں کو دینا اور اس انگوٹھی کو بیچ کر اپنے اخراجات کا بندوبست کرنا۔ اعرابی نے اشرفیاں اور انگوٹھی لے کر یہ آیت پڑھی:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔''(الانعام: ۱۲۴)

میں کیسے سعادت مند ہوسکتا ہوں؟

- حقیقی سعادت کیا ہے؟
- سعادت حاصل کرنے کا راستہ کیا ہے؟
- دین میں ہی سعادت ہے...

مقدمہ

پچھلے سبق میں ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ سب لوگ سعادت کی تلاش میں ہیں۔ وہ تکالیف و پریشانیوں سے چھٹکارا پانے اور بدحالی سے بچنا چاہتے ہیں۔ اب بنیادی سوال یہ ہے کہ انسان حقیقی سعادت کیسے حاصل کرسکتا ہے؟

اختلاف آراء:

اکثر لوگوں کا نقطہ نظریہ ہے کہ لذات وشہوات سے جی بھر کر لطف اندوز ہونا یا بڑی بڑی جاگیروں اور کثیر مال واسباب کی جمع آوری یا حکومت وسرداری اور جاہ وجلال کا حصول ہی سعادت ہے، لیکن درحقیقت یہ چیزیں سعادت کے ہم پلہ نہیں، صرف خام خیالی، توہم اور جلد ختم ہو جانے والی چیزیں ہیں۔

اسی طرح دنیا کا طلب گار جب ڈھیر سارا مال واسباب جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے دولت، شہرت یا مقام و مرتبہ مل جاتا ہے تو وہ زیادہ مال کے حصول میں لگ جاتا ہے۔ اس راستے میں جو بھی اس کی مخالفت کرے یا اس سے مال و اسباب، شہرت یا مقام ومرتبہ چھیننے کی کوشش کرے تو وہ اس کا دشمن بن جاتا ہے۔ اور وہ جب پہلے سے بلند رتبہ حاصل کر لیتا ہے تو کسی منزل پر رکے بغیر اگلے مقام تک پہنچنے کی کوشش میں مگن ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ:

"مَثَلُ الدُّنْيَا كَمَثَلِ مَاءِ الْبَحْرِ كُلَّمَا شَرِبَ مِنْهُ الْعَطْشَانُ ازْدَادَ عَطَشاً حَتَّى يَقْتُلَ"

''دنیا کی مثال سمندر جیسی ہے جب پیاسا اس میں سے پانی پیتا ہے تو اس کی پیاس مزید بڑھ جاتی ہے
یہاں تک کہ وہ سمندر کا پانی پیتے پیتے ہلاک ہو جاتا ہے۔'' (کافی، ج ۲، ص ۱۳۶)

اور جب اس انسان کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو وہ اپنا جمع کردہ تمام مال و اسباب چھوڑ کر خالی ہاتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

◆ حقیقی سعادت:

مختلف مذاہب اور انحرافی مسالک کے پیروکاروں سے یہ بڑی غلطی ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنے حقیقی ہدف اور مقصد کو سمجھنے میں غور و فکر سے کام نہیں لیا، اپنی عقل کو صحیح معنوں میں استعمال نہیں کیا، اپنی صاف و شفاف فطرت اور وجدان سلیم کی طرف رجوع نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انہیں پتہ چل جاتا کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں وہ دائمی و حقیقی سعادت ہے کہ جس میں کسی قسم کا کوئی دکھ و تکلیف نہیں اور نہ ہی وہ ختم ہونے والی ہے۔ اور یہ چیز اس دنیا اور اس میں پائی جانے والی تمام اشیاء کے ذریعے محقق نہیں ہو سکتی، کیونکہ کمزور کو جب اس خوف اور کمزوری کا احساس ہوتا ہے کہ اسے امان لینے کی ضرورت ہے تو وہ طاقتور سے التجا کرتا ہے۔ اسی طرح کسی غریب و نادار کو اپنی جان بچانے اور کھانے کیلئے کچھ نہیں ملتا تو وہ کسی مالدار کے پاس پناہ لیتا ہے اس کے سایہ عطوفت میں آ جاتا ہے۔

مریض کو جب تکلیف اور درد ہوتا ہے تو وہ ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور اسی طرح جب خوفزدہ انسان کی وحشت و تنہائی بڑھ جاتی ہے تو وہ غمخوار پیارے رشتہ داروں کے پاس پناہ لیتا ہے۔ بلاشبہ انسان کو ہمیشہ قوت و طاقت، اطمینان، مال و دولت، خیر و عافیت اور بے حد پیار و محبت کی ضرورت رہتی ہے۔ اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ ان ضروریات کو زائل ہو جانے والے فانی امور سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حقیقی سعادت اور ہر طرح کا دائمی آرام و سکون صرف اسی ایک محبوب اور کامل ترین معشوق ذات کے پاس سے ہی مل سکتا ہے جسے فنا و زوال نہیں اور وہ ذات اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ہے۔ اسی لیے دعائے جوشن کبیر کے الفاظ ہیں:

"یا اَقْرَبَ مِنْ کُلِّ قَرِیب یا اَحَبَّ مِنْ کُلِّ حَبِیب ۔۔۔ یا اَقْوی مِنْ کُلِّ قَوِیٍّ ۔۔۔ ۔۔۔ یا اَرْاَفَ مِنْ کُلِّ رَؤُوف"

''اے سب قریب (اشیاء) سے زیادہ قریب!... اے سب محبوبوں سے زیادہ محبوب!... اے سب قویوں سے زیادہ قوی!... اے سب مہربانوں سے زیادہ مہربان!...''

امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

''بے شک نور فطرت نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ تمام بنی نوع انسان کے دل ایسے کمال کی جانب متوجہ رہتے ہیں جس میں کوئی نقص نہیں یعنی کمال مطلق، جس سے سب عشق و محبت کرتے ہیں۔۔۔ میرے عزیزو! غفلت سے بیدار ہو جاؤ اور اس بشارت سے خوش ہو جاؤ کہ تمہارا ایسا محبوب ہے جسے زوال

نہیں اور ایسا معشوق ہے جس میں کوئی نقص نہیں اور ایسا مطلوب ہے جس میں کوئی عیب نہیں اور یقینا وہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے۔''

چونکہ یہ سعادت غیر محسوس ہوتی ہے اور ختم ہونے والی لذات وشہوات کے ساتھ جمع نہیں ہوتی اس لئے جو شخص اس سعادت کا انکار کرتا ہے وہ انسان غفلت میں مبتلا ہوتا ہے یا فطرت سلیم سے دُور رہنے یا عقل سے عاری ہونے کی وجہ سے بصیرت سے محروم ہوتا ہے۔ کیونکہ حقیقی سعادت کی مثال تو ایسے باغ کی طرح ہے کہ جس کے ارد گرد بڑی بڑی دیواریں کھڑی ہوں اور ان میں چند دروازے ہوں اور اس باغ کے پیچھے ایک بہت وسیع بنجر صحرا ہو، اور یہ باغ کفار کی نظروں سے اوجھل ہو، کیونکہ یا تو یہ کفار گہرے گڑھوں میں پڑے ہیں یا وہ ہوا کے ایسے جھونکوں سے اُمید لگائے بیٹھے ہیں جن کی خوشبو دُور سے آ رہی ہے یا ایسے سراب کو دیکھ رہے ہیں کہ جسے وہ سعادت خیال کرتے ہیں لیکن جب وہ اس کے پاس پہنچتے ہیں تو وہاں کچھ بھی نہیں پاتے اور وہ اسی طرح گمراہی میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا

''اور جو شخص اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ (اندھے سے بھی) زیادہ گمراہ ہوگا۔''

(اسراء/ ۷۲)

سعادت کا راستہ:

مومن تو اپنی بصیرت سے حقیقی سعادت کو پہچان لیتے ہیں اور اپنی پاکیزہ فطرت کی وجہ سے اس کے خواہشمند ہوتے ہیں لہٰذا ان کیلئے صرف اس تک جانے والے راستے پر قدم بڑھانا باقی رہ جاتا ہے۔ اگرچہ انہیں اس راہ پر بعض مشکلات کو برداشت کرنا پڑتا ہے جن کا انہیں اپنے لقاء کے شوق اور لگن میں احساس تک نہیں ہوتا، یہاں تک کہ وہ ان مخصوص دروازوں سے داخل ہو جاتے ہیں۔

جبکہ اس راستے سے قرآن کریم ہمیں یوں آگاہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

''جو نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی ضرور عطا کریں گے اور ان بہترین اعمال کی جزاء میں ہم انہیں اجر (بھی) ضرور دیں گے۔'' (سورہ نحل/ ۹۷)

جبکہ وہ دروازے جن سے داخل ہونے کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا

''اور گھروں میں ان کے دروازوں کی طرف سے آؤ" (بقرہ: ۱۸۹)

تو یہ دروازے انبیاء کرامؑ اور آئمہ طاہرینؑ ہیں۔ چنانچہ حدیث نبویؐ میں ہے کہ: ”أَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ، وَعَلِيٌّ بَابُهَا“ میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔(وسائل الشیعۃ: ج ۲۷ص ۳۴)

امام زمانہؑ کے بارے میں دعائے ندبہ کے الفاظ ہیں :

”أَيْنَ بَابُ اللّٰهِ الَّذِي مِنْهُ يُؤْتَى“

”وہ باب اللہ (دروازہ الٰہی) کہاں ہے جہاں سے عطا کیا جاتا ہے“۔

اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نیک عمل صرف قوانین شریعت پر کاربند رہنا ہی ہے کہ جس کی طرف معصوم انبیاء و اوصیاء علیہم السلام نے رہنمائی فرمائی ہے۔اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ

” اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو جب وہ تمہیں حیات آفرین باتوں کی طرف بلائیں۔(سورہ انفال/ ۲۴)

بہرحال مومن کو حیات طیبہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی کہ جب تک وہ آیات قرآنی اور سنت نبویؐ کے ذریعے اللہ تعالیٰ اور رسول پاکؐ کے احکام پر عمل پیرا نہ ہو۔کیونکہ قرآن کریم شریعت مقدسہ کے عمومی قوانین کے بنیادی اصولوں کو واضح کرتا ہے جبکہ رسول اکرمؐ نے ان اصولوں کی فروعی حیثیت اور جزوی احکام کو واضح کرنے کی ذمہ داری اُٹھا رکھی ہے۔

اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوق کی خلقت کا ہدف ومقصد عبادت کیوں قرار دیا۔جب اس نے فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے۔ (سورہ ذاریات/ ۵۶)

اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور اس کی شریعت پر کاربند رہنا اور اس سے حقیقی تعلق کو برقرار رکھنا اور ان اوامر واحکام پر عمل کرنا کہ جن کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے وہی سعادت حاصل کرنے کا صحیح راستہ ہے۔

◆ ایمان، سعادت اور اطمینان:

جب انسان کے اندر یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی مددگار کوئی ایسی عظیم قوت ہے جسے کوئی شئے عاجز نہیں کر سکتی اور یہ ذات اس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے اور اسے تمام مشکلات سے چھٹکارا دلا سکتی ہے تو وہ ہرگز مایوسی، انحطاط، اور خوف میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ اسے آرام وسکون اور خوشی کی ایسی حالت میسر آتی ہے کہ جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

یہ مومن کی وہ حالت ہے جس میں اس نے اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرلیا ہے اور اس پر بھروسہ کیا ہوا ہے اور اللہ ایسا مہربان وبخشنے والا ہے جو اپنے بندوں پر ایک ماں کے اپنے بچوں سے پیار ومحبت سے کہیں زیادہ شفیق اور مہربان ہے۔ چنانچہ

اپنی بخشش ومہربانی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ

”(اے نبیؐ!) میرے ان بندوں سے کہہ دیں جنہوں نے اپنے نفس پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، بے شک اللہ تمام گناہوں کا معاف کرنے والا ہے اور وہ یقینا بہت زیادہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورہ زمر/ ۵۳)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا

”اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اسے کافی ہے، بے شک اللہ اپنے حکم کو پہنچانے والا ہے۔ اس نے ہر شئے کی ایک مقدار معین کر دی ہے۔ (سورہ طلاق/ ۳)

میرے دوستو! آئیے دعائے جوشن کبیر کے یہ عظیم جملے پڑھتے ہیں:

”یا مَنْ خَلَقَنی وَسَوّانی یا مَنْ رَزَقَنی وَرَبّانی یا مَنْ اَطْعَمَنی وَسَقانی یا مَنْ قَرَّبَنی وَ اَدْنانی یا مَنْ عَصَمَنی وَکَفانی یا مَنْ حَفِظَنی وَکَلانی یا مَنْ اَعَزَّنی وَاَغْنانی یا مَنْ وَفَّقَنی وَهَدانی یا مَنْ آنَسَنی وَآوانی یا مَنْ اَماتَنی وَاَحْیانی“

”اے وہ ذات جس نے مجھے بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا، اے وہ ذات جس نے مجھے رزق عطا فرمایا، اے وہ ذات جس نے مجھے کھلایا پلایا، اے وہ ذات جس نے مجھے اپنا قرب عطا کیا اور اپنے قریب کیا، اے وہ ذات جس نے مجھے گناہوں سے بچایا اور میری کفالت کی، اے وہ ذات جس نے میری حفاظت کی اور اے وہ ذات جس نے مجھے عزت بخشی اور مجھے مال و دولت دے کر تونگر (مالدار) بنادیا۔ اے وہ ذات جس نے مجھے توفیق دی اور ہدایت عطا کی، اے وہ ذات جس نے مجھ سے محبت کی اور اے وہ ذات جو مجھے موت (نیند) دیتا ہے اور پھر زندگی (بیدار کر) دیتا ہے۔“

خلاصہ

۱ دنیاوی سعادت جلد زائل (ختم) ہونے والی اور ایک توہم ہے۔

۲ حقیقی سعادت وہ ہے جس کی طرف پاکیزہ فطرت اور عقل سلیم ہماری رہنمائی کرتی ہے اور یہ اللہ کا قرب حاصل کرنا ہے، کیونکہ کمال مطلق تنہا اسی کی ذات ہے۔

۳ سعادت حاصل کرنے کا راستہ ایمان اور عمل صالح ہے۔

۴ عمل صالح، شریعت الٰہی پر عمل پیرا ہونا ہے جس کی طرف انبیاء کرام اور ان کے اوصیاء علیہم السلام نے رہنمائی فرمائی ہے۔

سوالات

۱ سعادت کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس حقیقت کا سمجھنا انسان کیلیے کیوں ضروری ہے؟

۲ حقیقی سعادت کس چیز سے حاصل ہوتی ہے؟

۳ وہ کونسے عوامل ہیں جو سعادت کی شناخت میں غلطی کا سبب بنتے ہیں؟

مطالعہ کیلئے

خدا کو کبھی فراموش نہ کرنا

شہید چمرانؒ عہد و پیمان اور وعدے کے سخت پابند تھے۔ وعدہ خلافی کرنا ان کے لئے نہایت دشوار تھا جب چمرانؒ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے امریکہ جارہے تھے تو آپ کی ماں پریشان تھیں کہ ان کا بیٹا امریکہ جیسے ملک جارہا ہے جہاں سب سے پہلے دین، اخلاق اور ایمان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ آپ کی ماں نے تہران ائیر پورٹ پر چند جملے نصیحت کر کے انہیں رخصت کیا۔" میرے بیٹے مصطفیٰ میں نے تمہیں پالا، میں نے جان و دل سے تمہاری پرورش کی ہے اب جبکہ تم جارہے ہو میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتی اور نہ ہی کسی چیز کی تم سے توقع رکھتی ہوں میں صرف ایک نصیحت کرتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ خدا کو کبھی فراموش نہ کرنا۔" ماں کی اس پرخلوص نصیحت نے چمران کو جگہ جگہ پر سہارا دیا ان کو دین، اخلاق اور انسانیت کی ڈگری سے دور نہیں ہونے دیا، امریکہ، مصر اور لبنان میں کئی طرح کے نشیب و فراز والے بائیس سال گزارنے کے بعد جب شہید چمرانؒ ایران واپس لوٹے تو اسی تہران ائیر پورٹ پر اپنی ماں سے خطاب کرتے ہوئے لکھا: (اسی مقام پر ان کی ماں نے انہیں خدا کو فراموش نہ کرنے کی نصیحت کی تھی لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں تھیں)" اے ماں! میں بائیس سال کے بعد اپنے پیارے وطن لوٹ رہا ہوں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس طویل عرصہ میں، میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی خدا کو فراموش نہیں کیا۔ ماں! خدا کا عشق میرے وجود کے ساتھ اس قدر مل گیا ہے کہ اب زندگی کا ایک لمحہ بھی اس کے بغیر گزرنا ممکن نہیں۔ ماں میں خوش ہوں لیکن اس لئے نہیں کہ ایک طویل عرصہ بعد وطن لوٹ رہا ہوں بلکہ اس لئے کہ ہمارے زمانے کا ایک بڑا طاغوت شکست کھا گیا ہے ظلم و فساد کی جڑیں کٹ گئی ہیں اور آزادی و استقلال کی ہوائیں چلنے لگی ہیں۔"

شہید ڈاکٹر مصطفی چمرانؒ کا وصیت نامہ

اپنے آپ کو موت کے لئے تیار کر چکا ہوں۔ یہ ایک فطری چیز ہے جس سے مدتوں سے آشنا ہوں لیکن پہلی بار وصیت کر رہا ہوں اس راہ میں شہید ہونے پر خوش ہوں اس بات پر مسرور ہوں کہ میں نے دنیا اور اس میں موجود اشیاء سے ناطہ توڑ دیا ہے۔ ہر دنیاوی چیز سے قطع تعلق کر چکا ہوں مادی دنیا سے دل لگی کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔ دنیا و مافیہا کو تین طلاقیں دے چکا

ہوں اور دامن پھیلائے شہادت کے استقبال کے لئے جا رہا ہوں۔

مجھے لبنان آنے اور پانچ چھ سال سخت مشکلات کے ساتھ زورآزمائی کرنے پر افسوس نہیں ہے۔امریکہ چھوڑنے، لذتوں اور راحت طلبی کی دنیا کو پس پشت ڈالنے، دنیائے علم کو فراموش کرنے اور ہر طرح کی زیبائی، اپنی عزیز بیوی اور پیارے بچوں کی یادوں کو بھلانے پر نادم و پشیمان نہیں ہوں۔ میں نے اس مادی اور راحت طلبی کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی اور درد، محرومیت، رنج، تہمت، فقر اور تنہائی کی دنیا کو اختیار کیا محرومیت سے ہم نشین ہوا، دردمندوں اور شکستہ دلوں کے ساتھ ہمنوا ہوا، سرمایہ داروں اور ستمگروں کی دنیا سے نکل کر محروموں اور مظلوموں کی دنیا میں داخل ہوا۔اس سب کے باوجود پشیمان نہیں ہوں۔تین خصوصیات نے مجھے ممتاز و منفرد بنا دیا ہے۔

۱۔عشق:

جوکہ میری گفتگو، میری نگاہ، میرے ہاتھوں کی حرکات وسکنات اور میری حیات و ممات سے ٹپکتا ہے میں عشق کی آگ میں جل رہا ہوں۔میرے نزدیک زندگی کا ہدف عشق کے سوا کچھ نہیں، اپنی زندگی میں عشق کے سوا کسی اور چیز کا خواہاں نہیں ہوں اور میں فقط عشق کے ساتھ زندہ ہوں۔

۲۔فقر:

ہر چیز کی قید و اسارت سے آزاد ہوں ہر چیز سے بے نیاز ہوں اگر زمین و آسمان مجھے عطا کر دیے جائیں تو بھی مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

۳۔تنہائی:

جوکہ مجھے عرفان سے متصل کرتی ہے مجھے محرومیت سے آشنا کرتی ہے جوکوئی عشق کا محتاج ہو وہ تنہائی کی دنیا میں عشق کی محرومیت سے جلتا ہے خداوند کے سوا اسکی تاریک راتوں کا کوئی انیس نہیں بن سکتا۔ستاروں کے سوا اس کے اشکوں کو کوئی نہیں پونچھ سکتا اس کے راز و نیاز کو صرف بلند و بالا پہاڑ سنتے ہیں۔سحر کے وقت چہچہانے والے پرندوں کے سوا اس کے وقت سحر کے نالہ وفریاد کو کوئی محسوس نہیں کر سکتا۔

زندگی کا انجام

- موت کی حقیقت کیا ہے؟
- ہم موت سے کیوں ڈرتے ہیں؟
- بہترین موت کونسی ہے؟

مقدمہ

کبھی کبھار انسان ہر شئے کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بالکل واضح اشیاء کے بارے میں بھی شکوک وشبہات میں پڑ جاتا ہے۔لیکن کوئی بھی انسان موت کی حقیقت کا منکر نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس کے برحق ہونے میں شک کی کوئی گنجائش ہے۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ

(اے رسول) یقیناً آپ کو بھی انتقال کرنا ہے اور انہیں بھی یقیناً مرنا ہے۔(سورہ زمر/ ۳۰)

البتہ اس تمام صورت حال کے باوجود ہم موت سے بہت زیادہ غافل ہیں۔دنیا کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا موت کی حقیقت کو قبول نہیں کرتے،جبکہ موت ایسی حقیقت ہے جو آ کر رہے گی۔امام صادق علیہ السلام نے فرمایا :

" مَا خَلَقَ اللهُ عَزَّوَ جَلَّ يَقِيناً لَا شَكَّ فِيهِ أَشْبَهَ بِشَكٍّ لَا يَقِينَ فِيهِ مِنَ الْمَوْتِ"

میں نے موت جیسی یقینی اور غیر قابل تردید حقیقت نہیں دیکھی کہ جس کے ساتھ مشکوک اور غیر یقینی شئی جیسا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ (من لایحضرہ الفقیہ: ج۱ص ۱۹۴)

موت یقینی ہے جس میں کوئی بھی شک نہیں کرتا لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ موت کے آنے میں لوگوں کو تردید لاحق ہے کیونکہ اکثر اپنی زندگی میں اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے اور خیال کرتے ہیں کہ جیسے انہوں نے کبھی نہیں مرنا۔

ایک خوفناک حقیقت:

اکثر لوگ موت کو ناپسند کرتے ہیں اور اس سے خوف زدہ رہتے ہیں بلکہ جب انہیں موت کے آثار نظر آتے ہیں تو ان کا جوڑ جوڑ کانپ اٹھتا ہے، دلوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور ان کے اعضاء میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔قرآن کریم نے لوگوں کی اس حالت کو کیا خوبصورت اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔جب مشرکین نے ہر طرف سے مسلمانوں کو گھیر لیا تو کچھ مسلمانوں کی یہی حالت تھی۔جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَا

جب وہ (کفار) تمہارے اوپر اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے اور جب آنکھیں پتھرا گئیں اور (مارے دہشت کے) دل (کلیجے) منہ کو آگئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔

(سورہ احزاب/۱۰)

یہاں تک کہ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو دنیا کے بہادر ترین افراد پر بھی جب موت کا وقت آتا ہے تو ان کی بے بسی ظاہر ہو جاتی ہے اور جان کنی کے وقت وہ بہت کمزور اور چھوٹے نظر آتے ہیں بلکہ ان میں سے متعدد افراد کے عقائد و نظریات بھی بدل جاتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے کہ فرعون جو اس قدر جابر حکمران تھا کہ اس نے اپنی خدائی کا دعویٰ کر دیا۔جس کے بارے میں قرآن کریم یوں کہتا ہے کہ:

فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی پھر کہنے لگا: میں ہی تمہارا رب اعلیٰ ہوں. (سورہ نازعات: ۲۴)

لیکن جب وہ دریائے نیل میں ڈوبنے لگا تو اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے:

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَکَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے گزار دیا تو فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور زیادتی کرتے ہوئے ان کا تعاقب کیا، یہاں تک کہ جب فرعون غرق ہونے لگا تو کہنے لگا: میں ایمان لے آیا کہ اس ذات کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں مسلمانوں میں سے ہو گیا ہوں۔

(سورہ یونس: ۹۰)

عباسی خلیفہ مامون الرشید نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک مرتبہ صحرا میں پڑاؤ کا حکم دیا۔جب رات کا وقت ہوا اور میدان میں سپاہیوں نے ادھر اُدھر آگ جلائی، جس کے بلند و بالا شعلے بڑے خوفناک دکھائی دے رہے تھے، مگر ذرا سی بلندی کے بعد غائب ہو جاتے، یہ منظر دیکھ کر مامون نے سوچا کہ اس کی تمام خواہشات بھی ہوا کے جھونکوں کی طرح اُڑ گئی ہیں اور

تکلیف کے ان لمحات میں اس کی حکومت اسے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ کرب کے ان لمحات میں اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور چیخ اُٹھا:

''اے وہ ذات کہ جس کی حکومت کو بقاء و دوام حاصل ہے۔ اپنے اس بندے پر رحم فرما جس کی حکومت اس کے ہاتھ سے نکل رہی ہے اور اس کی عزت و وقار خاک میں مل رہا ہے۔''

اسی طرح دنیاداروں کی خواہشات اور آرزوئیں بھی ایک لمحہ میں ختم ہو جاتی ہیں، ان کی امیدوں کی بے وقعتی ظاہر ہو جاتی ہے اور ہر شئے ضائع ہو جاتی ہے۔

ہم موت سے کیوں خوفزدہ ہوتے ہیں؟

اگر ہم اس کا سبب تلاش کریں تو دو میں سے ایک امر کو دیکھتے ہیں، یا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم موت کی حقیقت سے ناواقف ہیں، ہم موت کو فناء سمجھتے ہیں اور ختم ہونا اور معدوم ہونا سمجھتے ہیں، یا ہم حب دنیا میں ڈوب چکے ہیں اس کے فتنوں اور رعنائیوں میں کھو کر رہ گئے ہیں اور ہم میں سے اکثر لوگ اس کی نعمتوں سے جائز و ناجائز ہر طرح سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب موت آتی ہے تو دنیا اور اس سے جڑا تعلق کٹ کر رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے ہمیں تکلیف اور سختی محسوس ہوتی ہے اور موت کا نام آتے ہی ہمارے اندر قلق اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے جب دنیا سے تعلق مضبوط ہو جاتا ہے تو جس پر موت وارد ہوتی ہے اسے بہت تکلیف اور سختی محسوس ہوتی ہے۔

امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

''مَنْ كَثُرَ اشْتِبَاكُهُ بِالدُّنْيَا كَانَ أَشَدَّ لِحَسْرَتِهِ عِنْدَ فِرَاقِهَا''

''جو دنیا کے جال میں بُری طرح پھنس جاتا ہے تو اس کی دنیا سے جدائی اس کیلئے زیادہ حسرت کا باعث ہوتی ہے۔'' (کافی، ج ۲ ص ۳۲۰)

موت کی حقیقت :

اس قلق و اضطراب سے چھٹکارا پانے کیلئے ہمیں سب سے پہلے موت کی حقیقت کو جاننا ضروری ہے۔ موت انسان کی روح کا دنیاوی زندگی سے منتقل ہونا، بدن سے روح کا تعلق منقطع کر کے عالم آخرت اور ابدی زندگی کی طرف پرواز کرنا ہے۔ یہ دو جہان ہیں، ان دونوں جہانوں میں انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ پہلا جہان، عالم دنیا ہے اور دوسرا جہان، عالم آخرت ہے۔ موت ایک ایسی پُل ہے جو دارِ فانی سے دارِ بقاء کی طرف منتقل ہونے کے کام آتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"إِنَّمَا الدُّنْيَا دَارُ مَجَازٍ وَ الْآخِرَةُ دَارُ قَرَار"

"دنیا عبور کرنے کی جگہ ہے اور آخرت سکونت کی جگہ۔" (نہج البلاغہ، خطبہ: ۲۰۴)

اس کے باوجود ہمارا موت کو ناپسند کرنا ہمارے قلوب میں دنیا کی انتہائی محبت، اسے تعمیر کرنے اور اس کے مال و اسباب اور سامانِ زیب و زینت کو اکٹھا کرنے اور آخرت کی تعمیر سے غفلت کرنے کی وجہ سے ہے۔ اسی لیے ہم آباد اور عیش و عشرت والی جگہ کو چھوڑ کر تباہ شدہ اور ویران جگہ پر منتقل ہونے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔

ایک آدمی نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے پوچھا:

اے ابوذر! ہمیں کیا ہوگیا ہے کہ ہم موت سے بھاگتے ہیں؟" تو انہوں نے جواب دیا تم نے اپنی دنیا آباد اور آخرت برباد کر لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم آباد جگہ کو چھوڑ کر ویرانے میں جانا ناپسند کرتے ہو" (اُصول کافی، ج۲،ص ۸۵۴)

ایمان اور موت سے محبت:

بلا شبہ اصل مؤقف تو یہ ہے کہ مومن حقیقی کو موت کو ناپسند نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی موت سے اُسے خوف و وحشت کھانی چاہیے بلکہ وہ بعض اوقات تو موت سے محبت اور عشق کرتا ہے جیسا کہ امیر المومنینؑ سے روایت ہے کہ :

"وَ اللّٰهِ لَابْنُ أَبِي طَالِبٍ آنَسُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْيِ أُمِه"

"بخدا! ابوطالب کا بیٹا موت سے اس قدر مانوس ہے جتنا کہ بچہ اپنی ماں کے سینے سے اُنس رکھتا ہے۔"

(نہج البلاغہ: خطبہ ۵)

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ باقی رہنے کو پسند کرتا ہے اور ابدی زندگی سے عشق کرتا ہے۔ وہ نقصان اور خسارے سے نفرت کرتا ہے۔ جبکہ موت کا مطلب دارِفناء سے دارِقرار کی طرف منتقل ہونا ہے۔ تو کیا انسان دارِقرار اور بقاء کو ناپسند کرتا ہے؟ جی ہاں؟ عقلی علم اور عقیدہ قلبی، ایمان اور اطمینان سے مختلف ہے یہی وجہ ہے کہ آخرت کے ابدی ہونے پر یقین رکھنے کے باوجود ہمارے دل دُنیوی زندگی کی طرف مائل ہیں۔ امام خمینیؒ اس بارے میں فرماتے ہیں:

"بلاشبہ ہماری اس بدبختی اور شقاوت کی وجہ یوم قِیامت پر ہمارا ناقص ایمان اور عالم آخرت پر اطمینان کا نہ ہونا ہے۔ اگر ہم اپنے دلوں میں دنیوی زندگی اور اس کے عیش و آرام کی نسبت عالم آخرت اور وہاں کی ابدی زندگی سے دسواں حصہ بھی ایمان رکھتے تو یقینا ہمارے دل اُخروی زندگی کی طرف مائل ہو جاتے اور ہم آخرت سے عشق و محبت کرتے۔ نیز ہم اس راہ کی اصلاح کرنے اور اس میں ترمیم کرنے کی تھوڑی کوشش ضرور کرتے۔ لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ آخرت پر ہمارا ایمان دل سے ختم ہو گیا ہے اور ہمارا یقین متزلزل ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم موت، فناء اور زوال سے خوفزدہ ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں بنابرایں اس کے علاج کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم فکر، نفع بخش ذکر، علم اور عمل صالح کے ذریعے قلبی ایمان کو قبول کریں۔

بہترین موت:

انسان جب سفر کرتا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ لوازمات سفر میں سے کوئی چیز فراموش نہ کرے۔ اور وہ ایسے مقام کی طرف سفر کرے کہ جہاں اس کی مرغوب اور پسندیدہ چیزیں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ انسان اپنی اُخروی زندگی اور سفر کیلئے جہاں اور نیکیاں بھیجتا ہے وہیں ایک انتہائی قیمتی شئے بھی بھیجتا ہے اور وہ راہِ خدا میں اپنی جان (خون) کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔ کیونکہ یہ ایسا عطیہ ہے جس کے صلے میں اللہ تعالیٰ کی کریم ذات اس کو انتہائی باعظمت اجر عطا فرماتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَيَقۡتُلُوۡنَ وَيُقۡتَلُوۡنَ

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے کہ یہ لوگ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں، دشمنوں کو قتل کرتے ہیں اور پھر خود بھی قتل ہو جاتے ہیں۔ (التوبہ:۱۱۱)

اللہ مجاہد مومنین کی جانوں کا خریدار بن جاتا ہے اور اس کے عوض انہیں جنت عطا کرتا ہے۔ یہ کس قدر عظیم سودا ہے جو خالق اور اس کے خاص بندوں کے درمیان قرار پا رہا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

"إِنَّ أَكْرَمَ الْمَوْتِ الْقَتْلُ وَ الَّذِي نَفْسُ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ بِيَدِهِ لَأَلْفُ ضَرْبَةٍ بِالسَّيْفِ أَهْوَنُ عَلَيَّ مِنْ مِيتَةٍ عَلَى الْفِرَاشِ"

"(راہِ خدا میں) قتل ہو جانا انتہائی عزت کا باعث ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں فرزند ابوطالب کی جان ہے! تلوار کی ہزار ضربتیں اطاعت الٰہی کے بغیر بستر پر آنے والی موت سے میرے لئے زیادہ آسان ہیں۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ:۱۲۳)

اور جب ابن زیاد نے امام زین العابدینؑ کو قتل کی دھمکی دی تو آپؑ نے فرمایا: اے ابن زیاد کیا تو مجھے قتل ہونے سے ڈراتا ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ قتل ہونا ہماری عادت (معمول) اور شہادت ہمارے لئے باعثِ عظمت ہے۔" (بحار۔ ج ۴۵ ص ۱۱۸)

پس پتہ چلا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونا ایک عظیم اور باشرف موت ہے۔

اسی تناظر میں ہم دنیا بھر کے اسلامی تحریکوں کے مجاہدین بالخصوص کشمیر، فلسطین اور لبنان میں استکبار کے مدمقابل برسرِ پیکار مجاہدین کو میدان جہاد میں شوقِ شہادت اور اس میں کامیابی کیلئے ایک دوسرے پر سبقت لیتے دیکھ رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ بلند ایمانی درجات اور اطمینان و سلامتی کے مراتب پر فائز ہیں۔

خلاصہ

۱ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا سامنا ہر انسان کو کرنا ہے۔

۲ ہم موت کو اس لئے ناپسند کرتے ہیں کیونکہ ہم اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور اس کیلئے آمادہ بھی نہیں ہیں۔

۳ موت، دنیائے فانی سے حیات ابدی (دائمی زندگی) کی طرف منتقل ہونے کیلئے ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے۔

۴ دائمی زندگی پر ہمارا قلبی اطمینان ہمیں اس کیلئے بہترین تیاری کرنے اور وہاں آباد ہونے کیلئے آمادہ کرتا ہے۔

۵ بہترین موت راہ خُدا میں شہید ہو جانا ہے۔

سوالات

۱ ہم موت کو ناپسند اور دنیا میں زندہ رہنے کو کیوں پسند کرتے ہیں؟

۲ موت کی حقیقت کیا ہے؟ اور کیا موت کا مطلب فناء ہو جانا ہے؟

۳ امیر المومنینؑ کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے ''میں نے موت جیسا کوئی اور یقینی امر نہیں دیکھا کہ جس میں شک کیا جاتا ہو''؟

۴ بہترین موت شہادت کیوں ہے؟

مطالعہ کیلئے

تشیعِ جنازہ کے آداب

۱۔ جب انسان جنازے کی طرف دیکھے تو

اللهُ أَكْبَرُ هَذَا مَا وَعَدَنَا اللهُ وَ رَسُولُهُ وَ صَدَقَ اللهُ وَ رَسُولُهُ اللَّهُمَّ زِدْنَا إِيمَاناً وَ تَسْلِيماً الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِى تَعَزَّزَ بِالْقُدْرَةِ وَ قَهَرَ الْعِبَادَ بِالْمَوْتِ لَمْ يَبْقَ فِى السَّمَاءِ مَلَكٌ إِلَّا بَكَى رَحْمَةً لِصَوْتِهِ

کے الفاظ اس کی زبان پر جاری ہوں۔

۲۔ جب جنازہ اُٹھائے تو کہے: بسم اللہ و باللہ صلی اللہ علی محمد و آل محمد اللھم اغفر للمومنین و المومنات

۳۔ اگر کوئی عذر و مجبوری نہ ہو تو جنازہ کو اپنے کندھوں پر اُٹھانے میں شریک ہو۔

۴۔ تشیع جنازے کرنے والا خشوع و خضوع کی حالت میں سوچ رہا ہو کہ خود اس کی میت کو اٹھایا جا رہا ہے اس سے سوال کیے جا رہے ہیں اور وہ جواب دے رہا ہے اور اسے جواب دینے میں کتنی مشکل ہو رہی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ جب آپ کسی جنازہ کو قبرستان لے جا رہے ہوں تو یاد رکھیں کہ اس کے بعد آپ کی میت کو اٹھایا جانے والا ہے۔

۵۔ جنازہ کے پیچھے یا اس کے دائیں بائیں ہو کر چلے، اس کے آگے مت چلے، بہتر یہ ہے کہ اس کے پیچھے چلے۔

۶۔ جنازہ پر ایسا کپڑا ڈالا جائے جس پر زیب و زینت نہ ہو۔

۷۔ جنازہ کو چاروں اطراف سے پکڑا جائے۔

۸۔ جنازہ اُٹھاتے ہوئے آہستہ اور مختصر کلام کرنا مستحب ہے۔

۹۔ میت کو چارپائی (تابوت) میں رکھنا مستحب ہے۔

تشیع جنازہ کے مکروہات

۱۔ تشیع جنازہ کے دوران ہنسنا، لہو و لعب (کھیل کود) اور آواز بلند کرنا مکروہ ہے۔

۲۔ ذکر الٰہی، دعا اور استغفار کے علاوہ دوسری باتیں کرنا مکروہ ہے۔

٣۔ عورتوں کا جنازہ کے ساتھ چلنا مکروہ ہے اگر چہ وہ میت عورت کی ہی کیوں نہ ہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

''ایک دفعہ رسول اللہؐ باہر تشریف لائے آپؐ نے کچھ عورتوں کو بیٹھے ہوا دیکھا۔ آپؐ نے پوچھا تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ انہوں نے جواب دیا جنازہ اُٹھانے کیلئے بیٹھی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم بوجھ اُٹھانے والوں کے ساتھ بوجھ اُٹھاتی ہو؟ انہوں نے جواب دیا نہیں آپؐ نے فرمایا جو غسل دیتا ہے تم بھی اس کے ساتھ غسل دیتی ہو؟ انہوں نے جواب دیا نہیں آپؐ نے فرمایا جو کنویں سے پانی نکالتا ہے کیا تم بھی اس کے ساتھ پانی نکالتی ہو؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا پھر واپس گھروں کو لوٹ جاؤ کیونکہ نہ تمہاری ذمہ داری جنازہ اٹھانا ہے اور نہ اس پر تمہیں اجر و ثواب ملے گا۔'' (الوسائل: ج ٣)

٤۔ اس قدر تیز چلنا مکروہ ہے جو میت کے ساتھ نرمی کیساتھ پیش آنے کے خلاف ہو بلکہ درمیانی رفتار میں چلنا چاہیے۔

٥۔ انسان کا اپنے چہرے پر یا کسی دوسرے مقام پر پیٹنا۔

٦۔ دو میتوں کو ایک چار پائی (تابوت) میں رکھ کر جنازہ اُٹھانا مکروہ ہے۔

٧۔ جب تک میت کو قبر میں نہ اُتار دیا جائے اس وقت تک جنازہ کے ساتھ آنے والوں کا بیٹھنا مکروہ ہے۔

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

- مرنے کے بعد قیامت سے پہلے ہم کہاں ہوں گے؟
- حساب کے مراحل کیا ہیں؟
- آخری ٹھکانہ۔۔۔

مقدمہ

ہمیں یہ حقیقت معلوم ہو چکی ہے کہ موت دنیاوی زندگی سے آخرت کی زندگی کا ایک سفر ہے اور اس سفر کے آخری مقام پر پہنچنے کیلئے مسافر کو راستے میں کئی منازل اور مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اور اس زندگی سے حیات ابدی کی طرف سفر کی راہ میں کن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے؟ اسکی مختصر تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ عالم برزخ (قیامتِ صغریٰ):

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر انسان مرنے کے بعد روزِ قیامت تک کیلئے منتقل ہوتا ہے۔ اس عالم برزخ میں انسان روزِ قیامت میں بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونے اور پھر ابدی زندگی گزارنے کیلئے اس طرح آمادہ کیا جاتا ہے جس طرح بچے کو اس دنیا میں آنے کیلئے شکم مادر میں رکھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس انسان کی زبان میں کہ جس پر موت کا وقت قریب آتا ہے تو وہ نیک اعمال بجالانے کیلئے اس دنیا میں پلٹنے کی درخواست کرتا ہے، یوں بیان فرمایا ہے:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آ گئی تو کہنے لگا کہ پروردگار مجھے دنیا میں پلٹا دے۔ شاید میں اب کوئی نیک عمل انجام دوں۔ (المومنون۔ ۹۹)

تو خداوندمتعال اس کا جواب یوں دیتا ہے :

كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ

''ہرگز نہیں یہ ایک بات ہے جو یہ کہہ رہا ہے اور ان کے پیچھے ایک عالم برزخ ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہنے والا ہے۔''(المومنون/۱۰۰)

اور جب امام علیہ السلام سے عالم برزخ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا :

" اَلْقَبْرُ مُنْذُ حِيْنِ مَوْتِهِ إِلَى يَوْمِ القيامة"

''انسان کے مرنے کے بعد روز قیامت تک کا عرصہ قبر میں رہنا'' (کافی، ج ۳ص ۲۴۲)

اور بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کی قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہوگی۔ یعنی وہ ان نعمتوں اور عزت و عظمت کا جو جنت میں ہماری منتظر ہیں چھوٹا نمونہ ہوگی جبکہ کافروں کی قبر ان کیلئے جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہوگا۔

۲۔ عالم قیامت :

اور جب وقت قیامت ہوگا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کا معین کردہ فرشتہ اسرافیلؑ صور پھونکے گا جس سے آسمان اور زمین میں موجود ہر چیز پر غشی طاری ہوگی اور پھر سب پر موت طاری ہو جائے گی۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا جس سے اللہ تعالیٰ انہیں نئے سرے سے قبروں سے اُٹھائے گا اور انہیں اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا حکم دیا جائے گا۔ اس دن کو یوم بعث کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ

اور جب صور پھونکا جائے گا تو زمین و آسمان کی تمام مخلوقات بیہوش ہو کر گر پڑیں گی علاوہ ان کے جنہیں اللہ بچانا چاہے گا، اس کے بعد پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔ (سورہ زمر/ ۶۸)

۱۔ دوسری بار صور پھونکے جانے کے بعد انسان کو کچھ مراحل سے گزرنا ہے اور اس کی منزل متعین ہے۔ لوگ رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ اور ہر اُمت کو اسکے امام کے ساتھ پکارا جائے گا جس کی امامت کو وہ دنیا میں تسلیم کرتی تھی اور اس کی ہدایت پر عمل کرتی تھی۔ اگر وہ امام، اللہ کی طرف سے متعین تھا تو اس کے پیروکار، اہل حق کے ساتھ محشور ہونگے اور اگر امام گمراہ ہوگا تو اس کے پیروکاروں کا حشر ونشر گمراہوں کے ساتھ ہوگا۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ

قیامت کے دن ہم ہر گروہ کو اس کے پیشواء کے ساتھ بلائیں گے۔ (اسراء/ ۷۱)

۲۔منزل حشر کے بعد حساب کا مرحلہ آئے گا کہ جب انسان کے ہر قول و فعل کے چھوٹے بڑے تمام افعال کا حساب کیا جائے گا۔اگر چہ وہ ذرہ برابر ہی کیوں نہ ہوں ۔اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ

''لوگوں کے لیے ان کے حساب کا وقت قریب آ گیا ہے جب کہ وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں''۔

(سورہ انبیاء/۱)

نیز اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا ۔ (سورہ زلزال/۷۔۸)

رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لَا تَزُوْلُ قَدَمَا عَبْدٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ أَرْبَعٍ عَنْ عُمُرِهٖ فِيمَا أَفْنَاهُ وَ شَبَابِهٖ فِيمَا أَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ أَيْنَ كَسَبَهُ وَ فِيمَا أَنْفَقَهُ وَعَنْ حُبِّنَا أَهْلَ البيت

روز قیامت بندے کے قدم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر پائیں گے یہاں تک کہ اس سے درج ذیل چار چیزوں کے بارے میں سوال نہ کیا جائے :

۱ اس کی عمر کے بارے میں کہ اسے کہاں اور کیسے گزارا ؟

۲ اس کی جوانی کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اسے کیسے گزارا ؟

۳ اس کے مال کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اسے کہاں سے حاصل کیا اور کہاں اور کیسے خرچ کیا؟

۴ اور ہم اہلبیتؑ کی محبت کے بارے میں پوچھا جائے گا؟۔(بحار الانوار۔ج ۷ ص ۲۵۸)

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ

" ان أَوَّلُ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ الصَّلاةُ فَإِنْ قُبِلَتْ قُبِلَ سَائِرُ عمله"

''(روزِ قیامت) سب سے پہلے انسان کی نماز کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔اگر یہ نماز قبول ہوگئی تو بقیہ اعمال بھی قبول ہو جائیں گے۔'' (کافی۔ج ۳ ص ۲۶۸)

اور بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روز قیامت مالدار لوگوں کی نسبت غریبوں کا حساب آسان ہوگا۔

اس حوالے سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ''روز قیامت دو قسم کے مومن حساب دینے کیلئے کھڑے ہوں گے اور دونوں جنتی ہوں گے۔ایک دنیا میں فقیر اور دوسرا دنیا میں مالدار۔فقیر کہے گا پروردگار! مجھے کیوں روکا گیا ہے؟ تیری عزت کی قسم!

مجھے تو دنیا میں حکومت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ میں اس میں عدل و انصاف کرتا یا ظلم و جور کا مرتکب ہوتا۔ اور تو نے مجھے اتنا مال بھی عطا نہیں کیا تھا کہ میں اس میں سے کسی کا حق ادا کرتا یا اسے محروم رکھتا اور جیسا کہ تجھے معلوم ہے کہ میرے پاس ضرورت بھر مقدار میں رزق پہنچتا تھا جو تو نے میری تقدیر میں لکھ دیا تھا اس پر اللہ جل جلالہ فرمائے گا: ''میرے بندے تو نے سچ کہا، اسے جنت میں جانے کا راستہ دو یہ جنت میں داخل ہو جائے۔ جبکہ مالدار مومن ابھی تک اپنی جگہ اس حال میں کھڑا ہوگا اور اس حالت میں اس کے جسم سے اس قدر پسینہ بہے گا کہ اگر اسے چالیس اونٹ پیتے تو انہیں کافی ہوتا۔ جب مالدار مومن جنت میں داخل ہوگا تو فقیر مومن اس سے پوچھے گا تجھے کیوں روکا گیا؟ تو وہ کہے گا طولانی حساب کی وجہ سے، کیونکہ جب مجھ سے ایک سوال پوچھا جاتا ہے اور مجھے اس کی معافی مل جاتی تو اسکے بعد دوسرے سوال کی باری آ جاتی۔ اس طرح کئی سوالات پوچھے گئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر رحمت فرمائی اور مجھے توبہ کرنے والوں میں شمار کر لیا، مگر تم کون ہو؟ تو وہ کہے گا کہ میں وہی فقیر ہوں جو حساب کے وقت تمہارے ساتھ کھڑا تھا۔ تو وہ کہے گا کہ میرے بعد نعمتوں نے تیری صورت بدل کے رکھ دی (یعنی خوشحال اور صحت مند کر دیا)۔ (بحار۔ ج ۷، ص ۲۵۹)

۳۔ حساب ہو جانے اور نامہ اعمال نشر ہونے کے بعد پُل صراط سے گزرنے کا مرحلہ آئے گا۔ یہ پُل جہنم کے اُوپر واقع ہوگی اور اس پُل پر سے گزرے بغیر کوئی جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ روایت میں ہے کہ:

''وہ بال سے زیادہ باریک، تلوار سے زیادہ تیز اور آگ سے زیادہ گرم ہوگی۔ نیک اور خالص مومن اس پُل پر سے بجلی کی چمک کی طرح تیزی سے انتہائی سہولت کے ساتھ گزر جائیں گے جبکہ کچھ لوگ اس پر سے بڑی سختی سے گزریں گے لیکن نجات پا جائیں گے اور کچھ لوگ اس سے جہنم کی گھاٹیوں میں گر جائیں گے۔ یہ سب کچھ انسانوں کے دنیاوی زندگی میں دینِ خدا پر ثابت قدمی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کی ولایت کی پیروی کے مطابق انجام پائے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے؛

''لِكُلِّ شَيْءٍ جَوَازٌ وَ جَوَازُ الصِّرَاطِ حُبُّ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ''

''ہر چیز کیلئے اجازت نامہ ہے اور پل صراط سے عبور کا اجازت نامہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کی محبت ہے''۔ (بحارالانوار۔ ج ۳۹، ص ۱۹۳)

پُل صراط سے گزرنے کیلئے جو دیگر امور انتہائی اہم اور معاون و مددگار ہیں وہ صلہ رحمی، امانت داری، آئمہ معصومین علیہ السلام کی زیارت اور مساجد میں حاضر ہونا ہیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ:

''جس کا اُٹھنا بیٹھنا مساجد میں ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے راحت و آرام اور پُل صراط سے گزرنے کا ضامن ہے''۔ (وسائل، ج ۳، ص ۳۶۲)

۳۔ جنت و دوزخ:

اس کے بعد مومن جنت میں داخل ہو جائیں گے جہاں پر وسیع و عریض باغات، پھلدار درخت، لذیذ و مزیدار میوے،

پاکیزہ اور بہترین رہائش گاہیں، شیریں چشمے اور دل پسند اور من پسند تمام اشیاء موجود ہوں گی۔ یہاں تک کہ ان کا وصف اس عبارت میں وارد ہوا ہے کہ :

"فِیهَا مَا لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَی قَلْبِ بَشَرٍ"

"جنت میں ایسی خوش ذائقہ اور مزیدار اشیاء ہوں گی، جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہوں گی اور نہ کسی کان نے سنی ہوں گی اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا ہوگا۔" (من لا یحضرہ الفقیہ۔ ج ا ص ۲۹۵)

جبکہ دوزخ تو کفار اور منافقین کا ٹھکانہ ہے جس میں ہر طرف آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہوں گے اور اس میں ایسے وحشتناک اور سخت گیر فرشتے ہوں گے جنہیں دیکھ کر اہل دوزخ خوف اور ڈر کے مارے کانپ جائیں گے۔ جبکہ اہل دوزخ کے چہرے سیاہ و تاریک ہوں گے، بدصورت اور خوفناک ہوں گے۔ وہ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے اور طوق و زنجیر سے بندھے ہونگے۔ وہ دوزخ کے سخت گرم پانی سے پیاس بجھائیں گے جس کی وجہ سے ان کے پیٹ اور جلد کے درمیان میں موجود انتڑیاں وغیرہ سب کچھ پگھل جائے گا۔ ان کا کھانا تھوہر اور کانٹے ہوں گے اور شیاطین ان کے ساتھ ہوں گے۔ ان پر اتنا سخت عذاب ہوگا کہ وہ موت کی تمنا کریں گے لیکن انہیں موت نہ آئے گی۔

خلاصہ

١. مرنے سے لیکر روز قیامت کا درمیانی فاصلہ عالم برزخ ہے۔
٢. روز محشر وہ دن ہے جب تمام انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔
٣. روز حساب وہ دن ہے جس میں دنیوی زندگی انسان کے کئے گئے اعمال کا حساب ہوگا۔
٤. پل صراط جہنم کے اوپر ایک ایسی پل ہے جسے عبور کر کے مومنین جنت میں داخل ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو عذاب دینا چاہے گا وہ اس پل سے جہنم میں گر پڑیں گے۔
٥. جنت مومنین کے لئے ابدی نعمتوں کا مقام اور دوزخ کفار اور منافقین کیلئے ابدی عذاب کا ٹھکانہ ہے۔

سوالات

١. عالم برزخ کیا ہے؟
٢. روز محشر کچھ لوگوں کو زیادہ عرصہ جبکہ کچھ لوگوں کو تھوڑی دیر کیلئے کیوں کھڑا ہونا پڑے گا؟
٣. روز قیامت ہر اُمت کو اس کے امام کے نام سے کیوں پکارا جائے گا؟
٤. آپ نظریہ امامت کے حوالے سے دنیا میں اپنے کردار اور ذمہ داریوں کو کیسے متعین کریں گے؟

مطالعہ کیلئے

قبرستان جانے کے آداب

۱۔ مومنین کی قبروں پر جا کر درج ذیل کلمات پڑھے جائیں:

”بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيمِ السَّلَامُ عَلَى أَهۡلِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مِنۡ أَهۡلِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ يَا أَهۡلَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ بِحَقِّ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ كَيۡفَ وَجَدۡتُمۡ قَوۡلَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مِنۡ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ يَا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ بِحَقِّ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ اغۡفِرۡ لِمَنۡ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَاحۡشُرۡنَا فِي زُمۡرَةِ مَنۡ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ عَلِيٌّ وَلِيُّ اللهِ“

(جامع الاخبار: ص ۱۵۰)

۲۔ پیر اور جمعرات کو بوقت عصر اور ہفتہ کی صبح قبروں پر جانا اور ان کیلئے رحمت و مغفرت کی دعا کرنا مستحب ہے۔

۳۔ مستحب ہے کہ آپ درج ذیل کلمات کہیں: ”السلام علی اهل دیار من المومنین رحم الله المتقدمین منکم والمتأخرین فانا ان شاء الله بکم لاحقون“ (جو مومنین یہاں دفن ہیں ان پر سلام ہو! اللہ تم میں سے پہلے آنے والوں پر بھی رحم فرمائے اور بعد میں آنے والوں پر بھی رحم فرمائے۔ اگر اللہ نے چاہا تو ہم بھی آپ کے ساتھ آملیں گے۔

۴۔ مستحب ہے کہ قبر پر ہاتھ رکھے اور قبلہ رُو ہو کر سات مرتبہ سورۃ القدر (انا انزلناه فی لیلة القدر ...) کی تلاوت کرے۔ سورہ حمد، معوذتین (سورہ الفلق و سورہ الناس) اور آیت الکرسی میں سے ہر ایک کو تین تین مرتبہ پڑھے، سورہ یٰسین اور قرآن کریم کے باقی حصے میں سے کچھ تلاوت کرے۔ بہتر یہ ہے کہ قبلہ رُو ہو کر تلاوت کرے۔ البتہ اگر کھڑے ہو کر پڑھے تو بھی جائز ہے۔

۵۔ والدین کی قبروں پر اللہ سے حاجت طلب کرنا مستحب ہے۔

۶۔ مردوں اور عورتوں سب کی قبروں پر جانا مستحب ہے۔

قبروں پر جانے کے متعلق کچھ روایات درج ذیل ہیں:

۱۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

زُورُوا مَوۡتَاكُمۡ فَإِنَّهُمۡ يَفۡرَحُونَ بِزِيَارَتِكُمۡ وَ لۡيَطۡلُبۡ أَحَدُكُمۡ حَاجَتَهُ عِنۡدَ قَبۡرِ أَبِيهِ وَ عِنۡدَ قَبۡرِ

أُمِّهِ بِمَا يَدْعُو لَهُمَا

اپنے مُردوں کی قبروں پر جایا کرو۔ کیونکہ وہ تمہاری آمد سے خوش ہوتے ہیں۔تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اپنے والدین کیلئے دعائے مغفرت کرنے کے بعد اپنے ماں، باپ کی قبر پر (اللہ سے) حاجت طلب کرے۔ (وسائل الشیعہ: ج ۳ص ۲۲۳)

۲۔ قبروں پر جانے کے بارے میں امام جعفر صادق ؑ سے روایت ہے:

إِنَّهُمْ يَأْنَسُونَ بِكُمْ فَإِذَا غِبْتُمْ عَنْهُمْ اسْتَوحشوا

"جب تم ان کی قبروں پر جاتے ہو تو انہیں تسلی ہوتی ہے اور جب تم ان کی قبروں پر جانا چھوڑ دیتے ہو تو انہیں وحشت اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔" (وسائل الشیعہ: ج ۳ص ۲۲۲)

۳۔ نبی اکرمؐ سے روایت ہے:

"مَنْ قَرَأَ آيَةً مِنْ كِتَابِ اللهِ فِي مَقْبَرَةٍ مِنْ مَقَابِرِ الْمُسْلِمِينَ أَعْطَاهُ اللهُ ثَوَابَ سَبْعِينَ نَبِيّاً"

جو کسی مسلمان کی قبر پر ایک آیت قرآن کی تلاوت کرے گا اللہ اسے ستر انبیاء کا ثواب عطا فرمائے گا۔"

(جامع احادیث الشیعہ: ج ۳)

۴۔ نبی اکرمؐ سے روایت ہے:

"مَنْ تَرَحَّمَ عَلَى أَهْلِ الْمَقَابِرِ نَجَا مِنَ النَّارِ وَ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَ هُوَ يضحك"

"جو اہل قبرستان کیلئے دعائے رحمت کرے گا وہ دوزخ سے نجات پائے گا اور ہنستے مسکراتے ہوئے جنت میں داخل ہوگا۔" (جامع احادیث الشیعہ: ج ۳)

دوسری فصل

راستے کے سنگ ہائے میل

- توبہ
- دوگرانقدر چیزیں: نبی کریمﷺ کی وصیت
- صلہ رحمی
- راہِ خدا میں جہاد
- لوگوں کے ساتھ معاشرت
- کامل ترین نماز

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

رہبریت سے تمسک

سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی ؒ کو بانی انقلاب سے جنون کی حد تک عشق تھا۔کوئی ایسا مسئلہ جو یہاں کے علماء کی دسترس سے باہر ہوتا ڈاکٹر صاحب دفتر امام خمینیؒ سے رابطہ کرتے اور امام کی رائے اور فتویٰ کے منتظر رہتے۔ایک مرتبہ راقم نے تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر ۲۔دیوسماج روڈ پر ڈاکٹر صاحب سے چند امور پر بحث کی تو آپ نے فوراً فرمایا،امامؒ سے پتہ کرتے ہیں، جب تک امام خمینیؒ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم ہے اس وقت تک ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔آپ نے ایران میں دفتر امام سے رابطہ کیا اور چند روز بعد مجھے وضاحت سے آگاہ کیا۔

توبہ

- کیا گناہگار کی بخشش ممکن ہے؟
- توبہ کی حقیقت کیا ہے؟
- توبہ کرنے والوں کے لئے تحائف...

مقدمہ

انسان اللہ عزوجل کی بارگاہ میں توبہ کیوں کرتا ہے؟

اللہ عزوجل نے انسان کو ہر قسم کے گناہوں اور خطاؤں سے پاک صاف اور بے عیب پیدا کیا ہے۔ اسے خیر وصلاح اور شر وفساد کی راہوں کے درمیان فرق کرنے اور ان میں سے اپنی پسند کی راہ منتخب کرنے کا اختیار عطا کیا ہے۔ انسان اپنے ارادے سے تعلیمات الٰہی پر کاربند ہو کر خیر کے راستے پر چل سکتا ہے اور اس طرح وہ اس انعام کا مستحق بن سکتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک وصالح بندوں کو عطا کرنے کا وعدہ دیا ہے۔ اور وہ انعام ایسی جنت ہے کہ جو آسمانوں و زمین سے زیادہ وسیع ہے اور جو پرہیزگاروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

اسی طرح انسان برائی پر چلنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ جس کے نتیجے میں آخرت میں اس کی قسمت میں دوزخ کی آگ ہے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، جسے اللہ نے اپنے نافرمان بندوں کیلئے تیار کر رکھا ہے۔

یوں اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد نہیں چھوڑا، بلکہ اس پر فرشتے مقرر فرمائے ہیں جو اس کے تمام چھوٹے بڑے نیک و بد اعمال ایک کتاب میں لکھ رہے ہیں اور اللہ نے انسان کو اس نگرانی سے آگاہ بھی کر دیا ہے تاکہ وہ اسے نافرمانی اور گناہ کے ارتکاب سے باز رکھے۔ انسان کو ہر لمحہ جب یہ شعور واحساس ہو کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ذات کے سامنے حاضر ہے تو وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اللہ کی ناراضگی کا سبب بنے۔ ارشاد قدرت ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ

(انسان) کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا مگر یہ کہ اس کے پاس ایک نگران تیار ہوتا ہے۔ (سورہ ق/۱۸)

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ

اور ہر شخص ایک ہانکنے والے اور ایک گواہی دینے والے کے ساتھ ہوگا۔ (ق/۲۱)

نیز اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ انسان آخرت میں جب اپنے نامہ اعمال کو دیکھے گا تو کہے گا:

يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا

ہائے ہماری رسوائی! یہ کیسا نامہ اعمال ہے؟ اس نے کسی چھوٹی اور بڑی بات کو نہیں چھوڑا بلکہ سب کو درج کرلیا ہے اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ ان سب کو حاضر پائیں گے اور آپ کا رب تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ (الکہف:۴۹)

اس تمام صورتحال کو سمجھنے کے باوجود انسان اپنی ہوا و ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی خواہشات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور اس سے کچھ گناہ سرزد ہو جاتے ہیں، وہ راہ خیر سے منحرف ہو جاتا ہے۔ جوں جوں انسان کے گناہوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے وہ نیکی کی راہ سے دُور اور گناہ کے راستے پر گامزن ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ برائی کے راستے پر چل نکلتا ہے جس کے نتیجے میں انسان پر مایوسی، ناکامی و نامرادی کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کے سامنے اصلاح اور خیر کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اس وقت وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کس کی پناہ لی جائے اور گناہوں کی دلدل میں پھنسنے کے بعد کس سے مدد طلب کی جائے؟ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی بخشش کے لئے ایک دروازہ کھلا رکھا ہے جس کا نام ''توبہ'' ہے۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا

اے ایمان والو اللہ کی بارگاہ میں سچے دل کے ساتھ توبہ کرو (التحریم:۸)

بہرحال ہر انسان بابِ توبہ کے راستے سے مغفرتِ الٰہی کے سائے میں پناہ لے سکتا ہے۔ امان کے ساحل پر پہنچ سکتا ہے اور توبہ کی کشتی پر سوار ہو کر غرق ہونے سے بچ سکتا ہے۔

توبہ کیا ہے؟

توبہ کا مطلب یہ نہیں کہ طوطے کی طرح صرف زبان سے استغفر اللہ ربی واتوب الیہ کہہ دیا جائے، بلکہ توبہ انسان کے دل و دماغ اور روح کی گہرائیوں سے ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں توبہ کے بارے میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ انسان خشوع وخضوع کی حالت میں بارگاہِ الٰہی میں کھڑا ہو جائے اور صدق دل سے اپنی تمام خطاؤں، جرائم اور گناہوں کی معافی طلب کرے، ان پر پشیمانی کا اظہار کرے اور اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرے کہ دوبارہ وہ کبھی ایسا گناہ نہیں کرے گا۔ اس طرح انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سچی توبہ یا توبۃ النصوح کرسکتا ہے۔

توبہ کی طرف جلدی کرو:

اگر انسان سے کسی گناہ کا ارتکاب ہوجائے تو اسے چاہیے کہ فوراً توبہ کر لے، اور توبہ کو تاخیر میں نہ ڈالے اور ٹال مٹول پر اپنی زندگی کے لمحات بسر نہ کرتا رہے کہ بس میں جلد توبہ کروں گا۔ بلکہ اس کا فرض بنتا ہے کہ توبہ کرنے میں جلدی کرے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ اس گناہ اور معصیت کی حالت میں ہو یا اپنے دل کو برائی کی نجاست سے پاک کرنے سے قبل موت کے منہ میں جا پڑے۔

اسی طرح انسان کا فرض ہے کہ اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی ایک گناہ سے توبہ کر لے اور دوسرے گناہ سے توبہ نہ کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر شئے پر چھائی ہوئی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ یقینا تمام گناہ بخشنے والا ہے۔ چنانچہ انسان کو اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرنے میں بُخل سے کام نہیں لینا چاہیے، جیسا کہ اللہ عزوجل تمام گناہوں کی بخشش میں بخل نہیں کرتا۔

خداوند توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول فرماتا ہے:

انسان جب بھی اللہ سے توبہ کرتا ہے تو وہ اسی وقت بندے کے تمام گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ انسان کی توبہ کیوں قبول نہ فرمائے جبکہ اس نے قرآن کریم میں خود اس کا وعدہ فرمایا ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّاٰتِ

اور وہ وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو معاف کرتا ہے (الشوریٰ: ۲۵)

اور جیسا کہ قرآن کریم میں اپنی ذات کو تواب (بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

بیشک اللہ تعالیٰ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ (سورہ توبہ/۱۱۸)

ایسی صورت میں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ قبول کر لیتا ہے تو بندہ گناہوں سے اس طرح صاف ہو جاتا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ اس بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ التَّائِبَ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذنب"

"گناہ سے توبہ کرنے والا اس انسان کی طرح ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو"(مستدرک الوسائل: ج ۱۲، ص ۱۳۱)

تائبین کیلئے تحفے:

انسان کے اپنی زندگی میں توبہ کرنے سے مثبت اثرات اور خوشگوار نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ توبہ کرنے والے کی عمر دراز ہو جاتی ہے، رزق میں وُسعت و برکت ہوتی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ توبہ کرنے والا اللہ کا

محبوب بندہ بن جاتا ہے۔اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ

بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے اور پاکیزہ رہنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔

(سورہ بقرہ:۲۲۲)

اس کے علاوہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ

''توبہ کرنے والا محبوبِ خدا ہوتا ہے۔''

چنانچہ آئیے! ہم سب اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر توبہ کرتے ہوئے اپنے تمام گناہوں کی معافی طلب کریں اور امام زین العابدینؑ کی اس دعا کے الفاظ دُہراتے ہیں:

''إِلَهِي أَلْبَسَتْنِي الْخَطَايَا ثَوْبَ مَذَلَّتِي وَ جَلَّلَنِي التَّبَاعُدُ مِنْكَ لِبَاسَ مَسْكَنَتِي وَ أَمَاتَ قَلْبِي عَظِيمَ جِنَايَتِي فَأَحْيِهِ بِتَوْبَةٍ منكَ يَا أَمَلِي وَ بُغْيَتِي وَ يَا سُؤْلِي وَ مُنْيَتِي فَوَعِزَّتِكَ مَا أَجِدُ لِذُنُوبِي سِوَاكَ غَافِراً''

اے اللہ گناہوں نے مجھے ذلت کا لباس پہنا دیا ہے اور تجھ سے دوری نے مجھے مسکین بنا دیا ہے۔میرے گناہانِ کبیرہ نے میرے قلب کو مُردہ کر دیا ہے۔اب تو میری دعا قبول فرما کر اسے زندگی بخش دے۔ اے میری آرزو، میری منزل، میرے سرپرست، میرے مطلوب، تیری عزت کی قسم! تیرے سوا کوئی میرے گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔ (بحارالانوار۔ج۹۱،ص۱۴۲)

توبہ کی شرائط:

امیر المومنین علیہ السلام کی ایک راویت میں یہ شرائط جمع ہیں، جب ایک کہنے والے نے آپ کے سامنے استغفر اللہ کہا، تو آپؑ نے اس سے فرمایا: وائے ہو تجھ پر، کچھ پتا ہے کہ استغفار کیا ہے؟ استغفار بلند منزلت لوگوں کا مقام ہے اور یہ ایک ایسا لفظ ہے جو چھ باتوں پر مشتمل ہے۔

پہلی یہ کہ جو گناہ انجام دیئے ہیں ان پر پشیمان و نادم ہونا،

دوسری ہمیشہ کیلئے ان کے مرتکب نہ ہونے کا تہیہ کرنا،

تیسری یہ کہ مخلوق کے حقوق ادا کرنا یہاں تک کہ اللہ کے حضور میں اس حالت میں پہنچو کہ تمہارا دامن پاک وصاف ہو اور تم پر کوئی مواخذہ نہ ہو،

چوتھی یہ کہ جو فرائض تم پر تھے اور تم نے انہیں ضائع کر دیا تھا انہیں اب پورے طور پر بجالاؤ،

پانچویں یہ کہ تمہارا جو گوشت پوست حرام کھانے سے نشوونما پاتا رہا ہے اس کو غم و اندوہ سے پگھلاؤ یہاں تک کہ کھال کو

ہڈیوں سے ملادو کہ پھر سے ان دونوں کے درمیان نیا گوشت پیدا ہو،

چھٹی یہ کہ اپنے جسم کو اطاعت کے رنج سے آشنا کرو جس طرح اسے گناہ کی شیرینی سے لطف اندوز کیا ہے تو اس وقت کہو "استغفر اللہ"۔ (بحارالانوار۔ج ۶ص ۳۶)

خلاصہ

۱ بے شک اللہ عزّوجلّ نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ اسے راہِ راست پر چلاتے ہوئے سعادت کی منزل تک پہنچائے۔

۲ یقینا ملائکہ (فرشتے) انسان کی نگرانی کررہے ہیں۔ وہ اس کی نیکیاں اور بُرائیاں لکھ رہے ہیں۔

۳ بلاشبہ انسان بابِ توبہ کے راستے سے رحمت الٰہی کے سائے میں داخل ہوسکتا ہے۔

۴ توبہ فقط زبان سے چند الفاظ کہہ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ دل میں پشیمان ہونے اور اعضاء وجوارح سے عمل کرنے کا نام ہے۔

۵ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے تمام گناہوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا پاکیزہ ہوجاتا ہے کہ جیسے اس نے کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا ہو۔

۶ بے شک توبہ کے انسانی زندگی پر اچھے آثار مرتب ہوتے ہیں جبکہ توبہ کرنے والا حبیب خدا قرار پاتا ہے۔

سوالات

۱ سعادت وخوشحالی اور جنت کے حصول میں کامیابی کا راستہ کونسا ہے؟

۲ اللہ تعالیٰ نے اپنی کس مخلوق کو انسان کی نگرانی کے لئے متعین کیا ہے؟

۳ سچی توبہ (توبہ نصوح) کیسے ہوتی ہے؟

۴ کیا اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کی توبہ قبول کرلیتا ہے؟

۵ انسانی زندگی میں توبہ کے کیا اثرات ظاہر ہوتے ہیں؟

مطالعہ کیلئے

امام مہدیؑ کے نائبین خاص

یہ چار نائبین ایسی شخصیات ہیں جو امامؑ کی غیبت صُغریٰ کے زمانہ میں آپؑ کی خصوصی نیابت کے منصب پر فائز تھے۔ان حضرات کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ پیروانِ امامؑ کی آپؑ کے احکامات کے مطابق فکری اور باطنی رہنمائی کریں۔یعنی وہ امام مہدیؑ کی طرف سے معاشرہ کی ہدایت و رہنمائی کریں اور آپؑ کی تعلیمات کو عملی طور پر نافذ کریں۔یہ حضرات ایمان و اخلاص کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہونے کی وجہ سے اس خصوصی نیابت کے اہل قرار پائے کیونکہ ان میں بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کا حوصلہ پایا جاتا تھا وہ امامؑ کے پیروکاروں کی ہدایت و رہنمائی کرنے اور ان کے عمومی مفادات کو پورا کرنے کی پوری قدرت وصلاحیت کے حامل تھے۔ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

پہلے نائب: عثمان بن سعید عمری:

کتب تاریخ میں امام ہادی (علی نقیؑ) کے خاص وکیل کے طور پر ان کا نام درج ہے۔کیونکہ امامؑ ان پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اس طرح کے الفاظ سے ان کی مدح وستائش کیا کرتے تھے:

''یہ ابوعمرو بااعتماد اور دیانتدار شخص ہیں۔یہ تم سے جو بات کہیں وہ میری جانب سے ہوتی ہے اور تمہیں جو پیغام پہنچائیں وہ بھی میری جانب سے ہوتا ہے۔'' (الغیبۃ [الطوسی] ص ۳۵۴)

امام ہادیؑ کی شہادت کے بعد عثمان بن سعید، امام حسن عسکریؑ کے وکیل خاص بن گئے۔یہ غیر معمولی طور پر سرگرم عمل اور باکمال شخصیت کے مالک تھے۔وہ گھی کے تھیلوں میں بیت المال کی رقم ڈال کر امامؑ کی خدمت میں لے جایا کرتے تھے۔وہ امامؑ کے احکامات کی مکمل پابندی کیا کرتے تھے۔امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے بعد عثمان بن سعیدؒ، امام مہدیؑ کے خصوصی نائب قرار پائے۔وہ امامؑ کے پیروکاروں کے ساتھ رابطہ برقرار رکھنے میں انتہائی ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے تھے۔وہ عوام کو امامؑ کے ارشادات اور احکامات پہنچاتے تھے۔نیز ان کے سوالات کے جوابات بھی پہنچاتے تھے اور ان کی مشکلات و مسائل بھی امامؑ کی بارگاہ میں بیان کیا کرتے تھے۔وہ لوگوں کے شرعی اموال کو امامؑ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔یہ اپنی وفات تک

نیابتِ امامؑ کی اہم ذمہ داری کو سرانجام دیتے رہے یہاں تک کہ انہیں موت نے اپنی آغوش میں لے لیا۔انہوں نے امام مہدیؑ کی جانب سے آپؑ کے اصحاب اور پیروکاروں تک وہ پیغام پہنچایا جس میں تحریر تھا کہ آپؑ نے ان کے بیٹے محمد بن عثمان کو نیابتی امور منتقل کر دئیے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تمام معاملات اپنے بیٹے کے سپرد کر دیے۔

دوسرے نائب: محمد بن عثمان عمری:

امام حسن عسکریؑ کے فرمان کے مطابق انہوں نے اپنے والد کی جگہ نیابت اِمامؑ کا منصب قبول کیا۔جیسا کہ امامؑ نے فرمایا:

"(اے میرے اصحاب!) گواہ رہنا! عثمان بن سعید میرے نائب ہیں اور ان کے ایک بیٹے محمد ہیں جو میرے بیٹے مہدیؑ کے نائب ہوں گے" اور یہ امام مہدیؑ کے حکم سے اپنے والد کی طرح منصب وکالت و نیابت پر فائز ہوں گے"۔(الغیبۃ [الطوسی] ص ۳۵۶)

تمام علمائے امامیہ کا ان کے عادل، بااعتماد اور دیانت دار ہونے پر اجماع ہے۔ان کے بارے میں امام مہدیؑ کے کلمات باعث اِفتخار ہیں کیونکہ جب اپنی اس عظیم ذمہ داری کو سنبھالے ہوئے ابتدائی ایام میں تھے تو امامؑ خوبصورت الفاظ میں ان کو خراجِ تحسین پیش کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔

ان کی پوری زندگی میں اہم امور کے سلسلہ میں امام مہدیؑ کی طرف سے جاری ہونے والی تحریریں اسی طرح ان کے ہاتھ سے اسی خط میں لکھی ہوئی ہیں جس طرح وہ اپنے والد کی زندگی میں لکھا کرتے تھے۔

وہ تقریباً پچاس سال تک وکالت و نیابت کے منصب پر فائز رہے۔چنانچہ وہ اس منصب جلیلہ پر سب سے زیادہ عرصہ متمکن رہنے والی ایسی شخصیت تھے جنہیں امام مہدیؑ سے سب سے زیادہ تعلیمات حاصل کرنے کا موقع میسر آیا۔اور اس زمانہ میں انہیں اپنی زندگی میں مؤثر ترین خدمات سرانجام دینے کا شرف نصیب ہوا۔

ابوجعفر عمری نے اپنی وفات سے قبل امام حجتؑ کے حکم سے اپنے بعد تیسرے نائب حسین بن روحؒ کے بارے میں وصیت فرمائی۔جب ان کی وفات ہوئی تو انہیں شارع باب کوفہ میں اسی مقام پر دفن کیا گیا کہ جہاں پر ان کا دفتر اور مکانات تھے۔

تیسرے نائب: حسین بن روح نوبختی:

محمد بن عثمان عمری کی وفات کے بعد حسین بن روح نے عملی طور پر منصب وکالت سنبھالا اور تقریباً اکیس سال تک اس ذمہ داری کو نبھاتے رہے۔امام مہدیؑ کی طرف سے انہیں ایک خط تحریر کیا گیا۔ پہلا خط یہ تھا جس میں نے ان کے بارے میں تعریفی کلمات درج تھے۔

مزید یہ کہ اس خط میں امام مہدیؑ نے ان کے حق میں دعا فرمائی ہے:

"اللہ تعالیٰ انہیں تمام خیرات و مرضات کی معرفت عطا فرمائے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہم نے ان کی ایک کتاب پڑھی ہے، ہمیں ان پر مکمل اعتماد ہے۔ یہ ہمارے نزدیک ایسا مقام اور ایسی قدر و منزلت رکھتے ہیں جو موردِ اطمینان اور باعثِ مسرت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے حق میں اپنے احسانات میں اضافہ فرمائے۔" (الغیبۃ الطوسی۔ص ۳۷۲)

ابوالقاسم منصب نیابت و وکالت پر فائز رہ کر بڑے اچھے انداز سے فرائض منصبی ادا کرتے رہے۔ ان کی طبیعت میں اسرارِ امامت کو مخفی رکھنے کی صلاحیت زیادہ تھی۔ اس طرح وہ بڑی مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ انہوں نے اپنی وکالت کے عرصہ میں اہم ترین ذمہ داریوں کو نبھایا۔ یہاں تک 326ھ میں اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے اور نوبختیہ قبرستان میں دفن ہوئے۔ دورِ حاضر میں ان کی قبر بغداد میں مشہور ہے۔ لوگ اس کی زیارت کیلئے آتے رہتے ہیں۔

◆ چوتھے نائب: علی بن محمد سمری:

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ امام حسن عسکریؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ پھر امام مہدیؑ کی جانب سے ایک پیغام موصول ہوا جس میں انہیں جناب حسین بن روحؒ کی وفات کے بعد بغداد میں امامؑ کے نائب ہونے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

انہوں نے 326ھ میں ابوالقاسم حسین بن روح کی وفات کے بعد وکیل اور نائبِ امامؑ ہونے کا منصب سنبھالا۔ یہاں تک کہ 329ھ ماہِ شعبان کے نصف میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ اس طرح امام مہدیؑ کی طرف سے وکالت و نیابت کی مدت پورے تین سال رہی۔

سمری اپنی وفات سے کچھ روز قبل امام مہدیؑ کی جانب سے ایک تحریر منظر عام پر لائے جس میں امامؑ کی غیبت صغریٰ کے اختتام اور سمری کی وفات کے بعد امامؑ کی ظاہری وکالت و نیابت کا زمانہ ختم ہونے کا اعلان کیا گیا تھا۔ نیز انہیں روکا گیا کہ وہ اپنی وفات کے بعد کسی شخص کو اپنا نائب مقرر نہ کریں۔

اس تحریر میں امامؑ فرماتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے علی بن محمد سمری!

اللہ تعالیٰ تمہارے برادرانِ ایمانی کو تمہارے ساتھ تعاون کرنے کی وجہ سے اجر عظیم عطا فرمائے۔ اب تمہارا وقتِ وفات قریب آ گیا ہے اور تمہاری زندگی میں سے صرف چھ دن باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے

اپنے جملہ امور کو نمٹا لو۔ اور خبر دار اپنی وفات کے بعد کسی کو اپنی جگہ نائب بنانے کی وصیت نہ کرنا۔ کیونکہ اب مکمل غیبت کا آغاز ہو چکا ہے۔ چنانچہ اب اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی میرا ظہور ہوگا۔ اور یہ ایک طویل مدت کے بعد ہوگا جب لوگوں کے دل سخت ہو چکے ہوں گے اور دنیا ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔۔۔

یہ امام مہدیؑ کی جانب سے آخری خط ہے جو مخصوص وکالت و نیابت کے ذریعہ سے منظر عام پر آیا اور غیبت صغریٰ میں یہ امامؑ اور عوام کے درمیان براہ راست آخری رابطہ تھا۔ اس کے چھ دن بعد علی بن محمد سمری وفات پا گئے۔ انہیں بغداد میں دفن کیا گیا جہاں پر ان کا مزار مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

مرجعیت کا پرچار

جب علامہ سید صفدر حسین نجفی نے امام خمینیؒ کی " توضیح المسائل " کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا تو ڈاکٹر محمد علی نقویؒ نے اس کی راہ ہموار کرنے کی ٹھان لی۔علامہ صاحب نے توضیح المسائل چھپوائی تو ڈاکٹر صاحب نے ملک کے کونے کونے میں اسے تقسیم کیا۔علامہ صاحب نے امام خمینیؒ کا تعارف اور ان کی تحریک کے مقاصد تحریر فرمائے اور امام خمینیؒ کی پہلی کتاب " حکومت اسلامی یا ولایت فقیہ " کا ترجمہ کیا تو ڈاکٹر صاحب نے انہیں پورے ملک میں پھیلا دیا۔

دو گرانقدر چیزیں: نبی کریمؐ کی وصیت

- نبی مکرمؐ کی وفات کے بعد ہدایت کا محور و مرکز کونسا ہے؟
- کتابِ ہدایت کیا ہے؟
- نجات کا راستہ اور وسیلہ کیا ہے؟

مقدمہ

دو گرانقدر چیزیں (الثقلان): نبی کریمؐ کی وصیت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لئے پیدا فرمایا تا کہ وہ سعادت حاصل کر پائے۔ اس دنیوی زندگی میں انسان گمراہ کن خواہشات اور گمراہ مذاہب کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں زندگی بسر کر رہا ہے جس کی موجیں اسے اِدھر سے اُدھر پھینک رہی ہیں، جبکہ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ سعادت تک پہنچنے کا صحیح راستہ ہے۔ اس صورتحال کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے بھی انسان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ رکھا کہ وہ حیرانی و پریشانی کے عالم میں گمراہی اور ظلمت میں غرق ہو جائے بلکہ اللہ عزوجل نے اس کی ہدایت کے لئے انبیائے کرامؑ کو مبعوث فرمایا اور ان کے ہمراہ اپنا مکمل ضابطہ حیات شریعت کی صورت میں نازل فرمایا۔ اور جب حضرت محمدؐ پر رسالت ختم ہوگئی تو نبی پاکؐ نے ہماری رہنمائی کے لئے کشتی نجات کی نشاندہی کر دی اور فرمایا:

”إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي وَإِنَّهُمَا لَنْ يَفْتَرِقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ“

”میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے گمراہ نہیں ہو گے، وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میرے اہلبیت علیہم السلام ہیں۔ جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونگے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچ جائیں“۔ (وسائل الشیعہ، ج ۲۷، ص ۳۳)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

”إِنِّي خَلَّفْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي وَإِنَّهُمَا لَنْ يَفْتَرِقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْض

’’میں تم میں دو گرانقدر چیزیں کتاب اللہ اور اپنی عترت اہلبیتؑ چھوڑے جا رہا ہوں اور یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچ جائیں۔ اور ان کی مثال کشتی نوحؑ جیسی ہے جو اس میں سوار ہوا وہ نجات پا جائے گا اور جو اس میں سوار ہونے سے رہ جائے گا وہ ڈوب جائے گا۔‘‘

(بحار الانوار: ج ۲۳ ص ۱۳۵)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دو گرانقدر چیزیں کیا ہیں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ہمارے درمیان کیوں چھوڑا؟ اور ان کے حوالے سے ہماری ذمہ داری کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث کے ذریعے ثقلین (دو گرانقدر چیزوں) کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے بارے میں سمجھایا ہے کہ پہلا ثقل (گرانقدر چیز) کتاب اللہ (قرآن کریم) اور دوسری گرانقدر چیز اہلبیتؑ یعنی بارہ آئمہؑ اور حضرت فاطمہ زہراؑ ہیں۔

اس کے علاوہ نبی کریمؐ نے انہیں ثقلین سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ اہل عرب ہر عظیم الشان قدر و منزلت والی شئے کو ثقل کہتے ہیں اور دنیا میں قرآن و اہلبیتؑ سے بڑھ کر عظمت و شان والا کوئی نہیں۔

ثقلین کے ساتھ تعلق:

رسول پاکؐ نے ہمارے درمیان ثقلین (دو گرانقدر چیزیں) کیوں چھوڑیں؟

رسول پاکؐ نے ہمارے درمیان ثقلین (دو گرانقدر چیزیں) اس لئے نہیں چھوڑیں کہ ہم فقط ان کے نام زبانی یاد کرلیں بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم ہدف اور اعلیٰ مقصد کارفرما ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ ان دونوں کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرے کیونکہ اسی تعلق اور واسطے کے ذریعے سے ہی ہم دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن و اہلبیتؑ صراط مستقیم، سفینہ نجات، آسمان کے ستارے اور مشعل نور ہیں۔

قرآن کتاب خدا:

قرآن انسان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے۔ جو اس نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل فرمائی تا کہ آپؐ بنی نوع انسان کو گمراہی کی تاریکیوں اور ظلمتوں سے نکال کر نور کی جانب لے آئیں۔ جس کی بناء پر یہ (قرآن) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ قرار پایا۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہم قرآن کریم سے مربوط ہوں تا کہ اس کے ذریعے سے ہم اپنی تربیت کر کے تہذیب یافتہ بن

جائیں۔قرآن کریم سے ہمارا تعلق درج ذیل طریقے سے ہونا چاہیے:

پہلا طریقہ: قرآن کریم کی صحیح تلاوت کرنا کیونکہ یہ بہترین عبادت ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"اَلْقُرْآنُ عَهْدُ اللّٰهِ إِلَى خَلْقِهِ فَقَدْ يَنْبَغِي لِلْمَرْءِ الْمُسْلِمِ أَنْ يَنْظُرَ فِي عَهْدِهِ وَ أَنْ يَقْرَأَ مِنْهُ فِي كُلِّ يَوْمٍ خَمْسِينَ آيَةً"

''قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی مخلوق سے ایک عہد نامہ ہے اس لئے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے عہد نامہ پر غور کرے اور روزانہ اس میں سے کم از کم پچاس آیتوں کی تلاوت کرے۔''

(کافی۔جلد ۲،ص ۶۰۹)

قرآن پاک کی تلاوت کرنے کے چند آداب ہیں:

وضو کرنا، قبلہ رُخ ہونا، خشوع وخضوع کیساتھ پڑھنا۔اسی لئے انسان پر فرض ہے کہ جب مجالس ومحافل میں قرآنی آیات تلاوت کی جارہی ہوں تو انہیں غور سے سُنے اور سکوت اختیار کرے۔

دوسرا طریقہ: قرآن پاک سیکھنا اور قرآنی آیات کے مفاہیم ومطالب کو سمجھنا:

رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث شریف میں مروی ہے کہ:

"خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وعلمه"

''تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔''

(مستدرک الوسائل۔جلد ۴، ص ۲۳۵)

امام جعفر صادق علیہ اسلام نے فرمایا:

"يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ لَا يَمُوتَ حَتَّى يَتَعَلَّمَ الْقُرْآنَ أَوْ يَكُونَ فِي تعليمه"

مومن کیلئے شائستہ یہ ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن سیکھ چکا ہو یا موت کے وقت سیکھ رہا ہو۔

(کافی۔جلد ۲،ص ۶۰۷)

تیسرا طریقہ: قرآنی تعلیمات پر عمل کرنا اور آیات قرآنی میں وارد ہونے والی عبادات، اخلاق واعمال، اوامر الٰہی پر کاربند رہنا اور جن کاموں کے انجام دینے سے قرآن نے منع کیا ہو ان سے دُور رہنا۔

اہلبیت علیہم السلام وسیلۂ نجات:

اہلبیتؑ ایسی عظیم قدرومنزلت والی ہستیاں ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ نے رجس وناپاکی کو دُور رکھا ہے اور ان کی عصمت و طہارت کی گواہی قرآن نے ان الفاظ میں دی ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا

"اللہ کا ارادہ بس یہی ہے کہ ہر طرح کی ناپاکی کو اہلبیت (علیہم السلام) آپ سے دور رکھے اور آپ کو پاک و پاکیزہ رکھے جیسے پاکیزہ رکھنے کا حق ہے"۔(سورہ احزاب۔۳۳)

اور اہلبیت علیہم السلام کی ہمراہی اختیار کرنے کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تاکید فرمائی۔حضرت عمار سے اپنے کلام میں انہوں نے فرمایا:

"فَإِنْ سَلَكَ النَّاسُ كُلُّهُمْ وَادِياً وَ عَلِيٌّ وَادِياً فَاسْلُكْ وَادِيَ عَلِيٍّ وَ خَلِّ النَّاسَ طُرّاً يَا عَمَّارُ إِنَّهُ لَا يُزِيلُكَ عَنْ هُدًى يَا عَمَّارُ إِنَّ طَاعَةَ عَلِيٍّ لَمِنْ طَاعَتِي وَ طَاعَتِي مِنْ طَاعَةِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ"

"اگر سبھی لوگ ایک راہ پر چلیں اور علی علیہ السلام دوسری راہ اختیار کریں تو اے عمار! تم اس راہ پر چلو جس پر علی علیہ السلام گامزن ہوں اور دوسرے لوگوں کا ساتھ چھوڑ دو کیونکہ (وہ) علی علیہ السلام تمہیں ہدایت کے راستے سے گمراہ نہیں کریں گے۔بے شک علی علیہ السلام کی اطاعت میری اطاعت ہے اور میری اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے"۔(بحار الانوار،ج،۳۲ص۳۱۵)

پس اہلبیت علیہم السلام ہی خیر و نیکی کی راہ اور نجات کا راستہ ہیں۔اس سلسلے میں ہم ان کے ساتھ اپنے تعلق اور ہمراہی کو درج ذیل صورتوں میں مضبوط کر سکتے ہیں۔

1۔ ان کی معرفت حاصل کرنا:

ہر مومن کو چاہیے کہ آئمہ طاہرین علیہم السلام کے اسماء مبارکہ اسے حفظ ہوں،جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام

۲۔حضرت حسن بن علی علیہ السلام

۳۔حضرت حسین بن علی علیہ السلام

۴۔حضرت علی بن حسین زین العابدین علیہ السلام

۵۔حضرت محمد بن علی الباقر علیہ السلام

۶۔حضرت جعفر بن محمد الصادق علیہ السلام

۷۔حضرت موسیٰ بن جعفر الکاظم علیہ السلام

۸۔حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام

۹۔حضرت محمد بن علی الجواد علیہ السلام

۱۰۔حضرت علی بن محمد الہادی علیہ السلام

۱۱۔حضرت حسن بن علی العسکری علیہ السلام

۱۲۔حضرت محمد بن حسن المہدی علیہ السلام

اسی طرح اللہ عزوجل کی بارگاہ میں ان کی فضیلت اور قدر و منزلت کی معرفت حاصل کرنا، ان کے فرامین، افعال و کردار اور ان کی سیرت سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

"مَنْ عَرَفَنَا كَانَ مُؤْمِناً وَ مَنْ أَنْكَرَنَا كَانَ كافِر"

"جس نے ہماری معرفت حاصل کی وہ مومن ہے اور جس نے ہمارا انکار کیا وہ کافر ہے۔" (کافی۔ جلد ۱ ص ۱۸۷)

نیز آپ علیہ السلام سے ہی روایت ہے کہ:

"لَا يَكُونُ الْعَبْدُ مُؤْمِناً حَتَّى يَعْرِفَ اللهَ وَ رَسُولَهُ وَ الْأَئِمَّةَ كُلَّهُمْ وَ إِمَامَ زَمَانه"

"بندہ اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ اللہ، اس کے رسولؐ، تمام آئمہؑ اور اپنے امام زمانہؑ کی معرفت حاصل نہ کر لے۔" (کافی۔ جلد ۱ ص ۱۸۰)

2۔ان سے محبت و مودّت رکھنا، ان سے قلبی و روحانی عقیدت رکھنا۔

قرآن کریم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی یہ فرمان الٰہی صادر ہوا ہے:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى

اے نبیؐ! آپ ان سے کہہ دیں کہ میں تم سے اپنے اہل قربیٰ (قریب ترین رشتہ داروں) کی مودّت کے سوا کوئی اجر رسالت طلب نہیں کرتا۔ (سورہ شوریٰ۔ ۲۳)

رسول پاکؐ رسالت کا کوئی اجر طلب نہیں کر رہے بلکہ اسلام کے اجر رسالت کے طور پر صرف اپنے اہل قربیٰ کی مودّت کو لازم قرار دے رہے ہیں۔

نبی کریمؐ سے روایت ہے کہ:

"اِلْزَمُوا مَوَدَّتَنَا أَهْلَ الْبَيْتِ فَإِنَّهُ مَنْ لَقِيَ اللهَ وَ هُوَ يَوَدُّنَا أَهْلَ الْبَيْتِ دَخَلَ الْجَنَّةَ بِشَفاعتنا"

"ہمارے اہلبیتؑ کی مودّت کو لازم جانو، کیونکہ جو اس حال میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا کہ وہ ہم

سے محبت رکھتا ہو تو وہی ہماری شفاعت سے جنت میں داخل ہوگا۔"(مستدرک الوسائل: ج ۱ص ۱۵۱)

3۔ان کے احکام کی اطاعت کرنا

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے ذمہ جو بھی عمل فرض قرار دیں ہم اسے ہر صورت بجالائیں اور جس کام سے ہمیں دُور رہنے کا حکم دیں تو اس سے اجتناب کریں۔قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور تم میں سے جو صاحبان امر ہیں ان کی اطاعت کرو۔(سورہ نسا۔۵۹)

اولوالامر سے مراد اہلبیت نبوت علیہم السلام ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

"نَحْنُ قَوْمٌ فَرَضَ اللّٰهُ طاعتنا"

"ہم وہ لوگ ہیں جن کی اطاعت اللہ تعالیٰ نے فرض کی ہے۔(کافی: جلد ۱،ص ۱۸۶)

4۔ان کی پیروی کرنا اور ان کے اسوہ حسنہ کو پیش نظر رکھنا

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کی سیرت و کردار کو اپنی زندگی میں عملی نمونہ سمجھیں اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔کیونکہ آئمہ طاہرین علیہم السلام نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔

امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

"إِنَّمَا شِيعَتُنَا مَنْ تَابَعَنَا وَلَمْ يخالفنا"

"ہمارے شیعہ وہ ہیں جو ہماری پیروی کریں اور ہماری مخالفت نہ کریں" (وسائل الشیعہ۔جلد ۲۷ص ۷۶)

ہم امام صاحب الزمان (عج) کے پیروکار ہیں:

حضرت امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف ہمارے امام زمانہؑ ہیں۔اسی لئے ان کے ساتھ ہمارا قابل ذکر اور خاص رابطہ قائم ہونا ضروری ہے۔اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہم ان کے ظہور پرنور کے لئے حالات سازگار بنائیں۔ان کے جلد ظہور کے لئے دعا کریں اور ان کے زمانہ غیبت میں ولی فقیہ کی پیروی کریں۔

ہم سب کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ظہورِ امامؑ کے لئے ان الفاظ سے دعا کرنا چاہیے:

اللّٰهمَّ كُنْ لِوَلِيّكَ الحُجَهِ بنِ الحَسَن صَلَواتُكَ عليه و عَلى آبائِهِ فِى هَذِهِ السَّاعَةِ وَفِى كُلِّ سَاعَةٍ وَلِيّاً وَ حَافِظاً وَ نَاصِراً وَ دَلِيلًا وَ قَائِداً وَ عَيْناً حَتَّى تُسْكِنَهُ أَرْضَكَ طَوْعاً وَ تُمَتِّعَهُ فِيهَا طَوِيلًا اللّٰهمَّ واجعلنى

من أنصاره وأعوانه وأتباعه وشيعته واللّٰهم صل علی محمد وآل محمد وعجل فرجهم

اے اللہ! اپنے ولی حضرت حجت ابن الحسن کا محافظ بن جا، ان پر اور ان کے آبائے گرامی پر تیری رحمت نازل ہو۔ اس لمحے اور ہر لمحے ان کا مددگار، نگہدار، پیشوا، حامی، رہنما اور نگہبان بن جا، یہاں تک کہ تو لوگوں کی چاہت سے انہیں اپنی زمین کی حکومت عطا فرمائے اور انہیں مدتوں اس پر برقرار رکھے۔ اے اللہ! مجھے امام زمانہؑ کے انصار و پیروکار، حامی و مددگار اور شیعوں میں سے قرار دے۔ اے اللہ! محمدؐ و آل محمدؐ پر رحمت نازل فرما اور ان کے ظہور میں تعجیل فرما۔

خلاصہ

۱. دو گرانقدر چیزیں کتاب اللہ (قرآن مجید) اور اہلبیتؑ ہیں جن کی عظیم قدر و منزلت کی وجہ سے رسولؐ نے ان کا یہ نام (ثقلین) رکھا ہے۔
۲. قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مخلوق کی ہدایت کے لئے دستورِ حیات ہے۔
۳. قرآن کریم کے ساتھ ہمارا تعلق ایسا ہونا چاہیے کہ قرآن کریم کی قراءت، تعلیم اور اس کے احکام پر عمل کرنا ہماری پہچان بن جائے۔
۴. اہلبیتؑ، اللہ تعالیٰ کی طرف رہنمائی کرنے میں ہمارے معلّم اور ہادی و رہنما ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہمارا تعلق ان کی معرفت، محبت، اطاعت اور ان کی فرمانبرداری کے حوالے سے قائم ہو۔
۵. امام مہدیؑ کے ساتھ ہمارا خاص تعلق ہونا چاہیے اور ان کے ظہور کے لئے حالات سازگار کرنے چاہئیں۔

سوالات

۱. کوئی ایسی حدیث بیان کریں جس میں رسول اکرمؐ نے ثقلین کی وضاحت فرمائی ہو۔
۲. رسول پاکؐ نے قرآن و اہلبیتؑ کو ثقلین کا نام کیوں دیا؟
۳. قرآن کریم سے ہمارا کیا تعلق ہے؟
۴. کوئی ایسی حدیث ذکر کریں جس میں قرآن پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہو۔
۵. مودّت اہلبیتؑ کے بارے میں ایک حدیث بیان کریں۔
۶. اہلبیتؑ سے ہمارے تعلق کے مراحل کون سے ہیں؟
۷. ہمارے امام زمانہؑ کون ہیں؟ اور ان سے ہمارا تعلق کیسا ہونا چاہیے؟

مطالعہ کیلئے

امام محمد بن علی الجوادؑ

آپؑ آئمہ اہلبیتؑ میں سے نویں امام ہیں۔ ماہ رمضان 195ھ میں مدینہ منورہ میں آپؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ آپؑ نے عظمت وشرافت اپنے آباؤاجداد سے ورثہ میں پائی۔ آپؑ کی رگوں میں نبوت کا خون رواں تھا اور آپؑ کی پرورش سرچشمہ رسالت سے ہوئی۔

آپؑ اپنے والد گرامی حضرت امام علی رضاؑ کی شہادت کے بعد 203ھ میں منصب ِولایت وامامت پر فائز ہوئے۔ آپؑ نے مامون اور معتصم کی خلافت کا ابتدائی زمانہ پایا۔ آپؑ کو جواد، قانع، مرتضیٰ، نجیب، تقی، زکی جیسے عظیم القابات سے یاد کیا جاتا ہے جس سے آپؑ کی عظمت وشان ظاہر ہوتی ہے۔ جب امام رضاؑ نے وفات پائی تو امام جوادؑ مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ انیس برس کی عمر میں آپؑ نے اپنے والد گرامی کی وصیت کے مطابق امرِ امامت کو سنبھالا۔ خلیفہ مامون نے بھی اپنے پہلے عباسی خلفاء کے برعکس آپؑ کے ساتھ وہی اندازِ سیاست اپنایا جو وہ آپؑ کے والد گرامی کے ساتھ کر چکا تھا۔ کیونکہ پہلے عباسی خلفاء آئمہ اہلبیتؑ کو قتل کروادیتے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اہلبیتؑ کے ساتھ محبت میں اضافہ ہوتا اور عباسی خلفاء سے نفرت کی آگ مزید بھڑک اُٹھتی تھی۔ جب مامون نے اس صورتحال کو بغور دیکھا تو اس نے سابقہ طریقہ کے برعکس ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ وہ یہ کہ اس نے اہلبیتؑ کو ان کے وطن مدینہ سے دارالخلافہ بغداد منتقل کر دیا تاکہ ان کی تمام حرکات وسکنات کی نگرانی کرواسکے۔ امام حسن عسکریؑ تک یہی اندازِ سیاست کارفرما رہا۔

جب مرکزِ خلافت بغداد میں امامؑ کی آمد ہوئی تو مامون نے کم عمری میں ہی علم وحکمت، ادب اور کمالِ عقل میں آپؑ کی فضیلت اور عظمت وشان دیکھی کہ اس زمانہ میں کوئی دوسرا بزرگ بھی آپؑ کے برابر نہیں تھا۔

ماہ ذیقعدہ میں جب آپؑ کو زہر دے کر شہید کیا گیا تو آپؑ کی عمر پچیس سال اور کچھ ماہ تھی۔ آپؑ کو بغداد میں جد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔

صلۂ رحمی

- رشتہ دار (ارحام) کون ہوتے ہیں؟
- صلۂ رحمی کا انعام اور قطع رحمی کی سزا کیا ہے؟
- والدین کے ہم پر کیا حقوق ہیں؟

مقدمہ

رشتہ دار (ارحام) کون ہیں اور صلۂ رحمی کیا ہے؟

ارحام لفظ رحم کی جمع ہے اور عربی زبان میں لفظ رحم ہر اس انسان کیلئے بولا جاتا ہے جس کا دوسرے انسان کے ساتھ رشتہ داری یا کوئی نسبی تعلق ہو خواہ یہ تعلق ایک ساتھ ماں باپ کی طرف سے ہو جیسے بہن، بھائی یا صرف ماں کی طرف سے ہو جیسے ماموں، خالہ اور ان کی اولاد یا صرف باپ کی طرف سے ہو جیسے چچا، پھوپھی اور ان کی اولاد، رشتہ داری کا تعلق دادا، دادی تک شامل ہوتا ہے۔ سب سے بڑا رشتہ ماں باپ کا ہے۔ مختصر الفاظ میں ارحام کا مطلب یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ انسان سے نسبی تعلق رکھنے والے تمام لوگ جو اس کے رشتہ دار ہیں خواہ ماں کی طرف سے ہوں یا باپ کی طرف سے۔

جب ہم صلۂ رحمی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ واجبات میں سے ہے اور یہ کہ انسان کو صلۂ رحمی کرنا چاہئے کیونکہ اسلام نے قرآن اور روایات میں صلۂ رحمی کرنے کی ترغیب دی ہے تو اس سے ہمارا مقصد یہ واضح کرنا ہوتا ہے کہ ہم ان رشتہ داروں کے ساتھ ان کے معاملات میں ان کا خیال رکھ کر ان سے اچھے تعلقات قائم کریں۔ ان کے مال و اسباب کی بہتری کیلئے بات کریں۔ ان سے ملاقات کریں، ان کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہوں، ان کی مدد کریں اور اللہ تعالیٰ سے ان کی خیر و سلامتی کیلئے دعا کریں۔

اس امر سے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ انسان اور اس کے رشتہ داروں کے درمیان پیار و محبت و دوستی اور شفقت و مہربانی کی بنیاد پر تعلقات قائم ہوں نہ کہ قساوت قلبی، نفرت، بغض اور دوری کی بنیاد پر۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ اور اہلبیتؑ نے ہمیں صلۂ رحمی کرنے کی وصیت فرمائی ہے۔ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"أُوصِي الشَّاهِدَ مِنْ أُمَّتِي وَ الْغَائِبَ مِنْهُمْ وَ مَنْ فِي أَصْلَابِ الرِّجَالِ وَ أَرْحَامِ النِّسَاءِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَنْ

يَصِلَ الرَّحِمَ وَإِنْ كَانَتْ مِنْهُ عَلَى مَسِيرَةِ سَنَةٍ فَإِنَّ ذَلِكَ مِنَ الدين"

''میں اپنی اُمت کے تمام افراد سے خواہ حاضر ہوں یا غائب اور روزِ قیامت تک آنے والے انسان جو مردوں کے صلبوں اور عورتوں کے رحموں میں ہیں انہیں وصیت کرتا ہوں کہ وہ صلۂ رحمی کریں۔ اگر چہ وہ ایک سال کے سفر کی مسافت پر ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ یہ دین کا حصہ ہے"۔ (کافی۔ج ۲،ص ۱۵۱)

جیسا کہ ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے قطع رحمی کرنے والے پر لعنت کی ہے اور جہنم کو اس کا ٹھکانہ قرار دیا ہے چنانچہ اللہ تعالی نے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ

اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اللہ نے جن رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں منقطع کر دیتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ایسے ہی لوگوں پر لعنت ہے اور ان کیلئے ٹھکانا بھی برا ہوگا۔ (سورہ رعد/۲۵)

یہ ان آیات میں سے ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو صلۂ رحمی کرنے کا حکم دیا ہے۔

انسان کو رشتہ داروں سے صلۂ رحمی کرنی چاہیے، اگر چہ وہ اس سے قطع رحمی کریں جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

" لَا تَقْطَعْ رَحِمَكَ وَإِنْ قطعتك"

" اپنے رشتہ داروں سے قطع رحمی نہ کرو اگر چہ وہ تم سے ایسا کریں" (کافی۔ج ۲،ص ۳۴۷)

صلۂ رحمی کرنے والوں کیلئے الٰہی انعامات:

دنیا و آخرت میں صلہ رحمی کے کثیر فوائد اور ثمرات ہیں۔ انسان ان ثمرات کو حاصل کر کے ان سے استفادہ کرسکتا ہے۔ صلۂ رحمی کے ثمرات درج ذیل ہیں:

۱۔ درازی عمر اور رزق میں فراوانی:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

" مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَمُدَّ اللّٰهُ فِي عُمُرِهِ وَ أَنْ يَبْسُطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ فَلْيَصِل رحمه"

''جسے یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی عمر دراز کرے اور اس کے رزق میں اضافہ فرمائے تو اسے صلہ رحمی کرنی چاہیے۔''۔ (کافی: ج ۲،ص ۱۵۶)

اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

"إِنَّ صِلَةَ الرَّحِمِ تُزَكِّي الْأَعْمَالَ وَتُنْمِي الْأَمْوَالَ وَتُيَسِّرُ الْحِسَابَ وَتَدْفَعُ الْبَلْوَى وَتَزِيدُ فِي الرِّزْقِ"

"صلۂ رحمی اعمال کو پاکیزہ، مال واسباب میں اضافہ، حساب میں آسانی اور مصیبت دُور کرتی ہے۔"

(کافی۔ج ۲ص ۱۵۷)

۲۔صلۂ رحمی، حسن اخلاق اور آفتیں دور ہونے کا باعث:

اس بارے میں کثیر روایات موجود ہیں۔جیسا کہ مذکورہ حدیث میں تزکیہ اعمال کی تاکید کی گئی ہے جو کہ حسن اخلاق کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔اور صلۂ رحمی سے بلائیں دور ہوجاتی ہیں۔

اسی طرح امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

"صِلَةُ الْأَرْحَامِ تُزَكِّي الْأَعْمَالَ وَتُنْمِي الْأَمْوَالَ وَتَدْفَعُ البلوى"

"صلۂ رحمی کرنے سے اعمال پاکیزہ ہوتے ہیں، مال و اسباب میں برکت ہوتی ہے اور مصیبتیں دور ہوجاتی ہیں"۔(کافی۔ج ۲ص ۱۵۰)

اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

"صِلَةُ الْأَرْحَامِ تُحَسِّنُ الْخُلُقَ وَ۔۔۔ وَتُطَيِّبُ النفس"

"صلۂ رحمی کرنے سے اخلاق بہتر ہوتا ہے...دل پاکیزہ ہوتا ہے..."۔(کافی۔ج ۲ص ۱۵۱)

۳۔روح قبض ہونے میں آسانی اور حساب میں سہولت:

امام ہادی (محمد تقیؑ) علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

"فیما کلم اللہ تعالیٰ بہ موسیٰ، فَقَالَ مُوسَى إِلَهِي فَمَا جَزَاءُ مَنْ وَصَلَ رَحِمَهُ قَالَ يَا مُوسَى أُنْسِي لَهُ أَجَلَهُ وَ أُهَوِّنُ عَلَيْهِ سَكَرَاتِ الموْت"

"جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کلام کیا تو موسیٰؑ نے پوچھا صلۂ رحمی کرنے والے کی جزا کیا ہے۔؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰؑ میں اس کی عمر دراز کروں گا اور موت کی سختیوں کو اس کیلئے آسان کروں گا"۔(بحارالانوار:ج،۱۳ص ۳۲۷)

رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے آپؐ نے فرمایا:

"صِلَةُ الرَّحِمِ تُهَوِّنُ الْحِسَابَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ۔۔۔ تقِي مَصَارِعَ السوءِ"

''صلۂ رحمی کرنے سے حساب میں آسانی ہوتی ہے اور۔۔۔ اچانک اور بری موت سے بچاتی ہے۔''
(کافی۔ج۲،ص۱۵۷)

۴۔عظیم اجر وثواب:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

'' مَنْ مَشَى إِلَى ذِي قَرَابَةٍ بِنَفْسِهِ وَ مَالِهِ لِيَصِلَ رَحِمَهُ أَعْطَاهُ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ أَجْرَ مِائَةِ شَهِيدٍ وَ لَهُ بِكُلِّ خُطْوَةٍ أَرْبَعُونَ أَلْفَ حَسَنَةٍ وَ مُحِيَ عَنْهُ أَرْبَعُونَ أَلْفَ سَيِّئَةٍ وَ رُفِعَ لَهُ مِنَ الدَّرَجَاتِ مِثْلُ ذَلِكَ وَ كَانَ كَأَنَّمَا عَبَدَ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ مِائَةَ سَنَةٍ صَابِرا محتسبا ''

''جو شخص صلۂ رحمی کرنے کی خاطر اپنا مال لیکر کسی رشتہ دار کی طرف روانہ ہوتا ہے تو اللہ عز وجل اسے سو شہیدوں کا ثواب عطا فرماتا ہے، اسے ہر قدم پر چالیس ہزار نیکیاں ملتی ہیں اور چالیس ہزار گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں اور اسی قدر درجات بلند ہوتے ہیں۔اور وہ ایسا پاک باز ہوجاتا ہے گویا کہ وہ صبر کی حالت میں اپنا محاسبہ کرتے ہوئے ایک سو سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالایا ہو۔''(من لا یحضرہ الفقیہ: ج۴ص۱۶)

قطع رحمی کا عذاب:

قطع رحمی کرنے کے دنیا وآخرت میں بہت بُرے اثرات ہوتے ہیں۔دنیا میں قطع رحم کرنے والے کو جلد موت آتی ہے اور سزا مل جاتی ہے۔مالی نقصان اُٹھانا پڑتا ہے، ناراضگی پیدا ہوتی ہے اور رحمت اُٹھ جاتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

'' لَا تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ عَلَى قَوْمٍ فِيهِمْ قَاطِعُ الرحم'' (مستدرک الوسائل۔ج۱۵،ص۱۸۴)

'' خدا کی رحمت اس قوم پر نازل نہیں ہوتی جس میں قطع رحمی کرنے والا موجود ہو''۔

جبکہ آخرت میں اس کے نقصانات جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں اور اس پر لعنت ہوتی ہے اور اس کا بُرا ٹھکانہ (جہنم) ہوگا۔

صلہ رحمی اور قطع رحمی کی اہم قسمیں کون سی ہیں؟

بلا شبہ والدین سے نیکی کرنا، صلۂ رحمی کی بہترین قسم اور ان کی نافرمانی کرنا قطع رحمی کی بدترین قسم ہے۔قرآن کریم اور اہلبیتؑ نے والدین کے ساتھ بہترین تعلقات رکھنے اور ان سے نیک سلوک کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔کیونکہ یہ دونوں انسان

کی بنیاد اور درخت کے تنے کی مانند ہیں اور جس طرح جڑ اور تنے کے بغیر درخت سوکھ جاتا ہے۔اسی طرح انسان کا اپنے والدین کے ساتھ اچھا تعلق نہ ہونے کی وجہ سے اس پر مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اور وہ گوناگوں مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے جس سے ہمارے معاشرہ سے امن وسکون ختم ہو جاتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام کے صحابی منصور ابن حازم امام سے روایت کرتے ہیں کہ:

"قُلْتُ أَيُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ قَالَ الصَّلَاةُ لِوَقْتِهَا وَ بِرُّ الْوَالِدَيْنِ وَ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ عَزَّوجلَ"

''میں نے امام علیہ السلام سے پوچھا کہ بہترین اعمال کونسے ہیں آپ نے فرمایا اول وقت نماز کا ادا کرنا، والدین کے ساتھ اچھا برتاو کرنا، اور اللہ کی راہ میں جھاد کرنا۔''(الکافی۔۲،ص۱۵۸)

حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے عرش کے سائے میں ایک شخص کو دیکھا اور پوچھا اے خدا یہ کون ہے جسے تو نے پناہ دے رکھی ہے یہاں تک کہ اسے عرش کے سائے میں قرار دیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ علیہ السلام:

''یہ شخص اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کرتا تھا۔''(الکافی۔۲،ص۳۴۷)

اس سے ثابت ہوا کہ والدین کا نافرمان وہ ہے جس کے ان کے ساتھ تعلقات بہتر نہ ہوں اور یہی دوزخ میں جائے گا۔''

رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ:

ثلاثة لا يدخلون الْجَنَّةَ الْعَاقُّ لِوَالِدَيه (معدن الجواہر،۳۱)

''تین قسم کے لوگ جنت میں داخل نہ ہوں گے، ان میں سے ایک والدین کا نافرمان ہے ...۔''

امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

"لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْعَاقُّ لوالديه"

''اپنے والدین کا نافرمان جنت میں داخل نہ ہوگا۔''(وسائل الشیعہ۔ج۲۱،ص۵۰۱)

والدین کے ساتھ تعلق کے آداب:

والدین کے ساتھ اچھے تعلق کے مختلف آداب ہیں:

مثلاً والدین سے محبت کرنا، شکریہ ادا کرنا، اطاعت کرنا، احترام کرنا، انکساری ونرمی سے پیش آنا اور ان کیلئے دعائے خیر کرنا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔

وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا

" اور مہر محبت کے ساتھ ان کے آگے انکساری کا پہلو جھکائے رکھو اور دعا کرو، پروردگارا! ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں (شفقت سے) پالا تھا"۔(اسراء/۲۴)

مومن کی دعا:

آئیے اپنے والدین کیلئے اس طرح دعا کریں:

" اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي وَ لِوالِدَيَّ وَ ارْحَمْهُما كَما رَبَّيانِي صَغِيراً وَ اجْزِهِما عَنِّي خَيْراً اللّٰهُمَّ اجْزِهِما بِالْإِحْسانِ إِحْساناً وَ بِالسَّيِّئاتِ غُفْراناً اللّٰهُمَّ أَدْخِلْهُما الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِكَ يا ارحم الراحمين"

"اے اللہ مجھے اور میرے والدین کو بخش دے، میرے والدین پر اس طرح رحم فرما جس طرح انہوں نے میرے بچپن میں مجھ پر شفقت و مہربانی کی۔ اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے! انہیں نیکی کے بدلے میں ثواب عطا فرما اور اپنی رحمت سے ان کے گناہوں سے درگزر فرما کر انہیں بخش دے۔"

(بحار الانوار: ج ۹۸ ص ۱۸۹

خلاصہ

١. ارحام انسان کے رشتہ دار ہیں خواہ ماں کی طرف سے ہوں یا باپ کی طرف سے۔
٢. صلۂ رحمی عظیم ترین واجب اور قطع رحمی بدترین گناہ ہے۔
٣. صلۂ رحمی کرنے کے دنیا میں اچھے اثرات ظاہر ہوتے ہیں جیسے درازی عمر، رزق میں اضافہ اور مصائب و مشکلات کا دُور ہونا وغیرہ۔ اور آخرت میں بھی اس کے اچھے اثرات سامنے آئیں گے۔ جیسے حساب میں آسانی، پل صراط سے گزرنا اور شہداء جیسا اجر و ثواب ملنا۔
٤. قطع رحمی کرنے کے دنیا میں بُرے اثرات ظاہر ہوتے ہیں جیسے سزا ملنا، مال و اسباب میں نقصان ہونا، رحمت کا اُٹھ جانا، آخرت میں لعنت کا شکار ہونا اور جنت میں داخلہ سے محروم ہونا۔
٥. صلۂ رحمی کی عظیم ترین صورت والدین سے نیکی کرنا۔ اور قطع رحمی کی بدترین قسم والدین کی نافرمانی کرنا ہے۔ اس لئے والدین سے محبت، شکر و احترام، اطاعت و فرمانبرداری اور نرمی کے ساتھ پیش آنا واجب ہے۔

سوالات

١. ارحام سے کون لوگ مراد ہیں؟
٢. انسان صلۂ رحمی اور قطع رحمی کیسے کرتا ہے؟
٣. جو صلۂ رحمی کرے اس کا اجر و ثواب کیا ہے؟ اور جو قطع رحمی کرے اس کی سزا کیا ہے؟
٤. صلۂ رحمی کی بہترین صورت کیا ہے؟

مطالعہ کیلئے

شیخ عبدالکریم الحائریؒ اور محتاج کی پکار

شیخ عبدالکریم الحائری مرحوم حوزہَ علمیہ قم المقدس کے بانی ہیں۔ان کا ایک خادم تھا جس کا نام شیخ علی بتایا جاتا ہے۔اس سے نقل ہوا ہے کہ موسم سرما میں ایک رات مَیں شیخ صاحب کے گھر کے صحن میں سویا ہوا تھا کہ اچانک مجھے دروازہ پر دستک کی آواز سنائی دی۔مَیں بستر سے اُٹھا اور جا کر دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک غریب عورت کھڑی کہہ رہی ہے میرا خاوند مریض ہے۔ہمارے پاس نہ غذا ہے اور نہ دوا۔یہاں تک کہ آگ جلانے کیلئے بھی کچھ نہیں ہے۔مَیں نے اسے جواب دیا: اے بی بی! رات گئے اس وقت ہم آپ کیلئے کچھ نہیں کر سکتے۔کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ شیخ صاحب کے پاس کوئی ایسا مال موجود نہیں ہے کہ جس سے وہ تمہاری مدد کر سکیں۔یہ سن کر وہ عورت خالی ہاتھ واپس چلی گئی۔جب شیخ صاحب نے ہماری باتیں سنیں تو مجھے آواز دے کر بلایا اور کہا اے شیخ علی! جب روزِ قیامت ہوگا تو اللہ تجھ سے اور مجھ سے پوچھے گا کہ رات کے اس پہر میں میری ایک کنیز تمہارے دروازے پر سوال کرنے آئی اور تم نے اس کی ضرورت پوری نہیں کی تو ہم کیا جواب دیں گے؟! مَیں نے کہا، جناب محترم! ہم اس وقت عورت کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟ انہوں نے پوچھا کیا تمہیں اس عورت کے گھر کا پتہ معلوم ہے؟ مَیں نے جواب دیا، جی ہاں۔البتہ وہاں تک جانا مشکل ہے کیونکہ سڑکوں پر کیچڑ اور برف پڑی ہوئی ہے۔انہوں نے کہا ،چلو ہم اس کے گھر چلتے ہیں۔جب ہم وہاں پہنچے تو ہم نے اس کے مریض خاوند کو دیکھا، گھر پر نظر دوڑائی تو ہمیں اس عورت کی بات میں صداقت نظر آئی۔جناب شیخ نے مجھے حکم دیا کہ مَیں میڈیکل آفیسر ڈاکٹر کے پاس جاؤں اور انہیں جناب شیخؒ کا پیغام پہنچاؤں کہ وہ آ کر مریض کا معائنہ کریں۔چنانچہ مَیں اس ڈاکٹر کے پاس گیا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ڈاکٹر نے علاج اور دوا تجویز کی۔مجھے ایک کاغذ پر نسخہ لکھ کر دیا اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔جناب شیخ نے مجھے حکم دیا کہ ابھی میڈیکل سٹور پر جاؤں اور جناب شیخ کے حساب میں دوا خرید کر لے آؤں۔مَیں وہاں پر گیا اور دوا لے آیا۔پھر جناب شیخ نے مجھے حکم دیا کہ مَیں فلاں شخص کے گھر جاؤں اور ان کے خرچ پر کوئلے کا تھیلا خرید لاؤں۔چنانچہ مَیں کوئلہ بھی لایا اور اس کے ساتھ کچھ کھانے کا سامان بھی لے آیا۔خلاصہَ کلام یہ ہے کہ اس غریب گھرانے میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی۔دوا کھانے کے بعد ان کے مریض کی حالت قدرے بہتر ہوگئی۔انہوں نے کھانا کھایا اور سکھ کا سانس لیا۔اس کے بعد جناب شیخ نے مجھ سے کہا تم ہمارے گھر میں کتنی مقدار گوشت لایا کرتے ہو؟ مَیں نے جواب دیا سات سو گرام، تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ مَیں روزانہ اس خاندان کو آدھا گوشت دیا کروں، باقی آدھا گوشت ہمیں کافی رہے گا۔اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ عزت وعظمت والا ہے۔

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

مسلمان آپس میں نہایت نرم اور کفار پر سخت ہیں

روس کے سابق صدر گورباچوف کو اسلام کی دعوت اور گستاخ رسول سلمان رشدی کے خلاف امام خمینیؒ کے فتویٰ نے پورے عالم میں ارتعاش برپا کیا تو ڈاکٹر محمد علی نقویؒ بے پناہ خوش ہوئے اور فرمانے لگے "امامؒ کے ہوتے ہوئے ایک تو محمد رسول اللہؐ کا دین پھیل رہا ہے اور دوسری جانب گستاخان محمدؐ پر غضب طاری ہے۔ گویا امام خمینیؒ قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر ہیں جس میں ارشاد رب العزت ہے کہ: "مسلمان آپس میں نہایت نرم اور کفار پر بڑے سخت ہیں"۔

راہِ خدا میں جہاد

- جہاد کیا ہے اور کیوں کیا جاتا ہے؟
- جہاد کے بارے میں اسلام کا موقف کیا ہے؟ اور جہاد کیسے کیا جاتا ہے؟
- مجاہدین کی صفات کیا ہیں؟

مقدمہ

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ راہ خدا میں جہاد کرنا اللہ تعالیٰ کی ذات تک رسائی حاصل کرنے اور سعادت کے حصول کا تیز ترین راستہ ہے۔ اس لئے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"سِیَاحَۃُ اُمَّتِی الجہاد"

''میری اُمت کی سیاحت جہاد ہے۔'' (مستدرک الوسائل۔ج،۱۱ص ۱۴)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جہاد کیا ہے؟ اسلام میں اس کی قدر ومنزلت کیا ہے؟ اور کیا اسلامی شریعت میں اس کے مراتب اور شرائط بیان کی گئی ہیں؟

جہاد کیا ہے؟

جہاد کا مطلب اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے جنگ کرنا، راہ حق سے منحرف ہونے والوں، مسلمانوں کی سرزمین پر قابض اور مسلمانوں کے حقوق غصب کرنے والوں، مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کرنے والوں اور اسلامی سرزمینوں پر حملہ کرنے والوں سے قتال کرنا ہے۔

یہ جہاد مسلمانوں پر نماز، روزہ وغیرہ جیسے دوسرے واجبات کی طرح فرض ہے کہ اگر مسلمان جہاد کیلئے نہ اُٹھیں اور اسے چھوڑ دیں تو اسے ایک اسلامی واجب کا ترک کرنا سمجھا جائے گا۔ امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

"اَلْجِهَادُ فَرْضٌ عَلَى جَمِيعِ الْمُسْلِمِينَ لِقَوْلِ اللهِ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَال"

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان تم پر قتال کرنا فرض کر دیا گیا ہے، کی بناء پر تمام مسلمانوں پر جہاد کرنا فرض ہے۔
(مستدرک الوسائل۔ج،۱۱ص ۱۴)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: اگر کوئی شخص ایسی حالت میں مرے کہ اس نے جہاد نہ کیا ہو یا اس کے دل میں جہاد کرنے کی خواہش پیدا نہ ہوئی ہو تو وہ ایک قسم کی نفاق کی حالت میں مرے گا۔

مندرجہ ذیل مثال کے ذریعے ہم جہاد کا مفہوم واضح کرتے ہیں:

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ انسانی جسم کو کوئی بیماری لگ جاتی ہے اور اسے ایک خاص قسم کا وائرس لگ جاتا ہے۔ جو اس کیلئے تکلیف و درد کا باعث بن جاتا ہے تو یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان فوراً ایسے ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے جو اس کا علاج کرتا ہے اور اسے مناسب دوا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ وائرس ختم ہو جاتا ہے اور اس کا جسم دوبارہ تندرست ہو جاتا ہے۔

اور جو انسان کسی مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود علاج کیلئے ڈاکٹر سے رجوع نہیں کرتا اسے اپنے حق میں خطاوار سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات انسان علاج کے دوران درد و تکلیف اور دوا کی کڑواہٹ محسوس کرتا ہے لیکن اسے برداشت کرتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ جلد ہی اسے مرض سے شفا مل جائے گی اور وہ اپنی سابقہ صحیح و سالم حالت میں پلٹ آئے گا جہاں اسے کوئی درد و تکلیف نہ ہوگی۔ بالکل اسی طرح کبھی ملت اسلامیہ کو دشمنوں کے حملے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی بناء پر امام خمینیؒ نے اسرائیل کو کینسر کے پھوڑے کے الفاظ سے موسوم کیا ہے۔ لہٰذا اب یہ تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ جسم کے اس مرض کے علاج اور اسکے جڑ سے خاتمہ کیلئے اُٹھ کھڑے ہوں تاکہ یہ کینسر ملت اسلامیہ کیلئے موت کا سبب نہ بن جائے۔ اس کے علاج کیلئے اس کی ضروری دوا تلاش کریں۔ اس سرطانی پھوڑے کو محو کرنے اور اس مرض کو روکنے کیلئے جنگ کے سوا کوئی دوسری دوا نہیں ہے۔

اسلام میں جہاد کی قدر و منزلت:

دین اسلام میں جہاد کو عظیم قدر و منزلت اور بلند مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے دین کا دفاع کیا جاتا ہے آیات قرآنی اور رسولؐ و اہلبیتؑ کی احادیث و روایات میں یہ نقطہ واضح ہو جاتا ہے۔ جس کی بناء پر جہاد دین کا ستون، ایمان کا رکن، بہترین و باعظمت عمل اور جنت کا ایک دروازہ ہے۔

امام علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

”فَإِنَّ الْجِهَادَ بَابٌ مِنْ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَتَحَهُ اللّٰهُ لِخَاصَّةِ أَوْلِيَائِهِ“

”جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے اللہ تعالیٰ خاص طور پر اپنے پسندیدہ بندوں کیلئے کھولتا ہے۔“ (کافی: ج ۵،ص ۴)

اور آپؑ ہی سے روایت ہے:

"الْجِهَادُ عِمَادُ الدِّينِ وَ مِنْهَاجُ السعداء"

''جہاد دین کا ستون اور سعادت مندوں کا راستہ ہے''(غرر الحکم۔ص ۳۴۳)

اور آپؑ ہی سے روایت ہے کہ:

"الْإِيمَانُ أَرْبَعَةُ أَرْكَانٍ الصَّبْرُ وَ الْيَقِينُ وَ الْعَدْلُ وَ الجهاد"

''ایمان کے چار ارکان ہیں۔صبر،یقین،عدل اور جہاد۔''(مستدرک الوسائل۔ج ۱۱،ص ۱۶)

آپؑ سے ہی روایت ہے کہ:

"إِنَّ الْجِهَادَ أَشْرَفُ الْأَعْمَالِ بَعْدَ الْإِسْلَامِ وَ هُوَ قِوَامُ الدِّينِ"

''اسلام قبول کرنے کے بعد بہترین عمل جہاد ہے کیونکہ یہ دین کو قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔''

(کافی۔ج ۵،ص ۳۶)

اسی طرح ایسی روایات بھی وارد ہوئی ہیں جن میں جہاد ترک کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے اور جو جہاد کو ترک کرے اسے اللہ ذلت و رسوائی کا لباس پہنا دیتا ہے۔اس پر مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ جہاد ترک کرنے والے اور رشد و ہدایت کے درمیان ایک رکاوٹ اور پردہ حائل کر دیتا ہے۔

جہاد کیسے کیا جاتا ہے؟

انسان کی طاقت اور استطاعت کے مطابق جہاد کرنے کے متعدد طریقے ہیں۔

پہلا مرتبہ: یہ جہاد کی سب سے بڑی قسم ہے جس میں مجاہد دشمن کے مقابلے میں میدان جنگ میں لڑتے ہوئے اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔

دوسرا مرتبہ: دشمن سے مقابلے کیلئے مال دے کر جہاد کرنا۔

تیسرا مرتبہ: جہاد اور مجاہدین کے خلاف نازیبا گفتگو کرنے والوں کا جواب دینا۔مجاہدین کا دفاع کرتے ہوئے دینی اور فکری بنیادوں پر ان مخالفین کو منہ توڑ جواب دینا۔

مجاہدین کی صفات:

جہاد کی چند شرائط ہیں جن کا ایک مجاہد میں پایا جانا اشد ضروری ہے:۔

۱۔خالص نیت کے ساتھ خدا کیلئے:

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد صرف راہِ خدا میں کیا جائے اور اس کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہو۔

۲۔تقویٰ اور احکام شرعیہ کی پابندی:

انسان کو چاہیے جہاد اصغر کے میدان جنگ میں داخل ہونے کے ساتھ ساتھ جہاد اکبر کے ذریعے اپنے نفس کی روحانی اور اخلاقی صلاحیتوں کا تزکیہ کر لے۔

۳۔میدانِ جنگ میں تکالیف و پریشانیوں کا صبرواستقامت سے مقابلہ کرنا

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۚ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ

"اے نبی! مومنوں کو جنگ کی ترغیب دیں اگر تم میں سے بیس صابر (جنگجو) ہوں تو وہ دوسو (کافروں) پر غالب آجائیں گے اور تم میں سے سو افراد ہوں تو ایک ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں۔(انفال / ٦٥)

۴۔جہاد کی آمادگی:

ہر مسلمان کو دین کے دفاع اور اسلامی سرزمین کے تحفظ کیلئے خود کو جسمانی طور پر اور وسائل کے اعتبار سے آمادہ کرنا چاہیے

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ ۚ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ

اور ان (کفار) کے مقابلے کے لیے تم سے جہاں تک ہو سکے طاقت مہیا کرو اور پلے ہوئے گھوڑوں کو مستعد رکھو تا کہ تم اس سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں نیز دوسرے دشمنوں کو خوفزدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ ان کو جانتا ہے۔(انفال/ ٦٠)

۵۔اسلام اور حق کے جھنڈے تلے جمع ہو کر جہاد کرنا۔

جو کہ امام معصومؑ یا ان کی غیبت میں ولی فقیہ کے اذن کے بغیر ممکن نہیں۔

٦۔کثرتِ تعداد اور اسلحہ پر غرور نہ کرنا۔

کیونکہ جو میدانِ جہاد میں خود پسندی اور تکبر کا اظہار کرتا ہے تو شکست اس کا مقدر بن جاتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کرنے سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس کا بھروسہ اور اعتماد بحال نہیں رہتا۔

۷۔ثابت قدم اور ذکرِ الٰہی میں مصروف رہنا۔

اس بارے میں ارشاد ربانی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا

اے ایمان والو! جب تم کسی (مشرک) گروہ کا مقابلہ کرو تو ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ ذکر کرو۔ (انفال/۴۵)

مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ ہونا چاہیے کہ جب تک وہ ان شرائط پر کاربند رہیں گے تو بحکم خدا فتح و کامیابی ان کے قدم چومے گی اور وہ فتح یاب ہوں گے۔

خلاصہ

۱. مسلمانوں کی سرزمین اور مقامات مقدسہ کا دفاع کرتے ہوئے غاصب دشمنوں کا مقابلہ کرنا جہاد ہے۔
۲. اسلام میں جہاد کو عظیم قدر و منزلت اور بلند مقام و مرتبہ حاصل ہے کیونکہ اس کا مقصد دین کا دفاع اور مستضعفین و مظلومین کی مدد کرنا اور اسلامی سرزمین کا دفاع کرنا ہے۔
۳. جو مسلمان جہاد کو ترک کر دیتا ہے اس پر آفت و بلا نازل ہوتی ہے۔ اس پر ذلت کی سیاہی چھا جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اسے راہِ خیر کی طرف ہدایت نہیں کرتا۔
۴. جہاد کرنے کے متعدد مراتب ہیں، ان میں جانی، مالی اور زبانی جہاد (حق گوئی) شامل ہیں۔
۵. جہاد کرنے کی چند شرائط ہیں، ان میں اخلاص، تقویٰ، صبر و استقامت، ہمت و حوصلہ، رہبر کی اطاعت، ثابت قدمی اور مغرور نہ ہونا شامل ہیں۔ اور جب انسان ان تمام شرائط کے مطابق عمل کرتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے۔

سوالات

۱. جہاد کی عظیم قدر و منزلت کی کوئی سی دو وجوہات بیان کریں۔
۲. جو مسلمان جہاد ترک کرے اس کی سزا کیا ہے؟
۳. جہاد کی چند شرائط بیان کریں۔

مطالعہ کیلئے

آخری خواہش

شہید برونسی کی حضرت زہرا سلام اللہ علیہا سے عقیدت اس سے کہیں بڑھ کر تھی کہ اسے الفاظ کے قالب میں ڈھالا جا سکے۔ایک بار انہوں نے فوجی جوانوں کے سامنے کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنے گلے کے خون سے حضرت زہرا(س) کا مقدس نام تحریر کروں۔ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا بعض کی نگاہ سے تعجب جھلک رہا تھا یہ بات قابل سوال تھی کہ آخر گلے کے خون سے ہی کیوں؟ میں نے ان سے پوچھا ان کے چہرے پر غم کے آثار ظاہر ہو گئے بولے! روز عاشورا کا ایک منظر ہمیشہ میرے دل کو آگ لگا دیتا ہے۔روز عاشورا کا نام سن کر جوانوں کی حالت دگرگوں ہوگئی شہید برونسی نے گریہ کرتے ہوئے اپنی بات کو جاری رکھا اور کانپتی ہوئی آواز کے ساتھ کہا اور وہ منظر اس وقت کا ہے جب امام حسینؑ نے حضرت علی اصغرؑ کے خون کو آسمان کی طرف پھینکا اور عرض کیا خداوند قبول فرما۔میں بھی چاہتا ہوں کہ اسی گلے کے خون سے حضرت زہراؑ کا مقدس نام لکھوں تا کہ اپنے عشق اور عقیدت کو ثابت کر سکوں۔

عجب یہ کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے خدا سے درخواست کی ہے کہ میری شہادت سے پہلے میری یہ آرزو ضرور پوری ہو۔اس کے بعد بھی انہوں نے یہ بات کئی بار کہی تھی لیکن جن چند فوجی آپریشنوں میں میں ان کے ہمراہ تھا ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔والفجر آپریشن میں،میں ان کے ساتھ نہیں تھا جب میں نے سنا کہ وہ زخمی ہو چکے ہیں تو سخت پریشان ہوا دوستوں نے بتایا کہ گولی ان کے گلے میں لگی ہے گلا ایک حساس جگہ ہے۔اس بات کا احتمال بھی تھا کہ وہ شہید ہو چکے ہوں۔میں نے اس بارے میں دوستوں سے پوچھا لیکن انہوں نے جواب دیا کہ نہیں الحمدللہ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ایک جوان نے بتایا کہ بالآخر آقائے برونسی کی یہ خواہش پوری ہوگئی۔میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ انہوں نے اسی خون سے جو ان کے گلے سے بہہ رہا تھا پتھر کے ایک تختے پر حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کا مقدس نام تحریر کیا۔اتفاق سے مجھے اسی دن انہیں دیکھنے کا شرف حاصل ہوا انہیں سٹریچر پر لے جایا جا رہا تھا وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے لہٰذا ان سے بات چیت نہیں کی جا سکتی تھی لیکن میں نے ان کے گلے کے زخم اور دائیں ہاتھ کی انگلی پر خون کو واضح طور پر دیکھا ابھی ان کا زخم پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا کہ محاذ جنگ پر لوٹ آئے ان کے چہرے سے خاص قسم کا جوش وخروش ٹپک رہا تھا وہ خوشی ومسرت سے کہتے تھے خدا نے کرم فرمایا اور میری دعا قبول ہوگئی اب شہادت کے سوا میرے دل میں کوئی آرزو نہیں ہے۔ (از کتاب: خاک ہای نرم کوشک)

لوگوں کے ساتھ معاشرت

- لوگوں سے معاشرت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟
- اچھی معاشرت کیلئے افراد کو کیسے پہچانیں؟
- کن لوگوں کی صحبت اور معاشرت سے اجتناب کرنا چاہیے؟

مقدمہ

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"رَأْسُ الْعَقْلِ مُعَاشَرَةُ النَّاسِ بِالجمیل"

"دانشمندی کی بنیاد لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا ہے۔" (کشف الغمة: ج۱ص۵۷۱)

اگر حقیقت یہی ہے تو اس کے پیش نظر اسلام کا موقف کیا ہے؟ اور اسلام نے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے کے لئے کیا ہدایات جاری کی ہیں؟ یا ایسے کون لوگ ہیں جن کی دوستی سے اجتناب کرنا چاہیے؟

یہ سبق انہی سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔

لوگوں کے ساتھ معاشرت کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر:

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ قلبی طور پر لوگوں کے درمیان رہنا اور زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگوں سے علیحدہ تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ اسی طرح انسان کو اپنی طبعی ضروریات پوری کرنے کی خاطر کھانے پینے کیلئے اشیاء، رہنے سہنے کیلئے مکان اور تعلیم حاصل کرنے کیلئے سکول و کالج وغیرہ اور کام کاج کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات قائم کرنا پڑتے ہیں۔ ان باہمی تعلقات سے انسان کی صلاحیتیں پرورش پاتی ہیں، اس کی توانائیاں ظاہر ہوتی ہیں اور معاشرے میں بہتری کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ انسان اپنے معاشرے سے اثر پذیر ہوتا ہے اور خود بھی معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس طرح انسان اپنے ماحول میں موجود لوگوں کو برائی سے نیکی کی جانب اور نیکی سے برائی کی جانب تبدیل کر سکتا ہے۔

انسان کی فطرت سلیمہ کے مطابق اسلام میں بہترین نظریات پیش کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے اسلام نے لوگوں کو جنگلوں، ویرانوں، گرجا گھروں اور غاروں میں تنہائی کی زندگی بسر کرنے کی دعوت نہیں دی اور نہ ہی انہیں گھروں میں گوشہ نشینی اختیار کرتے ہوئے باہر نہ نکلنے کی دعوت دی ہے، بلکہ اسلام نے انسان کو اپنے معاشرے کا ایک فرد بن کر دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی ترغیب دی ہے اور معاشرے کی فلاح و بہبود کا پیغام دیا گیا ہے ۔ البتہ اسلام نے لوگوں کے ساتھ معاشرت کے مسئلہ کو غیر مشروط نہیں چھوڑا، بلکہ اس سلسلے میں اصول وضوابط معین کر دیئے ہیں ۔

چنانچہ اسلام نے دوستوں کے انتخاب اور لوگوں سے تعلقات کیلئے کچھ حدود و صفات بیان کی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ کیسے لوگوں سے دُور رہنا چاہیے اور ان کے ساتھ تعلقات رکھنے سے احتراز کرنا چاہیے ۔

لہٰذا جب ہم قریبی دوست کا انتخاب کرنے لگیں تو ہمیں چاہیے کہ اسلام نے جو اچھے دوستوں کی صفات بیان کی ہیں ان کی طرف پوری طرح توجہ کریں اور جس شخص میں یہ صفات نہ پائی جائیں اُسے اپنا قریبی دوست نہ بنائیں چونکہ ممکن ہے ایک بدکار دوست انسان پر اثر انداز ہو کر اسے اللہ تعالیٰ سے دور کر دے اور آخرت میں اسے اس دوستی پر نادم اور پشیمان ہونا پڑے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے:

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا
يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا

اور اس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا اور کہے گا: کاش میں نے رسول اللہ کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا۔ ہائے تباہی! کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ (سورہ فرقان ۔آیت ۲۷،۲۸)

اور جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَلْمَرْءُ عَلٰى دِينِ خَلِيلِهِ وَقَرِينِهِ"

انسان اپنے دوست اور ساتھی کے دین پر ہوتا ہے ۔ (کافی ۔ج ۲،ص ۳۷۵)

معاشرت کے قابل لوگوں کا انتخاب کیسے کریں؟

ہم جس انسان کو دوست بنانا چاہتے ہوں یا اس کے ساتھ تعلقات رکھنا چاہتے ہوں تو ہمیں اس میں چند صفات اور شرائط کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیے کیونکہ انسان جس طرح بُرے دوستوں کی صحبت سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح اچھے دوستوں کی صحبت بھی اس پر اچھے اثرات مرتب کرتی ہے ۔

اسلام میں دوستی، تعلق اور لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے کے لئے جو صفات اور شرائط وضع کی گئی ہیں وہ درج ذیل ہیں :

۱۔ ایمان: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ

بیشک مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔(سورہ حجرات۔۱۰)

چنانچہ جس طرح ماں باپ سے پیدا ہونے والے نسبی بھائیوں کا آپس میں تعلق ہوتا ہے بالکل اسی طرح دینی اور مومن بھائیوں کے درمیان بھی اُنس ومحبت والا تعلق قائم ہوتا ہے۔اس لئے جس سے ہم دوستی کرنا چاہتے ہوں یا اس سے تعلقات قائم کرنا چاہتے ہوں تو اس میں پہلی صفت ایمان ہے۔جبکہ اسلام نے کافر کے ساتھ بھائی چارے سے منع کیا ہے جیسا کہ نبی پاکؐ نے فرمایا:

"مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْآخِرِ فَلَا یُوَاخِیَنَّ کَافِراً"

''جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ کسی کافر کے ساتھ ہرگز بھائی چارہ قائم نہ کرے۔''

(وسائل الشیعہ۔ج۱۶،ص ۲۶۵)

۲۔آزمائش: مومن کو چاہیے کہ وہ جس سے دوستی کرنا چاہتا ہو اس کی آزمائش کرلے تاکہ اس کی نیکیاں اور برائیاں ظاہر ہوجائیں جس سے اسے پتہ چل جائے گا کہ یہ انسان دوستی کے قابل بھی ہے یا نہیں۔

امیرالمومنینؑ سے روایت ہے کہ:

"قَدِّمِ الاِخْتِبَارَ فِی اتِّخَاذِ الْإِخْوَانِ فَإِنَّ الاِخْتِبَارَ مِعْیَارٌ یُفَرِّقُ بَیْنَ الْأَخْیَارِ وَالأَشْرَارِ"

''لوگوں کو اپنا بھائی بنانے سے پہلے انہیں آزما لو کیونکہ آزمائش ہی ایسا معیار ہے جس سے نیک وبد کا فرق معلوم ہوتا ہے۔''(غرر الحکم۔ص ۴۱۶)

۳۔خدا کیلئے محبت کرنا: یعنی جس شخص سے آپ دوستی کرنا چاہتے ہیں وہ آپ کے دین وایمان کی وجہ سے آپ سے محبت وچاہت رکھتا ہو،دنیاداری،مصلحتوں اور ذاتی مفادات کی وجہ سے تم سے محبت نہ کرتا ہو۔امیرالمومنینؑ سے روایت ہے کہ:

"خَیْرُ الْإِخْوَانِ مَنْ کَانَتْ فِی اللّٰہِ مَوَدَّتُہُ"

"بہترین بھائی وہ ہے جس کی محبت خدا کی خاطر ہو"(غرر الحکم:ص ۴۲۳)

ایک اور حدیث میں آپؑ سے مروی ہے کہ:

"خَیْرُ الْإِخْوَانِ مَنْ لَمْ تَکُنْ عَلَی الدُّنْیَا أُخُوَّتُہُ"

''بہترین بھائی وہ ہے جس کا تمہارے ساتھ پیار ومحبت دنیاوی غرض سے نہ ہو۔''(غرر الحکم۔ص ۴۱۷)

۴۔آپ کا غمخوار ہو: امیرالمومنینؑ سے روایت ہے کہ:

"خَیْرُ إِخْوَانِکَ مَنْ وَاسَاکَ وَ خَیْرٌ مِنْہُ مَنْ کَفَاکَ وَإِنِ احْتَاجَ إِلَیْکَ أَعَانَکَ"

''تمہارا بہترین بھائی وہ ہے جو تمہاری غمخواری کرے اور اس سے بھی بہتر بھائی وہ ہے جو تمہاری کفالت کرے اور بوقت ضرورت تمہارے کام آئے۔''(غرر الحکم:۴۳۷)

٥۔اللہ کی طرف دعوت دینے والا ہو: امیر المومنینؑ سے ہی روایت ہے کہ:

" خَيْرُ إِخْوَانِكَ مَنْ دَعَاكَ إِلَى صِدْقِ الْمَقَالِ بِصِدْقِ مَقَالِهِ وَنَدَبَكَ إِلَى أَفْضَلِ الْأَعْمَالِ بِحُسْنِ أَعْمالِه"

''تمہارا بہترین بھائی وہ ہے جو اپنی سچی گفتگو کے ذریعے سے تمہیں سچ بولنے کی ترغیب دے اور خود نیک اعمال سرانجام دے کر تمہیں بھی نیک عمل کرنے کی دعوت دے۔''(غرر الحکم۔ ۴۱۷)

٦۔اطاعت میں معاون ہو: امیر المومنینؑ سے ہی روایت ہے کہ:

" الْمُعِينُ عَلَى الطَّاعَةِ خَيْرُ الْأَصحاب"

''اطاعت میں معاون ومددگار بہترین دوست ہوتا ہے۔''(غرر الحکم۔ ۴۱٦)

٧۔جس کی ملاقات سے یادِ خدا تازہ ہو جائے: جب نبی اکرمؐ سے یہ سوال کیا گیا کہ اچھے ساتھی کون ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ

"مَنْ تُذَكِّرُكُمُ اللهَ رُؤْيَتُهُ وَيَزِيدُ فِي عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهُ وَيُرَغِّبُكُمْ فِي الْآخِرَةِ عَمَلُهُ"

''جس کی ملاقات سے تمہیں خدا یاد آجائے، اس کی گفتگو تمہارے علم میں اضافہ کرے اور اس کا نیک عمل تمہیں آخرت کی ترغیب دے۔''(وسائل الشیعہ۔ج ۱۲، ص ۲۳)

٨۔باعزت لوگوں سے میل جول رکھنا: رسول پاکؐ سے روایت ہے کہ:

" أَسْعَدُ النَّاسِ مَنْ خَالَطَ كِرَامَ النَّاسِ"

''وہ لوگ انتہائی خوش بخت ہیں جو باعزت اور نیک لوگوں کے ساتھ میل جول رکھتے ہیں۔''

(من لایحضرہ الفقیہ: ج ۴، ص ۳۹۴)

٩۔علماء کی محفل میں بیٹھنا: آپؐ سے روایت ہے کہ:

" جَالِسِ الْعُلَمَاءَ يَزْدَدْ عِلْمُكَ وَيَحْسُنْ أَدَبُكَ وَتَزْكُ نفسكَ"

''علماء کی محفل میں بیٹھو، اس سے تمہارے علم میں اضافہ ہوگا، اخلاق اچھا ہوگا اور تمہارا دل پاک وصاف ہو جائے گا۔''(غرر الحکم :ص ۴۳۰)

کن بری صفات کے حامل لوگوں کی معاشرت سے اجتناب کریں:

جیسا کہ اچھے لوگوں سے دوستی کرنے کیلئے ان کی اچھی صفات اور شرائط سے آگاہ ہونا ضروری ہے بالکل اسی طرح لوگوں میں پائی جانے والی بری صفات کا علم بھی از حد ضروری ہے تاکہ ہم ان لوگوں سے دُور رہ سکیں۔رسول پاکؐ اور اہلبیتؑ کی روایات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہمیں مندرجہ ذیل افراد سے میل جول نہیں رکھنا چاہیے:

۱۔جھوٹا ۲۔احمق (بیوقوف) ۳۔فاسق وبدکار ۴۔بخیل ۵۔قطع رحمی کرنے والا

امام زین العابدینؑ نے اپنے فرزند امام محمد باقرؑ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

"پانچ قسم کے لوگوں سے محتاط رہنا، ان کی صحبت اختیار نہ کرنا، ان سے بات چیت نہ کرنا، انہیں اپنا ہمسفر مت بنانا۔ آپؑ (امام محمد باقرؑ) کہتے ہیں کہ مَیں نے پوچھا بابا جان! وہ کون سے لوگ ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: جھوٹے کی دوستی سے بچو...... فاسق و بدکار کی دوستی سے احتراز کرو...... بخیل کی دوستی سے اجتناب کرو...... احمق اور بیوقوف سے دوستی مت کرو...... رشتہ داروں سے قطع تعلقی کرنے والے کو اپنا ساتھی بنانے سے سے گریز کرو۔" (الکافی: ج ۱ ص ۳۶۷)

۶۔ فسادی (شر پسند): امام جوادؑ سے روایت ہے کہ:

"اِيَّاكَ وَ مُصَاحَبَةَ الشَّرِيرِ فَإِنَّهُ كَالسَّيْفِ الْمَسْلُولِ يَحْسُنُ مَنْظَرُهُ وَ يَقْبُحُ أَثَرُهُ"

"شریر آدمی سے دوستی مت کرو کیونکہ یہ لہراتی تلوار کی مانند ہے جو دیکھنے میں خوبصورت اور تاثیر کے لحاظ سے تکلیف دہ ہوتی ہے۔" (بحار الانوار: ج ۷۱ ص ۱۹۸)

۷۔ فاسق و بدکار: امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ:

"لَا تَصْحَبِ الْفَاجِرَ فَيُعَلِّمَكَ مِنْ فُجُورِهِ"

"بدکار کو اپنا ساتھی مت بناؤ کیونکہ وہ تمہیں بھی اپنے جیسے گناہ کرنا سکھا دے گا۔" (بحار الانوار: ج ۷۱ ص ۱۹۱)

۸، ۹۔ گمراہ اور گمراہی پھیلانے والا: قرآن کریم میں ذکر ہے کہ:

يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ○ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ

کاش! مَیں فلاں کو اپنا دوست نہ بناتا، اس نے تو میرے پاس ذکر (قرآن) آ جانے کے بعد مجھے اس سے غافل کر دیا۔ (فرقان۔ ۲۸، ۲۹)

۱۰۔ عیوب کی ٹوہ لگانے والوں سے: امام علیؑ سے روایت ہے کہ:

"إِيَّاكَ وَ مُعَاشَرَةَ مُتَتَبِّعِي عُيُوبِ النَّاسِ فَإِنَّهُ لَمْ يَسْلَمْ مُصَاحِبُهُمْ مُصَاحِبُهُ مِنْهُ منهم"

"لوگوں کے عیوب کی ٹوہ میں رہنے والوں سے دوستی کرنے سے اجتناب کرو کیونکہ ان کا ساتھی بھی ان کی کارستانیوں سے محفوظ نہیں رہتا ہے۔" (غرر الحکم۔ ص ۴۳۳)

۱۱، ۱۲، ۱۳۔ خیانت کار، ظالم اور چغلخور: امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ:

"احْذَرْ مِنَ النَّاسِ ثَلَاثَةً الْخَائِنَ وَ الظَّلُومَ وَ النَّمَّامَ"

"تین قسم کے لوگوں سے محتاط رہو: خیانت کار، ظالم اور چغلخور۔" (تحف العقول۔ ۳۱۵)

۱۴۔ جس کے رہن سہن سے واقف ہو: امام حسنؑ سے روایت ہے کہ:

"جب تک تم کسی کے اُٹھنے بیٹھنے اور رہن سہن کے مقام سے واقف نہ ہو جاؤ اس سے دوستی مت کرو۔"

خلاصہ

۱ انسان کے دل میں لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے کیونکہ وہ دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ زندگی

۲ نہیں بسر کرسکتا۔

اسلام نے انسان کو لوگوں کے ساتھ معاشرت کرنے سے نہیں روکا بلکہ اس امر کیلئے قواعد وضوابط معین کر دیئے ہیں۔

۳ جس انسان سے میل جول رکھنا یا اسے دوست بنانا چاہیے، اس میں یہ خوبیاں ہونی چاہئیں کہ وہ مومن، برائے خدا ہم سے محبت کرنے والا، ہمارا غمخوار، اللہ کی طرف داعی اور اطاعت الٰہی میں ہمارا معاون ومددگار ہو۔

۴ جن لوگوں سے بچنا چاہیے ان کی خرابیاں درج ذیل ہیں: جھوٹ، حماقت، خیانت، بدکاری، بخل، شر وفساد اور اعلانیہ گناہوں کا ارتکاب کرنا وغیرہ۔

سوالات

۱ کیا انسان میں اپنی فطرت کے عین مطابق لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے کی خواہش ہے؟

۲ کیا اسلام نے لوگوں کو علیحدہ ہوکر گوشہ نشینی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے؟

۳ اچھے دوست کی چند خوبیاں لکھیں۔

۴ کیسے انسان کی دوستی سے اجتناب ضروری ہے؟

مطالعہ کیلئے

محفل میں بیٹھنے کے آداب

۱- جب کوئی مسلمان بھائی محفل میں آئے تو اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ بناؤ اور وسعت پیدا کرو۔ اس کے لئے تکیہ رکھو اور اس کے بیٹھنے کی جگہ صاف کرو۔

۲- محفل میں آنے کے بعد جو شخص بیٹھنا چاہے یا جو بیٹھنے کے بعد کھڑا ہونا چاہے اس کے احترام میں کھڑا ہونا مستحب ہے۔ساتھ بیٹھے ہوئے سے اس کا نام، کنیت اور حال احوال پوچھنا مستحب ہے۔

۳- جو شخص محفل سے اُٹھ کر باہر جانا چاہے اس کے ساتھ چلنا چاہیے اگر چہ چند قدم ہی کیوں نہ ہوں۔ساتھ بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی طرف برابر توجہ مبذول رکھنی چاہیے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ساتھ بیٹھے تمام لوگوں کی طرف اپنی توجہ مساوی رکھی جائے۔ایسا نہ ہو کہ کسی کی طرف زیادہ توجہ ہو اور کسی کی طرف کم۔

۴- مسلمان کے لئے مستحب ہے کہ جب وہ بیٹھنا چاہے تو قبلہ رُخ ہو کر بیٹھے۔

۵- جب آدمی سامنے موجود ہو تو اس کی کنیت سے پکارا جائے اور اس کی غیر موجودگی میں اس کے نام سے یاد کیا جائے۔

۶- مسلمان سے مسکرا کر ملنا چاہیے اور اسے خوش رکھنا چاہیے۔اس کی مشکلات کو دُور کرنا چاہیے۔امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ:

”إِنَّهُ لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يُحْسِنْ صُحْبَةَ مَنْ صَحِبَهُ وَ مُرَافَقَةَ مَنْ رَافَقَهُ وَ مُمَالَحَةَ مَنْ مَالَحَهُ وَ مُخَالَقَةَ مَنْ خَالَقَه“

”جو شخص اپنے ساتھیوں اور ہم نشینوں کے ساتھ اچھے انداز میں نہیں رہتا نہ ان کے ساتھ کھاتا پیتا ہے اور جو اس سے میل جول رکھنا چاہے اس سے مل جل کر بھی نہیں رہتا تو اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

(بحارالانوار: ج۷۱، ص۱۶۱)

۷- محفل میں بیٹھے بزرگوں کا ادب واحترام کرنا چاہیے۔

۸- جب تین آدمی بیٹھے ہوں تو تیسرے کو وہاں سے اُٹھ کر نہیں جانا چاہیے۔

۹- جب کوئی مسلمان بات کر رہا ہو تو اس پر نکتہ چینی نہیں کرنا چاہیے اور اگر کوئی مسلمان اسے بلائے تو اس کے پاس جانا چاہیے۔

۱۰- ایسی محافل میں بیٹھنا چاہیے جس سے انسان کو فائدہ حاصل ہو، قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہو اور وہ کوئی ایسی شئے سیکھے جو دنیا و آخرت میں اس کے لئے مفید ثابت ہو۔

۱۱- بیٹھتے ہوئے درج ذیل دعا پڑھنا مستحب ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم وصلی علی محمد وآل محمد۔

۱۲- کھڑے ہوتے ہوئے بیٹھتے وقت پڑھی جانے والی دعا پڑھے اور اس کے ساتھ درج ذیل آیت بھی تلاوت کرے:

" رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَ سَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ العالمين"

کامل ترین نماز

- نماز کا کیا مقام ہے؟
- قبولیتِ نماز کی شرائط کیا ہیں؟
- مسجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت

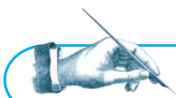

مقدمہ

دین اسلام میں نماز کو انتہائی اہمیت حاصل ہے یہاں تک کہ اسے دین کا ستون قرار دیا گیا ہے لیکن ہر نماز کو نہیں، اس سے مراد وہ نماز ہے جسے اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قبولیت ِنماز کی شرائط کیا ہیں؟ انفرادی اور باجماعت نماز میں کیا فرق ہے؟ اور مسجد میں نماز ادا کرنا دوسرے مقامات پر نماز پڑھنے سے کیسے افضل ہے؟

انہی سوالات کی بنیاد پر ہم نماز کی اہمیت اور اسلام میں اس کی قدرومنزلت سے آگاہی کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلام میں نماز کا مقام:

اسلام میں نماز کو عظیم قدرومنزلت اور فروع دین میں اولویت حاصل ہے۔ نماز عظیم ترین واجب عمل ہے۔ نماز فرض قرار دینے سے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان کا اپنے پروردگار سے تعلق قائم رہے، اس کے دل میں اللہ کی محبت موجزن رہتی ہے اور وہ اس کے لطف ورحمت کی معراج پر پہنچ جاتا ہے۔ نماز انسان کو بے حیائی اور برائی کے ارتکاب سے روکتی ہے۔ اسے بُرے اعمال سے بچاتی ہے، راہِ ہدایت پر گامزن رہنے میں اس کی حفاظت کرتی ہے یہاں تک کہ دنیا وآخرت میں اسے سعادت عطا کرتی ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ نماز ایک ایسی سیڑھی ہے جس کے ذریعہ انسان بلندی کی طرف ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچتا ہے اور اپنے ہدف اور مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ مقصد اطاعت ِالٰہی اور خوشنودی خدا ہے۔ اسی بناء پر نماز کو دین کا ستون قرار دیا گیا ہے۔ اگر یہ قبول ہوگئی تو باقی اعمال بھی قبول ہوجائیں گے اور خدانخواستہ اگر یہ قبول نہ ہوئی تو باقی سارے اعمال رائیگاں چلے جائیں گے۔ ہم نماز کو اس کی بہترین صورت میں بجالانے کے لئے اللہ عزوجل سے دعاگو ہیں کہ

 ہماری نمازوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ ایمان کے اس ستون یعنی نماز کو بجالانے میں اس کی چند شرائط کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

قبولیتِ نماز کی شرائط:

علمائے اخلاق اور فقہاء کرام نے متعدد ایسی شرائط بیان کی ہیں کہ جن کے پورا ہونے سے نماز اللہ عزوجل کی طرف مومن کی معراج بن جاتی ہے اور اللہ اسے قبول فرمالیتا ہے۔

۱) ان شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وضو اور قراءت صحیح ہو، اس کے علاوہ نماز کے افعال کو صحیح طریقے سے بجالائے۔

۲) اسی طرح انسان اوّل وقت میں نماز پڑھے اور فضول کاموں میں مصروف رہ کر نماز پڑھنے میں تاخیر نہ کرے۔

۳) دورانِ نماز انسان اس یقین کے ساتھ خشوع وخضوع کی حالت میں کھڑا ہو کہ وہ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں حاضر ہے۔

۴) ساتھ ہی دورانِ نماز صرف اللہ سبحانہ کی ذات اور اس کی خوشنودی کے حصول کے بارے میں غور وفکر کرے اور ایسے امور کے بارے میں نہ سوچے کہ جن کی وجہ سے خشوع وخضوع ختم ہو جائے۔

۵) ایک اور اہم بات یہ ہے کہ نماز کو حقیر (کم اہمیت) نہ سمجھے۔

اور اگر نماز میں مذکورہ شرائط موجود نہ ہوں تو اس انسان کو اپنی نماز سے سوائے مشقت اور تھکاوٹ کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

کامل ترین نماز کونسی ہے؟

نماز کی اہمیت کے متعلق ہماری بیان کردہ سابقہ تمام شرائط بھی انتہائی اہمیت وعظمت کی حامل ہیں لیکن دو ایسی بنیادی شرائط بھی ہیں جن کا خیال رکھنا مومن کیلئے بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ نماز ادا کرنے کی مختلف صورتیں ہیں کیونکہ نماز کبھی انفرادی طور پر پڑھی جاتی ہے اور کبھی جماعت کے ساتھ، کبھی مسجد میں اور کبھی گھر، دفتر یا کارخانہ وغیرہ میں اپنے کام کی جگہ پر ہی پڑھ لی جاتی ہے۔ لیکن کامل ترین نماز وہ ہے جو جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کی جائے۔

نماز جماعت کی فضیلت کیا ہے؟

نماز فرادیٰ پڑھنے کی نسبت جماعت کے ساتھ ادا کرنا کئی گنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ رسول اکرمؐ اور اہلبیتؑ سے متعدد ایسی احادیث روایت کی گئی ہیں کہ جن میں نماز جماعت میں حاضر ہونے کی ترغیب دی گئی ہے اور باجماعت نماز ادا کرنے والے کے لئے کثیر اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

''نماز ظہر کے بعد حضرت جبریلؑ میرے پاس ستر ہزار فرشتوں کے ہمراہ تشریف لائے اور کہا: اے محمدؐ!

آپؐ کا پروردگار آپؐ کو سلام کہتا ہے اور اس نے آپ کی بارگاہ میں دو ایسے تحفے بھیجے ہیں جو اس نے آپؐ سے پہلے کسی دوسرے نبیؑ کو عطا نہیں کئے۔ مَیں نے کہا وہ کونسے تحائف ہیں؟ اس نے جواب دیا تین رکعت وتر اور پانچ افراد کا باجماعت نماز ادا کرنا۔

مَیں نے پوچھا اے جبریل! باجماعت نماز پڑھنے سے میری اُمت کو کیا اجر ملے گا؟ تو اس نے جواب دیا اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اگر نماز جماعت میں دو افراد شامل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کیلئے ہر رکعت کے بدلے میں ایک سو پچاس نمازوں کا ثواب لکھ دے گا۔ اور اگر وہ تعداد میں تین ہوئے تو ان میں سے ہر ایک کیلئے ہر رکعت کے بدلے میں چھے سو نمازوں کا ثواب لکھ دے گا۔ اور اگر ان کی تعداد چار ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کو ہر ایک رکعت کے بدلے میں ایک ہزار دو سو نمازوں کا ثواب لکھ دے گا۔ اور اگر ان کی تعداد پانچ ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کو ہر رکعت کے بدلے میں دو ہزار چار سو نمازوں کا ثواب لکھ دے گا۔ اور اگر ان کی تعداد چھے ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کو ہر رکعت کے بدلے میں چار ہزار آٹھ سو نمازوں کا ثواب لکھ دے گا۔

اور اگر ان کی تعداد سات ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کو ہر رکعت کے بدلے میں نو ہزار چھے سو نمازوں کا ثواب لکھ دے گا اور اگر ان کی تعداد آٹھ ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کو ہر رکعت کے بدلے میں انیس ہزار دو سو نمازوں کا ثواب لکھ دے گا اور اگر ان کی تعداد نو ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کو ہر رکعت کے بدلے میں چھتیس ہزار چار سو نمازوں کا ثواب لکھ دے گا اور اگر ان کی تعداد دس ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کو ہر رکعت کے بدلے میں بہتر ہزار آٹھ سو نمازوں کا ثواب لکھ دے گا۔

پھر اگر ان کی تعداد دس سے زیادہ ہو جائے تو خواہ تمام آسمان و زمین کے دریا روشنائی بن جائیں اور تمام درخت قلم بن جائیں اور دونوں جہانوں کے فرشتے کاتب (لکھنے والے) بن جائیں تو وہ ان میں سے ہر ایک کی ایک رکعت کا ثواب بھی نہیں لکھ سکتے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! ایک شخص امام کے ساتھ جو تکبیرۃ الاحرام کہتا ہے وہ چھے ہزار حج و عمرہ اور دنیا و مافیہا سے ستر ہزار گنا بہتر ہے۔ اور امام کی اقتداء میں مومن کی ایک رکعت فقراء و مساکین پر ایک ہزار دینار صدقہ کرنے سے بہتر ہے اور امام کی اقتداء میں مومن کا ایک سجدہ ایک سو غلاموں کو راہِ خدا میں آزاد کرنے سے بہتر ہے۔ (مجمع الفوائد۔ ج ۳، ص ۲۴۱)

◆ مسجد میں نماز ادا کرنے میں کیا فضیلت ہے؟

مسجد اللہ کا گھر ہے اس لئے جو مسجد میں نماز ادا کرتا ہے تو گویا وہ بیت اللہ میں نماز پڑھتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں

آنے والے مہمان کی حیثیت میں آتا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی بہترین میزبانی کا حق ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد میں نماز ادا کرنا دوسرے مقامات پر نماز پڑھنے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ مسجد میں نماز ادا کرنے والے کی فضیلت کے بارے میں روایات میں کثیر اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ اہلبیتؑ نے مسجد کے پڑوس میں رہتے ہوئے باجماعت نماز نہ پڑھنے والے کو بے نمازی شمار کیا ہے۔ امیر المومنینؑ سے روایت ہے کہ:

''جو شخص فارغ اور صحیح و سالم ہو اور مسجد کے پڑوس میں رہنے کے باوجود واجب نمازیں جماعت کے ساتھ ادا نہ کرے تو اس کی کوئی نماز نہیں ہے۔'' (الحدائق الناضرۃ۔ ج ۷، ص ۲۶۵)

ایک مشہور حدیث نبویؐ ہے کہ:

''لَا صَلَاةَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ إِلَّا فِي مسجدِ''

''مسجد کے پڑوس میں رہنے والے کی نماز مسجد کے سوا کہیں ادا ہوتی ہی نہیں۔''

(تھذیب الاحکام: ج ۱، ص ۳۹۲)

اس لئے جو انسان مسجد میں نماز ادا نہیں کرتا اس کی طبیعت اور فطرت پر بہت بُرے اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ:

جو شخص مسجد میں نماز نہ پڑھے تو اس پر ناخوشگوار آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ حضرت اباعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا:

''شَكَتِ الْمَسَاجِدُ إِلَى اللهِ تَعَالَى الَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَهَا مِنْ جِيرَانِهَا فَأَوْحَى اللهُ إِلَيْهَا وَ عِزَّتِي وَ جَلَالِي لَا قَبِلْتُ لَهُمْ صَلَاةً وَاحِدَةً وَ لَا أَظْهَرْتُ لَهُمْ فِي النَّاسِ عَدَالَةً وَ لَا نَالَتْهُمْ رَحْمَتِي وَ لَا جَاوَرُونِي فِي جنتي''

''مساجد نے ان کے وہ ہمسائے جو ان میں حاضر نہیں ہوتے کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ مجھے میری عزت اور بزرگی کی قسم میں ان کی ایک نماز بھی قبول نہیں کرونگا، لوگوں میں ان کی عدالت ظاہر نہیں کرونگا، میری رحمت ان تک نہیں پہنچے گی اور انہیں جنت میں میرا پڑوس نصیب نہیں ہوگا'' (وسائل الشیعہ: ج ۵، ص ۱۹۶)

اور آپؑ سے ہی روایت ہے کہ بعض مساجد میں نماز ادا کرنا ایک لاکھ نمازوں کے برابر اور کچھ دوسری مساجد میں ایک ہزار نمازوں کے برابر اجر و ثواب ملتا ہے لیکن گھر میں نماز پڑھنے والے کو ایک نماز کا ثواب ملتا ہے۔

خلاصہ

یقینا نماز اللہ تعالیٰ کی محبت و رضا حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور اس کے دارِ رحمت تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے۔ یہ دین کا ستون ہے البتہ اس کے ادا کرنے کے لئے کچھ درج ذیل شرائط بھی ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے:

عاجزی و انکساری کے ساتھ نماز ادا کرنا، ذات الٰہی کے بارے میں غور و فکر کرنا، صحیح طرح وضو کرنا، افعال نماز کو صحیح طریقے سے بجالانا۔ نماز کی اہم شرط یہ ہے کہ اسے باجماعت ادا کیا جائے اور مسجد میں ادا کی جانے والی نماز، کامل ترین نماز ہے۔

سوالات

۱ نماز دین کا ستون کیوں ہے؟

۲ نماز کی کچھ ایسی شرائط بیان کریں جن کی وجہ سے اللہ عزوجل اسے قبول فرماتا ہے:

۳ کامل ترین نماز کونسی ہوتی ہے؟

مطالعہ کیلئے

نماز وِتر

نماز وِتر کی فضیلت:

حضرت ابوعبداللہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے، آپؑ نے فرمایا:

" مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَبِيتَنَّ إِلَّا بِوَتْرٍ قَالَ قُلْتُ تَعْنِي الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ الآخِرَةِ "

"جو شخص اللہ کی وحدانیت اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے نمازِ وتر پڑھے بغیر ہرگز نہیں سونا چاہیے اور فرمایا (وتر سے) میری مراد وہ دو رکعتیں ہیں جو نماز عشاء کے بعد ادا کی جاتی ہیں۔" (بحارالانوار: ج ۸۴، ص ۱۰۵)

آپؑ سے دوسری روایت میں وارد ہے کہ:

" لَا تَتْرُكُوا رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ عِشَاءِ الْآخِرَةِ فَإِنَّهَا مَجْلَبَةٌ لِلرِّزْقِ "

"نمازِ عشاء کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا مت چھوڑو، کیونکہ یہ رزق ملنے کا سبب ہے۔"

(مستدرک الوسائل: ج ۳، ص ۶۸)

نمازِ وتر پڑھنے کا طریقہ:

یہ نماز دو رکعت ہے جو نمازِ عشاء کے بعد بیٹھ کر پڑھی جاتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس کی پہلی رکعت میں سورہ الحمد کے بعد سورہ الواقعہ اور دوسری رکعت میں سورہ الحمد کے بعد سورہ توحید پڑھی جائے۔ سلام پڑھنے کے بعد جو چاہیں دعا مانگیں۔

البتہ فلاح السائل اور دیگر مناجات اور دعاؤں کی کتابوں میں نماز وتر کے بعد مخصوص دعاؤں کا ذکر ملتا ہے۔

تیسری فصل

سفر میں درپیش خطرات

- عزتِ نفس
- زبان کی آفات
- حرام نگاہ
- حرام آوازوں کا سننا
- حرام کھانا

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

مال امامؑ کا احساس

انقلاب کے بعد آئی ایس او کا ایک وفد ایران کے دورہ پر گیا۔ اس دورہ کے دوران میں ایک مرتبہ جب برادران نے رات زمین پر سو کر گزاری تو صبح معمولی سا کھانا کھایا تو ایک ساتھی نے ڈاکٹر محمد علی نقویؒ سے مزاحاً کہا "ڈاکٹر صاحب ایران کے دورہ پر آئے ہیں، جنگ خندق لڑنے نہیں آئے، آپ نے تو ہمارے پیٹ پر پتھر بندھوا دیئے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "عزیز دوست! آپ لوگوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ اپنے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ مجھ جیسا نالائق انسان جس کی انقلاب کیلئے کوئی خدمات نہیں اس قابل نہیں کہ اس پر مال امامؑ خرچ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ مال امامؑ ہماری آسائشوں پر خرچ ہونے کی بجائے محاذ جنگ پر مصروف ان مجاہدوں تک پہنچے جو اسلام کی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

عزت نفس

- عزت نفس کا مطلب کیا ہے؟
- کیا انسان کے گناہ اسکی عظمت کم کرتے ہیں؟ اگر کرتے ہیں تو کیسے؟
- بری صحبت کے کیا نقصانات ہیں؟

مقدمہ

انسانی عظمت واحترام:

اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ عزوجل نے انسان کو عظمت سے سرفراز کیا ہے اور اسے اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ اسکے علاوہ پوری کائنات کو اُس کے سامنے مسخر کر دیا ہے، ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ
فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا

اور بتحقیق ہم نے اولاد آدم کو عزت وتکریم سے نوازا اور ہم نے انہیں خشکی اور سمندر میں سواری دی اور انہیں پاکیزہ چیزوں سے روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں بڑی فضیلت دی۔ (اسراء۔ ۷۰)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وشعور اور حکمت وبصیرت جیسی صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا ہے، جن کے ذریعے وہ غلط صحیح، اچھے برُے اور ہدایت وگمراہی میں فرق کرتا ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ

ہم نے اسے راستے کی ہدایت کر دی۔ (انسان۔ ۳)

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ

ہم نے انسان کو دونوں راستوں (خیروشر) کی راہنمائی کر دی ہے۔۔۔۔ (بلد۔ ۱۰)

اکثر اوقات جب انسان اپنے عقل وشعور سے استفادہ نہیں کرتا تو اللہ عزوجل اس بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار افلا یعقلون سے کرتا ہے۔قرآن کریم میں اس بارے میں متعدد مثالیں وارد ہوئی ہیں۔

چونکہ انسان ایک قابل احترام اور صاحب عظمت مخلوق ہے اس لیے اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ انسان ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے منزل کمال پر جا پہنچے۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گوناگوں قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے اور اُس کی عزت نفس کا اسقدر خیال رکھا ہے کہ اُسے مسجود ملائکہ بنا دیا ہے۔اس لیے جو شخص اپنے معاملات میں عقل وشعور استعمال نہیں کرتا اور اپنی زندگی میں حکمت و دانائی کے تقاضوں کے برعکس اپنے امور سرانجام دیتا ہے اور اپنی زندگی کے قیمتی لمحات فضول کاموں میں صرف کرتا ہے تو وہ اپنی قدر ومنزلت کھو دیتا ہے اور اپنے ساتھ بڑی زیادتی کرتا ہے۔اپنی عزت نفس کا خیال نہیں رکھتا اور ذلت ورسوائی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔اس طرح وہ انسان جانوروں سے بھی بدتر قرار پاتا ہے کیوں کہ وہ عقل کو استعمال میں نہیں لاتا بلکہ اُسے غیر فعال کر دیتا ہے اور ایسے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے جو کسی طور سے عقل کے شایان شان نہیں۔اس لئے بہت سی سرگرمیاں ایسی ہوتی ہیں جو عزت دار انسان کے لائق نہیں ہوتیں۔ان میں سے کچھ سرگرمیاں درج ذیل ہیں:

لہو ولعب اور مقامات تہمت پر آمد ورفت:

اگر آپ اللہ عزوجل کی وحدانیت پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور اپنی ذات پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کی قدر و قیمت سے واقف ہیں اور آپ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن اللہ تعالیٰ سے ضرور ملاقات ہوگی اور وہ ہر چھوٹی بڑی شے کے بارے میں محاسبہ کرے گا تو پھر کیا آپ اسے دانائی سمجھتے ہیں کہ کسی ایسی محفل میں بیٹھے رہیں جہاں اللہ تعالیٰ آپ سے ناراض ہو جائے، آپ کو اپنی نگاہ کرم میں پست کر دے اور لوگوں کی نظروں میں بھی گرا دے؟

اُس وقت کیا حال ہوگا اگر وہ آپ کو ایسی جگہ موجود پائے جہاں پر وہ آپ کو دیکھنا پسند نہیں کرتا اور روز قیامت لوگوں کے سامنے آپ سے یہ پوچھے کہ جواری جب جوا کھیل رہے تھے تو آپ اُنکے پاس کیوں بیٹھے تھے؟ آپ ایسے مقام پر کیوں بیٹھے تھے جہاں شراب پی جا رہی تھی؟ آپ ایسی محفل میں کیوں بیٹھے تھے جہاں پر اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار کیا جا رہا تھا یا طاغوتوں کا ذکر ہو رہا تھا یا وہاں پر گمراہی پھیلائی جا رہی تھی؟

آپ اس وقت کیا جواب دیں گے اور آپ کے پاس کون سی ایسی دلیل ہوگی جو آپ کو اُس وقت نجات دلانے کیلئے کافی ہوگی؟ کیا آپ کی عمر اس سے زیادہ قیمتی نہیں ہے کہ آپ بری محفل میں جا کر یا فٹ پاتھوں پر کھڑے ہو کر ضائع کر دیں، جہاں پر آوارہ نوجوان نظر بازی کرتے رہیں یا ایسے لوگوں کے ساتھ گپ شپ کرتے رہیں جو بے ہودہ اور فحش کلام کرنے سے اجتناب نہیں کرتے۔چنانچہ اگر کوئی وہاں سے گزرے تو وہ صرف یہی کہے گا کہ آپ بھی اُنہی میں سے ہیں۔۔۔

تو کیا ایسی صورت میں آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ آپ یہ سمجھیں کہ وہ آپ سے بدگمانی کر رہا ہے کیونکہ امیر المومنینؑ سے روایت ہے:

" مَنْ عَرَّضَ نَفْسَهُ لِلتُّهَمَةِ فَلَا يَلُومَنَّ مَنْ أَسَاءَ بِهِ الظَّنَّ "

''جو شخص اپنے آپ کو تہمت کے مقامات میں قرار دے تو اگر کوئی اس کے بارے میں سوءظن کرے اسے ملامت نہ کرے''(کافی: ج ۸ ص ۱۵۲)

یہی وجہ ہے کہ اہل بیتؑ نے ہمیں اسقدر حکم دیا ہے کہ ہم ملامت کرنے والے کو بُرا بھلا نہ کہیں کیونکہ ہم خود اس کا سبب بنے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

" اتّقوا مواضع التّهم "

''مقامات تہمت سے بچو''۔(بحار الانوار۔ج ۳۳ ص ۵۰۹)

اس لیے اعلانیہ گناہ کرنے والوں کے ساتھ فسق و فجور کی محفلوں میں بیٹھنے سے انسان نہ صرف اللہ تعالیٰ اور لوگوں کی نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے بلکہ شریعت کی نگاہ میں بھی اُسکی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی، جس کی وجہ سے اُس کی گواہی بھی قبول نہیں کی جاتی۔ اور اُس آدمی کی گواہی کیسے قبول کی جا سکتی ہے جو لہو ولعب اور فسق و فجور کی محفلوں میں آمد و رفت رکھتا ہے اور اپنے بارے میں لوگوں کی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ حضرت ابوجعفر (امام باقر) علیہ السلام سے روایت ہے، آپؑ نے فرمایا:

" لَا يَجُوزُ شَهَادَةُ الْمُتَّهَمِ إِلَى أَنْ قَالَ وَ الَّذِينَ يَجْلِسُونَ مَعَ الْبَطَّالِينَ وَالْمُغَنِّيِنَ وَأَهْلِ الْمُنْكَرِ فِي مَجْلِسِ المنكر "

''ان لوگوں کی گواہی قابل قبول نہیں ہے جو تمسخر کرنیوالوں (فضول اور بے ہودہ قصہ گو)، گانا بجانے والوں اور گناہ کرنے والوں کی محفل میں بیٹھتے ہیں''۔(مستدرک الوسائل۔ج ۱۷ ص ۴۳۳)

مقامات تہمت پر جانے سے اجتناب کرنا لازم ہے اور ہر ایسی محفل کہ جس میں حرام شہوات بھڑک اُٹھیں خصوصاً ایسے مقامات پر نامحرم عورتوں کے ساتھ میل جول رکھنا اور مرد و خواتین سے مخلوط مقامات مثلاً بازاروں وغیرہ میں بے مقصد جانے سے خواہ اس سے بدگمانی پیدا ہو یا نہ ہو اجتناب ضروری ہے۔ کیونکہ ایسے مقامات پر نفس امارہ شیطان کا معاون و مددگار ہوتا ہے اور ایسی محافل کو خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے جس سے ہم ایسے کاموں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن سے اللہ راضی نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمارے لیے ایسے کام پسند کرتا ہے۔

روایت میں ہے کہ ایک نوجوان نے گھر خریدا جس کا دروازہ ایسی سمت میں کھلتا تھا جس کے سامنے والے گھر میں ایک نوجوان لڑکی رہتی تھی جو اپنا دروازہ بند نہیں کرتی تھی۔ وہ نوجوان امام جعفر صادقؑ کے پاس آیا اور اس بارے میں دریافت کیا تو آپؑ نے فرمایا:

" تَحَوَّلْ مِنْهُ فَإِنَّ الرَّجُلَ وَ الْمَرْأَةَ إِذَا خُلِّيَا فِي بَيْتٍ كَانَ ثَالِثُهُمَا الشَّيْطَانُ "

''اس گھر کو چھوڑ دو کیونکہ جب مرد وزن کسی مقام پر اکیلے ہوتے ہیں تو اُن کیساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے۔''
(وسائل الشیعہ۔ج ۱۹ ص ۱۵۴)

اور امام علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

"لَایَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَۃٍ"

''کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں ملاقات نہ کرے۔''(وسائل الشیعہ۔ج ۱۴ص ۲۶۵)

ایک روایت میں ہے کہ ابلیس نے کہا کہ:

"لَا أَغِیبُ عَنِ الْعَبْدِ فِی ثَلَاثِ مَوَاضِعَ إِذَا هَمَّ بِصَدَقَةٍ وَإِذَا خَلَا بِامْرَأَةٍ وَعِنْدَ الموت"

میں تین مواقع پر انسان کے پاس سے غائب نہیں ہوتا۔جب وہ صدقہ دینا چاہے، جب وہ (نامحرم) عورت کے ساتھ تنہا ہو اور موت کے وقت۔(مستدرک الوسائل۔ج ۱۴ص ۲۶۵)

بُری صحبت:

شاید سب سے اہم چیز جو انسان کو اُس کی خواہشات کے مقابلے میں کمزور کر دیتی ہے اور زبان و عمل سے بُرائی کو خوبصورت بنا کر پیش کرتی ہے نیز اُسے بُرائی سُننے اور دیکھنے کا عادی بنا دیتی ہے وہ اُس کے ایسے دوست ہیں جو دنیوی زندگی میں اُس کے ساتھ ہوتے ہیں۔دنیا میں کتنے ہی ایسے دوست ہیں جو اپنے دوستوں کو خراب کرتے ہیں اور اُنہیں تباہی کے دہانے پر لے جاتے ہیں۔اس لیے جو شخص بد اخلاق اور بے ہودہ انسان کے ساتھ ہمنشینی کرے گا وہ خود بھی اُس جیسی صفات کا حامل ہو جائے گا۔اُس کے دل میں بُری عادات سے نفرت ختم ہو جائے گی اور وہ اس طرح لاشعوری طور پر اپنے دوست سے برائیاں سیکھے گا کہ اُسے اس کا احساس ہی نہ ہوگا اور بُرے اخلاق کے سامنے وہ اپنی تمام شان و شوکت کھو بیٹھے گا۔اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو کوڑے کے ڈھیر پر زندگی گزارتا ہے، وہ اس گندگی پر رہ رہ کر اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ نہ ہی اُس کو وہاں سے گندی بدبو آتی ہے اور نہ ہی اس کو برا لگتا ہے بلکہ اُس کی اپنی بُو بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ایک عربی شاعر کے شعر کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ:

☆ بااعتماد اور نیک آدمی کو دوست بناؤ تم اُس کی صحبت سے لُطف اُٹھاؤ گے کیونکہ انسانی طبیعت اپنے دوست اور ساتھی کے موافق ہو جاتی ہے اور اس کا رنگ پکڑتی ہے۔

☆ جیسا کہ ہوا کا جہاں سے گزر ہوتا ہے وہاں کی بدبو سے بدبو اور خوشبو سے خوشبو اپنے ساتھ لے لیتی ہے۔

☆ اس لیے اللہ اور اُس کے رسولؐ نے ہمیں نیک اور عزت دار لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

" أَسْعَدُ النَّاسِ مَنْ خَالَطَ كِرَامَ النَّاسِ"

''سب سے زیادہ خوش بخت انسان وہ ہے جو عزت دار لوگوں سے میل جول رکھتا ہے۔''

(من لا یحضرہ الفقیہ۔ج ۴ص ۳۹۴)

کیونکہ نیک انسان اطاعت الٰہی میں مددگار ہوتا ہے جب کہ بُرا آدمی بُرائی کو خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

"اَلْمُعِینُ عَلَی الطَّاعَةِ خَیْرُ الاصحاب"

"اطاعت خداوندی میں تعاون کرنے والا انسان بہترین دوست ہوتا ہے۔" (غرر الحکم۔ ۴۱۶)

خاتمہ

برادر عزیز! اس دنیا میں آپ کو اختیار ہے کہ نیکی اور نیک صحبت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے مستحق بن جاؤ یا اُس شخص کی مانند ہو جاؤ جس پر شیطان مسلط ہو چکا ہے۔ اگر آپ فسق و فجور کرنے والوں کی محفلوں میں بیٹھیں گے، بدکرداروں سے دوستی کریں گے اور بُرے افراد کے ساتھ ہم نشینی کریں گے تو آخرت میں بھی آپ کے وہی دوست ہوں گے۔

اب یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ آپ اپنا ٹھکانہ کہاں بناتے ہیں جواری، شرابی، لہو ولعب میں مشغول، آلات موسیقی بجانے والوں کیساتھ؟ یا نیک، صالح، شہداء وانبیاءؑ کے ساتھ؟! تاکہ آپکا پروردگار آپ سے راضی وخوشنود ہو جائے اور آخرت میں آپکی عظمت و کرامت میں اضافہ فرمائے۔ اب آپ کسے دوست بنانا چاہتے ہیں اس کا انتخاب آپ کو ابھی کرنا ہوگا۔

خلاصہ

- اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کر کے خاص احترام وتکریم سے نوازا ہے لہٰذا صاحب عزت و کرامت وہی انسان ہے جو اپنی عقل کو استعمال کرے۔
- لہو ولعب والی جگہوں پر آمد ورفت اور ایسے مقامات پر جانا جہاں پر تہمت کا خدشہ ہو اپنے آپ کو حقیر اور بے آبرو کرنے کے مترادف ہے۔
- برے دوستوں کی ہمراہی انسان کے اخلاق کو تباہ کر دیتی ہے۔

سوالات

صحیح اور غلط کی صورت میں جواب دیں۔

۱. انسان کیلئے جائز ہے کہ ہر کسی کے ساتھ، ہر طرح کی محفل میں بیٹھ جائے، چاہے وہ گناہ کا ارتکاب کر رہے ہوں۔( )
۲. انسان کیلئے ضروری ہے کہ اپنے امور میں عقل کے فیصلوں کو مانے۔( )
۳. برے دوستوں کی ہمراہی انسان کیلئے مضر نہیں ہے۔( )
۴. انسان کو اس بات کی بالکل پرواہ نہیں ہونی چاہیے کہ اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔( )

مطالعہ کیلئے

شیخ انصاری اور سہم امام کا ایک ریال

۱۔ **بزرگ علماء** میں سے ایک نے بیان کیا ہے کہ جن دنوں میرا شیخ انصاری رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں آنا جانا تھا۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ شیطان کے ہاتھ میں کچھ زنجیریں ہے اور وہ اپنے حال میں مست جارہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہاں جارہے ہو؟ اس نے جواب دیا میرا ارادہ ہے کہ یہ زنجیریں لوگوں کی گردنوں میں ڈالوں جس طرح کل میں نے ایک زنجیر شیخ انصاری کے گلے میں ڈالی تھی اور انہیں کمرے سے باہر تک لے آیا تھا لیکن وہ زنجیر توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔

جب میں بیدار ہوا تو شیخ انصاری کی خدمت میں پہنچا اور جو خواب میں دیکھا تھا ان سے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ جو کچھ شیطان نے کہا ہے صحیح ہے۔ اس ملعون نے کل مجھے فریب دینا چاہا تھا کیونکہ میرے پاس پیسے نہیں تھے اور گھر میں کسی چیز کی ضرورت تھی۔ میں نے سوچا کہ سہم امام میں سے ایک ریال قرض لے کر اس سے اپنی ضرورت پوری کرلیتا ہوں اور بعد میں اس کی ادائیگی کردوں گا۔ یہ سوچ کر میں نے ایک ریال اٹھا لیا اور گھر سے باہر نکل آیا لیکن راستے میں مجھے ندامت ہوئی اور میں گھر واپس لوٹ گیا اور ایک ریال اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ کیونکہ شیخ انصاری جس مقام اور مرتبے پر فائز تھے اس مقام کا تقاضا یہی تھا کہ سہم امام سے اپنی ذات کے لیئے ایک ریال بطور قرض لینا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔

۲۔ **بھوک و افلاس کے باوجود امانت کی حفاظت:** بھوک اور قلت غذا کی وجہ سے ایک عالم بری طرح نحیف اور لاغر ہو گئے تھے یہاں تک کہ ایک مومن نے کھانے کی کچھ چیزیں انہیں لا کر دیں اور ان کی حالت قدرے بہتر ہوئی۔

اسی دوران ایک فقیر داخل ہوا اور اس نے ان سے کچھ مال کا سوال کیا وہ عالم اٹھے اور کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے صندوق میں ہاتھ ڈال کر کچھ مال نکالا اور فقیر کو دے دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک دوسرا شخص اندر آیا جو نسبی لحاظ سے رسول اکرمؐ سے نسبت رکھتا تھا اور سادات میں سے تھا اس کے چہرے پر حاجت مندی کے آثار نمایاں تھے عالم نے اسے بھی کچھ مال عطا کر دیا۔

وہاں پر حاضر لوگوں میں سے بعض نے تعجب کا اظہار کیا کہ آپ کے پاس یہ سب مال ہے اور آپ اس فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں؟ عالم نے جواب دیا یہ مال میرا نہیں ہے یہ کچھ لوگوں کی امانت ہے جو انہوں نے میرے پاس رکھوائی ہے تا کہ اسے مستحق لوگوں تک پہنچا دوں۔ اگر میں اسے خرچ کر ڈالتا تو یہ امانت میں خیانت ہوتی۔ اور سب سے بڑی خیانت امت کے ساتھ خیانت کرنا ہے۔

دوسرا سبق

زبان کی آفات
(جھوٹ، غیبت، فحش گوئی)

- میں نعمتِ زبان پر کیسے خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کر سکتا ہوں؟
- جھوٹ، غیبت اور فحش گوئی کی سزا کیا ہے؟
- میں ان بری صفات سے کیسے چھٹکارا پا سکتا ہوں؟

مقدمہ

زبان کی اہمیت:

زبان انسان کیلئے اللہ تعالی کی عظیم نعمت ہے۔ اس کے ذریعے وہ دوسرے انسانوں سے رابطہ قائم کرتا ہے اور انہیں اپنے افکار و خیالات سے آگاہ کرتا ہے۔ زبان عبادت کا وسیلہ ہے اس کے ذریعے ذکر خدا، دعا، قرآن مجید کی تلاوت، حصول علم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انجام پاتے ہیں۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ:

"أَلَا وَإِنَّ اللِّسَانَ الصَّالِحَ يَجْعَلُهُ اللهُ تَعَالَى لِلْمَرْءِ فِي النَّاسِ خَيْرٌ لَهُ مِنَ الْمَالِ يُورِثُهُ مَنْ لَا يَحْمَدُهُ"

آ گاہ ہو جاو کہ اللہ جس کیلئے بھی صالح اور اچھی زبان قرار دے جس کی وجہ سے لوگ اس کی ستائش کریں اس مال سے کہیں بہتر ہے جس کا وہ ایسے شخص کو وارث بنائے جو اس کی ستائش نہ کرے۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۱۲۰)

لیکن بعض اوقات یہی زبان انسان کو مصیبتوں اور آفات میں مبتلا کر دیتی ہے، اس کی دنیا بلکہ آخرت کی بربادی کا سبب بنتی ہے اور خدا نہ کرے انسان جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ عَلَى مَنَاخِرِهِمْ فِي النَّارِ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ"

کیا لوگوں کو ان کی زبانوں کے ذریعے انجام شدہ افعال کے علاوہ کوئی دوسری چیز اوندھے منہ جہنم میں ڈال سکتی ہے۔ (کافی: ج ۲، ص ۱۱۶)

"اللِّسَانُ سَبُعٌ إِنْ خُلِّيَ عَنْهُ عَقَرَ"

زبان ایسا درندہ ہے کہ جسے اگر آزاد چھوڑا جائے تو کاٹ کھاتا ہے۔(نہج البلاغہ۔حکمت ۶۰)

اسی لیے انسان کے اعضاء و جوارح ہر روز زبان سے اس بات کی درخواست کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا فعل انجام نہ دے جس کی وجہ سے انہیں عذاب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

”إِنَّ لِسَانَ ابْنِ آدَمَ یُشْرِفُ کُلَّ یَوْمٍ عَلَی جَوَارِحِهِ فَیَقُولُ کَیْفَ أَصْبَحْتُمْ فَیَقُولُونَ بِخَیْرٍ إِنْ تَرَکْتَنَا وَیَقُولُونَ اللهَ اللهَ فِینَا وَیُنَاشِدُونَهُ وَیَقُولُونَ إِنَّمَا نُثَابُ بِكَ وَنُعَاقَبُ بِكَ“

انسان کی زبان ہر صبح دوسرے اعضاء سے پوچھتی ہے کہ تمھارا کیا حال ہے؟ اعضاء جواب دیتے ہیں: اگر تم ہمیں چھوڑ دو تو خیریت سے ہیں ہمارے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو تمھاری وجہ سے ہمیں ثواب ملتا ہے اور تم ہی ہم پر عذاب نازل ہونے کا سبب بنتی ہو۔(کافی۔ج۲ص۱۱۵)

نعمت زبان کا شکر کیسے ادا کریں؟

آپ جان چکے ہیں کہ زبان اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے اس کی اہمیت کسی بھی عقلمند انسان سے پوشیدہ نہیں ہے۔عقل نعمتیں دینے والے محسن کی شکرگزاری کو لازم اور واجب جانتی ہے۔کسی بھی نعمت کے شکر ادا کرنے کا سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اس نعمت کے ساتھ اس کے عطا کرنے والے خالق کی معصیت نہ کرے بلکہ اس نعمت سے ان کاموں میں استفادہ کرے جنہیں عطا کرنے والا پسند کرتا ہے۔اور اسے ان کاموں میں نہ لگائے جو اسے پسند نہیں۔پس انسان کو چاہیے کہ زبان کو شریعت مقدسہ کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق استعمال کرے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

”لَا یَسْتَقِیمُ إِیمَانُ عَبْدٍ حَتَّی یَسْتَقِیمَ قَلْبُهُ وَلَا یَسْتَقِیمُ قَلْبُهُ حَتَّی تَقِیمَ لسانه“

جب تک انسان کے دل کی اصلاح نہ ہو ایمان کی اصلاح نہیں ہوتی اور دل کی اصلاح ،زبان کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں۔(مستدرک الوسائل ،ج۹ص۳۱)

زبان استعمال کرنے کا حق یہ ہے کہ اسے ہر بری بات کہنے سے بچایا جائے اور اسے اچھی بات کہنے کا عادی بنایا جائے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ

اور میرے بندوں سے کہہ دیجیے: وہ بات کرو جو بہترین ہو۔(اسراء:۵۳)

یہی انسان کو چاہیے کہ زبان کو صرف مفید بات کہنے کیلئے استعمال کرے۔رسول اکرم کا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

”مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللهِ وَ الْیَوْمِ الْآخِرِ فَلْیَقُلْ خَیْراً أَوْ لِیَسْکُتْ“

جو شخص خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ صرف اچھی بات کرے یا خاموش رہے۔
(کافی: ج ۲،ص ۶۶۷)

اسی طرح ذکر خدا کیلئے زبان کو استعمال کیا جانا چاہیے۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا

اے ایمان لانے والو کثرت سے اللہ کا ذکر کیا کرو۔(سورہ احزاب۔۴۱)

نتیجہ یہ کہ نعمت زبان کا شکر یہ ہے کہ اسے حقیر اور پست باتوں سے بچایا جائے۔آئیے زبان کے ذریعے انجام پانے والے بعض گناہوں اور انکی سزا سے آشنا ہوں۔

◆ جھوٹ اور اس کی سزا:

جھوٹ ایسی بری صفات میں سے ہے جسے سبھی لوگ ناپسند کرتے ہیں، اور جھوٹے شخص کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے فرمایا:

"اَلْكَذِبُ مُجَانِبُ الْإِيمَانِ وَلَا رَأْيَ لِكَذُوبٍ"

جھوٹ ایمان کو دور کر دیتا ہے اور جھوٹے کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔
(مستدرک الوسائل۔ج ۹،ص ۸۸)

جھوٹ بولنے والا اپنے جھوٹ کی وجہ سے ایمان کی شیرینی کی لذت سے محروم رہتا ہے۔جھوٹ، جھوٹے شخص کو دنیا میں بھی رسوا کر دیتا ہے چونکہ وہ جھوٹ بولنے کے بعد بھول جاتا ہے۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

"إِنَّ مِمَّا أَعَانَ اللّٰهُ بِهِ عَلَى الْكَذَّابِينَ النِّسْيَانَ"

اللہ تعالی نے فراموشی کو جھوٹوں کیلئے (نقصان کا) ذریعہ بنایا ہے۔(کافی۔ج ۲،ص ۳۴۱)

جھوٹا شخص دنیا و آخرت میں جھوٹ کی وجہ سے رسوا ہو جاتا ہے۔رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"إِيَّاكَ وَالْكَذِبَ فَإِنَّهُ يُسَوِّدُ الْوَجْهَ"

جھوٹ سے بچو چونکہ اس سے چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے۔(مستدرک الوسائل۔ج ۹،ص ۸۸)

امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے:

"مِنْ أَعْظَمِ الْخَطَايَا اللِّسَانُ الْكَذُوبُ"

خداوند کے نزدیک سب سے بڑے گناہوں میں سے زبان کا جھوٹا پن ہے۔
(مستدرک الوسائل۔ج ۹،ص ۸۵)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جھوٹے کے انجام کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

"لِلَّذِی یُحَدِّثُ فَیَکْذِبُ لِیُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ وَیْلٌ لَهُ وَیْلٌ لَهُ وَیْلٌ لَه"

ہلاکت ہے اس شخص کیلئے جو لوگوں کو ہنسانے کیلئے جھوٹ بولے، اس کیلئے ہلاکت ہے، ہلاکت ہے۔

(وسائل الشیعہ ،ج ۱۲،ص ۲۵۱)

غیبت اور اس کی سزا:

قرآن پاک نے جو بدترین مثال بیان فرمائی ہے وہ غیبت کرنے والے کے بارے میں ہے چونکہ اسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے والا قرار دیا ہے۔

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ

اور تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو تم نفرت کرتے ہو۔ (سورہ حجرات: ۱۲)

غیبت کرنے والے کا انجام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سرپرستی سے نکل کر شیطان کی سرپرستی میں داخل ہو جاتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے:

"مَنْ رَوَى عَلَى مُؤمِنٍ رِوَايَةً يُرِيدُ بِهَا شَيْنَهُ وَ هَدْمَ مُرُوَّتِهِ لِيُسْقِطَهُ مِنْ أَعْيُنِ النَّاسِ أَخْرَجَهُ اللهُ مِنْ وَلَايَتِهِ إِلَى وَلَايَةِ الشَّيْطَانِ فَلَا يَقْبَلُهُ"

اگر کوئی شخص کسی مومن کے بارے میں کوئی بات کرے جس سے اس کا مقصد اسے عیب دار بنانا اور اس کی شخصیت کو ختم کرنا ہو تا کہ وہ لوگوں کی نگاہوں میں گر جائے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اپنی سرپرستی سے نکال کر شیطان کی ولایت میں داخل کر دے گا اور شیطان بھی اسے قبول نہیں کرے گا۔

(مستدرک الوسائل ۔ج ۹،ص ۱۳۵)

فحش گوئی اور اس کی سزا:

فحش گوئی قبیح ترین اور انتہائی بری صفات میں سے ہے اور سبھی لوگ فحش گوئی سے نفرت کرتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔

"إِنَّ اللهَ حَرَّمَ الْجَنَّةَ عَلَى كُلِّ فَحَّاشٍ بَذِیءٍ قَلِيلِ الْحَيَاءِ لَا يُبَالِي مَا قَالَ وَ لَا مَا قِيلَ لَه"

اللہ تعالیٰ نے ہر فحش گو بے حیا انسان پر جنت کو حرام قرار دیا ہے کہ جسے پرواہ نہیں ہوتی ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ یہ کہ اسے کیا کہا جا رہا ہے۔ (کافی ۔ج ۲،ص ۳۲۳)

ایسا شخص حقیقی مومن نہیں ہوتا۔ اور رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق۔

"لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِیءِ"

انسان باایمان طعنہ دینے والا، لعنت کرنے والا، بدگو، اور بدزبان نہیں ہوسکتا۔ (نہج الفصاحۃ: ص ۴۵۰)

ایسے شخص کا انجام یہ ہے کہ وہ جہنم کے عذاب میں داخل ہوگا کہ جس کا وہ مستحق ہے امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"الْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءِ وَ الْجَفَاءُ فِی النَّار"

فحش گوئی جفا کی وجہ سے ہے اور جفا کار انسان جہنمی ہے۔ (کافی۔ ج ۲ ص ۳۲۵)

ان بری صفات کے ساتھ کیا کیا جائے؟

ہمیں چاہیے کہ اپنی زبان پر کنٹرول کرنے اور اسے خاموش رہنے کا عادی بنانے کے ذریعے ان بری صفات سے نجات حاصل کریں اور اپنی زبان کی اس طرح حفاظت کریں جیسے سونے اور چاندی کی حفاظت کی جاتی ہے۔ آئیے ہم ان بری صفات کو اپنے سے دور کریں اور ان کی جگہ اچھی صفات پیدا کریں۔ اپنے نفس کو ان پست امور سے بالا تر سمجھیں۔ اگر ہماری زبان کسی قدر ان رذائل کے ساتھ آلودہ ہو چکی ہے تو توبہ کے ذریعے اسے پاک کریں۔

حضرت ابوذر نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس شخص کی توبہ کے بارے میں پوچھا جو جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے

"قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ فَمَا تَوْبَةُ الرَّجُلِ الَّذِی يَكْذِبُ مُتَعَمِّدًا"

تو آپ نے فرمایا:

"اَلِاسْتِغْفَارُ وَ صَلَوَاتُ الْخَمْسِ تَغْسِلُ ذٰلِكَ"

استغفار اور نماز پنجگانہ اسے پاک کر دیتے ہیں۔ (وسائل الشیعہ، ج ۱۲ ص ۲۶۱)

اور سنیں امام سجاد علیہ السلام کا فرمان جو زبان کے حق کے بارے میں ہے فرماتے ہیں کہ:

"حَقُّ اللِّسَانِ إِكْرَامُهُ عَنِ الْخَنَا وَ تَعْوِيدُهُ الْخَيْرَ وَ تَرْكَ الْفُضُولِ الَّتِی لَا فَائِدَةَ لَهَا وَ الْبِرَّ بِالنَّاسِ وَ حُسْنَ الْقَوْلِ فِيهِم"

اور زبان کا حق یہ ہے کہ اسے فحش گوئی اور گالم گلوچ سے دور رکھا جائے، اچھائی کی عادت ڈالی جائے، بے فائدہ اور فضول باتوں سے روکا جائے اور لوگوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آئے اور ان کے ساتھ نیک گفتگو کی جائے۔ (رسالۃ الحقوق (امام سجادؑ) ص ۷۰)

خلاصہ

۱ زبان کا استعمال اپنے اور معاشرے میں فائدہ مند کاموں کے سلسلے میں کرنا چاہیے۔

۲ جھوٹ، غیبت اور فحش گوئی انسان کی عزت گھٹاتے ہیں اور دردناک عذاب کا باعث بنتے ہیں۔

۳ توبہ کرنا چاہیے چونکہ یہ زبان کی پاکی کا واحد طریقہ ہے۔

سوالات

درست یا غلط کی علامت لگائیں۔

۱ انسانی عقل جھوٹ کو برا نہیں سمجھتی۔( )

۲ ویل، جہنم کی ایک وادی کا نام ہے۔( )

۳ قیامت کے دن فحش گو کی سزا اس کی زبان کا کاٹا جانا ہے۔( )

مطالعہ کیلئے

مریض سے ملاقات کے آداب

مریض سے ملاقات کرتے وقت چند آداب کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے جو درج ذیل ہیں:

۱- اس کے پاس زیادہ دیر مت بیٹھیں۔

۲- اس کی خیریت دریافت کریں اور اس کی شفایابی کے لئے دعا کریں البتہ یوں کہنا بہتر ہے کہ" اشْفِهِ بِشِفَائِكَ وَ دَاوِهِ بِدَوَائِكَ وَ عَافِهِ مِنْ بَلَائِكَ " (پروردگار! اسے اپنی بارگاہ سے شفا عطا فرما، خود ہی اس کا علاج فرما اور اپنی آزمائش میں اسے صحت و عافیت عطا فرما) (مستدرک الوسائل؛ ج ۲، ص ۱۵۱)

اور اپنا ہاتھ مریض کے بازو پر رکھ کر سات مرتبہ سورہ الحمد کی تلاوت کرے۔

۳- یہ کہ مریض سے ملنے والا ملاقات کے وقت اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ کر بیٹھے۔

۴- مریض کے پاس بیٹھ کر مت کھائے اگرچہ اسے سخت بھوک ہی کیوں نہ لگی ہو۔

۵- اس کے پاس کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے اسے غصہ آئے یا دُکھ پہنچے۔

۶- اس کیلئے ایسا تحفہ لے کر جائے جو اس کی بعض ضروریات میں استعمال ہو۔

۷- مریض سے التماسِ دعا کرے کیونکہ مریض کی دعا مستجاب ہوتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے:" ثَلَاثَةٌ دَعْوَتُهُمْ مُسْتَجَابَةٌ اَلْحَاجُّ وَ الْغَازِي وَ المریض "" تین اشخاص کی دعا قبول ہوتی ہے: حاجی، مجاہد اور مریض۔"

(بحار الانوار: ج ۹۰، ص ۳۵۷)

خود مریض مرض کی حالت میں کیا طرزِ عمل اختیار کرے؟

۱- حالتِ مرض میں صبر سے کام لے کیونکہ ایسا کرنے سے بہت اجر و ثواب ملتا ہے۔ مرض ایک ایسی آزمائش ہے جو انسان پر نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انسان کے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور اور کثیر اجر و ثواب عطا فرماتا ہے۔

۲- اللہ عزوجل کا شکر ادا کرے کہ اس نے دوسرے لوگوں کی نسبت اسے کم تکلیف میں مبتلا کیا ہے۔اور اس بات پر بھی اللہ عزوجل کا شکر ادا کرے کہ اس نے اسے ایک عرصہ تک صحت وسلامتی میں بھی تو رکھا ہے۔

۳- اپنے مرض پر شکوہ نہ کرے یعنی اس طرح نہ کہے کہ مجھے ہی یہ بیماری کیوں ہے؟ یا اس طرح نہ کہے کہ مجھے ایسی بیماری یا تکلیف ہے کہ میری طرح کوئی دوسرا ایسی تکلیف و بیماری میں مبتلا نہیں ہے۔۔۔

۴- ہر ایسے عمل سے اجتناب کرے جو اس کے لئے مضر ہو۔مریض اور اس کے رشتہ دار اس کی شفایابی کے لئے اور بیماری دُور کرنے کے لئے صدقہ دیں۔

۵- اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے باقی اعضائے بدن کو صحت وعافیت میں رکھا ہوا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ وعلیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

''دَاوُوا مَرْضَاكُمْ بالصدقة''

''صدقہ کے ذریعے اپنے مریضوں کا علاج کرو۔''(کافی: ج ۴ ص ۳)

فقر وناداری بہتر ہے

ایک مالدار آدمی صاف ستھرا لباس زیب تن کئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور وہاں بیٹھ گیا۔تھوڑی دیر بعد میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک دوسرا شخص وہاں آیا اور اس امیر آدمی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔اس امیر آدمی نے اپنی چادر کو سمیٹ لیا۔رسول اللہؐ نے اس کا یہ عمل دیکھ کر پوچھا کیا تمہیں یہ خوف ہے کہ اس کا فقر تمہیں نہ لگ جائے؟

اس نے جواب دیا،نہیں یارسول اللہ۔

آپؐ نے پوچھا تمہیں یہ ڈر ہے کہ کہیں تمہاری دولت میں سے کچھ مال اس کے ہاتھ نہ لگ جائے؟

اس نے جواب دیا،نہیں یارسول اللہ۔

آپؐ نے پوچھا، پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟

تو اس آدمی نے جواب دیا،اے اللہ کے رسولؐ! میرا ایک دوست (دل) ہے جو میرے سامنے ہر اچھائی کو بدصورت اور ہر برائی کو خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے۔اسی کی وجہ سے مجھ سے یہ غلطی سرزد ہوئی۔البتہ اب مَیں اپنی اس گستاخی کے ازالہ کے طور پر اپنا نصف مال اس فقیر کو دیتا ہوں۔آپؐ نے غریب آدمی سے پوچھا،کیا تم اس مال کو قبول کرتے ہو؟

اس نے جواب دیا،نہیں یارسول اللہ۔

امیر آدمی نے اس سے پوچھا ،کیوں؟

اس نے جواب دیا، مجھے خدشہ ہے کہ یہ مال مجھے بھی ویسا ہی بنا دے گا جس طرح اس نے تجھے مغرور بنا دیا ہے۔

حرام نگاہ

- حرام نگاہ کیا ہے؟
- حرام نگاہ کا ایمان پر کیا اثر پڑتا ہے؟
- آنکھیں نیچی رکھنے کا اثر؟

حرام نگاہ:

مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس پر ایمان کا سرچشمہ ہے اور یہ لطف الہی ہے اور انسانی کرامت کیلئے مقدس ترین اور اعلیٰ ترین چیز ہے ۔اسی وجہ سے شیطان اور اس کا لشکر بنی آدم اور خاص طور پر مومنین کے ساتھ اپنی جنگ میں قلب کو اپنے تیروں کا ہدف قرار دیتے ہیں ۔قلب تک رسائی کیلئے کچھ گزرگاہیں ہیں کہ جن کے ذریعے ابلیس اور اس کا لشکر اس کی طرف تیر چلاتے ہیں ۔ان گزرگاہوں میں سے ایک اہم ترین گزرگاہ آنکھ ہے ۔

امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"اَلْعُيُونُ مَصَائِدُ الشَّيْطَانِ"

آنکھیں شیطان کی شکارگاہ ہیں ۔(مستدرک الوسائل: ج ۱۴ص ۲۷۱)

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے آپ علیہ السلام فرماتے ہیں:

"إِذَا أَبْصَرَتِ الْعَيْنُ الشَّهْوَةَ عَمِيَ الْقَلْبُ عَنِ العاقبة"

جب آنکھ شہوت انگیز منظر کو دیکھتی ہے تو دل، عاقبت سے غافل ہو جاتا ہے ۔(غرر الحکم: ص ۳۰۵)

ایک اور روایت میں ہے کہ:

"اَلنَّظَرُ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ ابليس"

نظرِ حرام شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر ہے ۔(کافی: ج ۵ ص ۵۵۹)

نظر کی اہمیت کی وجہ سے ہی اللہ تعالیٰ نے ہمیں آنکھیں نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے:

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوْجَهُمْ

آپ مومن مردوں سے کہہ دیجئے وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کو بچا کر رکھیں۔(سورہ نور:۳۰)

حرام نگاہ کا انجام کیا ہے؟

اس سوال کے جواب کیلئے آئیے ہم حرام نگاہ کی مختلف اقسام کا مطالعہ کریں اور ان کے آثار سے آگاہی حاصل کریں۔

لوگوں کے ذاتی امور میں ان کی اجازت کے بغیر نگاہ کرنا حرام ہے۔اہم چیزیں تو دور کی بات کسی کے خط کو بھی اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا حرام ہے۔رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”مَنْ نَظَرَفِی کِتَابِ أَخِیهِ بِغَیْرِإِذْنِهِ فَکَأَنَّمَا یَنْظُرُفِی النارِ“

جو شخص اپنے بھائی کے خط پر اس کی اجازت کے بغیر نگاہ ڈالے تو گویا وہ آگ میں دیکھ رہا ہے۔

(مستدرک الوسائل۔ج ۹ ص ۱۵۹)

حرام نگاہوں میں سے سب سے سنگین لوگوں کی شرمگاہوں کی طرف نگاہ کرنا ہے۔چاہے مرد مرد کی طرف دیکھے یا عورت عورت کی طرف یا مرد وعورت کا ایک دوسرے کی شرمگاہ کی طرف نگاہ کریں۔مرد کے مرد کی طرف نگاہ کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

” مَنْ نَظَرَإِلَی عَوْرَةِ أَخِیهِ الْمُسْلِمِ أَوْ عَوْرَةِ غَیْرِ أَهْلِهِ مُتَعَمِّداً أَدْخَلَهُ اللهُ تَعَالَى مَعَ الْمُنَافِقِینَ الَّذِینَ کَانُوایَبْحَثُونَ عَنْ عَوْرَاتِ النَّاسِ وَلَمْ یَخْرُجْ مِنَ الدُّنْیَاحَتَّی یَفْضَحَهُ اللهُ إِلَّا أَنْ یَتُوبَ“

جو شخص کسی مسلمان بھائی کی شرمگاہ کی طرف نگاہ کرے گا خداوند اسے منافقین میں داخل کر دے گا جو کہ لوگوں کی پوشیدہ چیزوں کی تلاش میں رہتے تھے اور اسے دنیا سے رسوا کیے بغیر آخرت کی طرف نہیں بھیجے گا مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے۔(من لا یحضرہ الفقیہ۔ج ۴ ص ۱۳)

آپ علیہ السلام ہی سے مروی ہے:

”لَایَنْظُرِالرَّجُلُ إِلَی عَوْرَةِ اخِیهِ“

کوئی شخص اپنے (مسلمان) بھائی کی شرمگاہ کی طرف نہ دیکھے۔(التہذیب۔ج ۱ ص ۳۸۴)

نظر کا یہ حکم براہ راست دیکھنے، آئینے کے ذریعے دیکھنے، تصویر یا ٹیلی ویژن میں دیکھنے کے لحاظ سے یکساں ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

” مَنْ مَلَأَ عَیْنَیْهِ مِنِ امْرَأَةٍ حَرَاماً حَشَاهُمَا اللهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِمَسَامِیرَ مِنْ نَارٍ وَحَشَاهُمَا نَاراً حَتَّی یَقْضِیَ بَیْنَ النَّاسِ ثُمَّ یُؤْمَرُبِهِ إِلَی النَّارِ“

جوشخص بھی نامحرم عورت کو (لذت کے ارادے سے) دیکھے گا تو بروز قیامت اس مرد کی آنکھوں کو دوزخ کی آگ سے سرخ کی گئی سلاخوں سے داغا جائے گا یہاں تک کہ اسی حالت میں اس کو لوگوں کے درمیان لایا جائے گا۔ پھر حکم خدا سے اس مرد کو آتش دوزخ میں پھینک دیا جائیگا۔(وسائل الشیعہ۔ج۲۰،ص ۱۹۴)

حرام نگاہوں میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنے والدین کی طرف نفرت، دشمنی یا بغض کی نگاہ سے دیکھے، وہی والدین کہ جن کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ان کے بیٹے کے پاؤں میں چبھنے والا کانٹا، خود ان کی اپنی آنکھوں میں چبھتا لیکن ان کا بیٹا اس سے محفوظ رہتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ نَظَرَ إِلَى أَبَوَيْهِ نَظَرَ مَاقِتٍ وَهُمَا ظَالِمَانِ لَهُ لَمْ يَقْبَلِ اللهُ لَهُ صَلَاةً"

جوشخص اپنے والدین کی طرف بغض والی نگاہ سے دیکھے (اگرچہ) وہ اس پر ظلم کرتے ہوں تو خداوند اس کی نماز قبول نہیں کرتا۔(کافی۔ج۲،ص۳۴۹)

مومن شخص کو خوفزدہ اور دہشت زدہ کرنے کیلئے اس کی طرف دیکھنا حرام نگاہ کے مصادیق میں سے ایک ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ نَظَرَ إِلَى مُؤْمِنٍ نَظْرَةً لِيُخِيفَهُ بِهَا أَخَافَهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّه"

جوشخص مومن کو خوفزدہ کرنے کیلئے اس کی طرف دیکھے گا خداوند اسے اس روز خوفزدہ کرے گا جس دن اس (پروردگار) کی ذات کے سائے کے علاوہ کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔(کافی۔ج۲،ص۳۶۸)

حرام نگاہ کا ایمان پر کیا اثر ہوتا ہے؟

ایسی نگاہ کہ جس کو شریعت میں حرام کیا گیا ہے اسکے حرام کئے جانے کا سبب اور علت وہ بہت زیادہ نقصان کا خطرہ ہے جو اس نگاہ کی وجہ سے انسان کے اہم ترین اور افضل ترین سرمائے یعنی ایمان کو پہنچا تا ہے اور اسے اس کی متضاد صفت، منافقت میں تبدیل کر دیتا ہے، انسان کیلئے جہنم کا باعث بنتا ہے، اس سے ایمان کی شیرینی چھین لیتا ہے اور اسے فسق اور غفلت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"إِيَّاكُمْ وَالنَّظَرَ إِلَى الْمَحْذُورَاتِ فَإِنَّهُ بَذْرُ الشَّهَوَاتِ وَنَبَاتُ الْفِسْقِ"

اپنے آپ کو حرام نگاہ سے بچاؤ چونکہ وہ شہوت کا بیج اور فسق کا پودا ہے۔(مستدرک الوسائل۔ج۱۴،ص۲۶۹)

اور جو انسان فاسق ہو جائے اور اس کا دل مر جائے تو وہ خود بھی ایک مردار کی مانند ہو جاتا ہے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

" مَنْ أَطْلَقَ طَرْفَهُ جَلَبَ حَتْفَه"

جو شخص اپنی آنکھ کو آزاد چھوڑ دیتا ہے وہ اپنی بربادی کا سامان فراہم کرتا ہے۔

(مستدرک الوسائل۔ج ۱۴،ص ۲۷۱)

آنکھیں نیچی رکھنے کا اثر:

اگر آنکھیں نیچی رکھنے میں حرام شہوت اور شر سے بچنے کے علاوہ کوئی اور فائدہ نہ ہوتا تو تب بھی کافی تھا چونکہ اس میں دل کی آسودگی ہے۔حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

" مَنْ غَضَّ طَرْفَهُ أَرَاحَ قَلْبَهُ"

جس نے اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اس نے اپنے قلب کو آسودہ کر دیا۔(غرر الحکم۔ص ۲۶۰)

آپ علیہ السلام ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

" نِعْمَ صَارِفُ الشَّهَوَاتِ غَضُّ الأبصار"

شہوتوں کو دفع کرنے کیلئے آنکھیں نیچی رکھنا ہی بہترین طریقہ ہے۔(غرر الحکم۔ص ۲۶۰)

اگر آپ چاہتے ہیں کہ بعد میں ندامت نہ اُٹھانا پڑے تو اپنی آنکھیں نیچی رکھیں۔آپ علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

" مَنْ غَضَّ طَرْفَهُ قَلَّ أَسَفُهُ وَ أَمِنَ تَلَفَه"

جو شخص اپنی آنکھیں نیچی رکھے گا اس کا غم و غصہ کم ہو جائے گا اور وہ بربادی سے بچ جائے گا۔

(غرر الحکم۔ص ۲۶۰)

آنکھیں نیچی رکھنے کا اثر ہلاکتوں سے بچنے تک ہی محدود نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی طرف سے عظیم اجر و ثواب اور بخشش کا باعث بھی ہے۔

صادق آل محمد علیہ السلام فرماتے ہیں:

" مَنْ نَظَرَ إِلَى امْرَأَةٍ فَرَفَعَ بَصَرَهُ إِلَى السَّمَاءِ أَوْ غَمَّضَ بَصَرَهُ لَمْ يَرْتَدَّ إِلَيْهِ بَصَرُهُ حَتَّى يُزَوِّجَهُ اللهُ مِنَ الْحُورِ العين "

جس شخص کی کسی (غیر محرم) عورت پر نگاہ پڑے اور وہ اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف بلند کرے یا آنکھیں موندلے اور دوبارہ اس کی طرف نگاہ نہ کرے تو خداوند حور العین کے ساتھ اس کی شادی کر دیتا ہے۔

(من لا یحضرہ الفقیہ۔ج ۳،ص ۴۷۳)

آنکھیں نیچی رکھنے والا شخص ایمان کی حلاوت اور شیرینی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

" النَّظَرُ سَهْمٌ مَسْمُومٌ مِنْ سِهَامِ إِبْلِيسَ فَمَنْ تَرَكَهَا خَوْفاً مِنَ اللهِ أَعْطَاهُ اللهُ إِيمَاناً يَجِدُ حَلَاوَتَهُ فِي قَلْبِهِ "

(نامحرم کی طرف) نگاہ ابلیس کے زہر آلود تیروں میں سے ایک تیر ہے جو شخص اس کے خوف کی وجہ سے اسے ترک کرے گا خداوند عالم اسے ایسے ایمان سے نوازے گا کہ جس کی شیرینی وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا۔ (الوسائل۔ ج ۱۴، ص ۲۶۸)

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

" غُضُّوا أَبْصَارَكُمْ تَرَوْنَ الْعَجَائِبَ "

اپنی آنکھیں نیچی رکھو تو پوشیدہ حقائق دیکھنے لگو گے۔ (مستدرک الوسائل۔ ج ۱۴، ص ۴۶۹)

خاتمہ

اب جبکہ نگاہ کی اس قدر اہمیت ہے تو کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم اسے دائیں بائیں بھٹکنے، شہوت کے پیچھے جانے، شر پسندی اور تعصب سے محفوظ رکھیں اور ان چیزوں میں مشغول رکھیں جن میں ہمیں حکمت، عبرت اور اجر حاصل ہو اور ہمیں اپنی نگاہ کا رخ حرام کاموں سے ہٹا کر عبادت کی طرف موڑنا چاہیے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نگاہ کے عبادتی پہلو کی پہچان کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

" النَّظَرُ إِلَى الْعَالِمِ عِبَادَةٌ وَ النَّظَرُ إِلَى الْإِمَامِ الْمُقْسِطِ عِبَادَةٌ وَ النَّظَرُ إِلَى الْوَالِدَيْنِ بِرَأْفَةٍ وَ رَحْمَةٍ عِبَادَةٌ وَ النَّظَرُ إِلَى الْأَخِ تَوَدُّهُ فِي اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ عِبَادَةٌ "

عالم کی طرف دیکھنا عبادت ہے، امام عادل کی طرف نظر کرنا عبادت ہے، والدین کی طرف رحمت و مہربانی سے نگاہ کرنا عبادت ہے اور اس بھائی کی طرف نگاہ کرنا عبادت ہے جس سے تمہیں خدا کی خاطر محبت ہو۔ (بحار الانوار۔ ج ۸، ۳ ص ۱۹۶)

اسی طرح سے قرآن مجید کی طرف نگاہ کرنا عبادت ہے۔

آئیے ہم اپنی آنکھوں کو ان چیزوں تک محدود رکھیں جن کا دیکھنا ہمارے لیے جائز ہے تا کہ ہم نجات اور فلاح پا سکیں۔

خلاصہ

- انسان کی سعادت کا سرمایہ ایمان ہے۔
- حرام نگاہ کرنے سے اللہ تعالیٰ پر ایمان کمزور ہونے لگتا ہے اور آخر کار ختم ہو جاتا ہے۔
- براہ راست نامحرم کو دیکھنا اسی طرح ٹیلی ویژن اور تصاویر میں نامحرم کو دیکھنا حرام ہے۔
- حرام کی طرف نظر کرنے سے دنیا و آخرت میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔

سوالات

درست/غلط کی نشاندہی کریں۔

۱. شیطان، انسان کا ایمان سلب کرنا چاہتا ہے۔ ()
۲. نامحرم کی بلیک اینڈ وائٹ تصاویر دیکھنا حرام نہیں ہے۔ ()
۳. جو حرام کی طرف نظر کرے گا تو روز قیامت اس کی آنکھیں نکال دی جائیں گی۔ ()
۴. آنکھ کو حرام سے بچانے کے نتیجے میں جنت کی حورعین سے شادی ہوتی ہے۔ ()
۵. آنکھ کو حرام سے بچانے کی لذت، حرام نگاہ کی لذت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ( )

مطالعہ کیلئے

پڑوسیوں کے آداب

امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ، سلمانؓ اور ابوذرؓ کو حکم دیا کہ وہ اپنی پوری آواز کے ساتھ یہ اعلان کریں کہ جس کے شر سے اس کا پڑوسی امن میں نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے تین بار بلند آواز سے صدا دی۔ اور پھر گھر کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے کے چالیس گھروں کی طرف اشارہ کیا کہ یہ سب ہمسائے شمار ہوتے ہیں۔

(مشکاۃ الانوار۔ الطبرسی)

ہمسائے کے چند آداب:

۱۔ پڑوسیوں کیساتھ اچھا برتاؤ، تعاون اور نیک سلوک کرنا۔

امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ:

"عَلَيْكُمْ بِحُسْنِ الْجِوَارِ فَإِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ أَمَرَ بِذالك"

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا تمہارا فرض ہے کیونکہ اللہ عزوجل نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔

(بحار الانوار:، ج ۷۱، ص ۱۵۰)

امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ:

"حُسْنُ الْجِوَارِ يَزِيدُ فِي الرِّزْقِ"

پڑوسی کے ساتھ نیک برتاؤ سے رزق میں اضافہ ہوتا ہے۔ (بحار الانوار۔ ج ۷۱، ص ۱۵۳)

۲۔ پڑوسی کی طرف سے اذیت برداشت کرنا اس سے بدلہ نہ لینا اور اس کو نصیحت اور رہنمائی کرنا۔

نبی اکرمؐ سے حدیث میں ہے کہ:

"مَنْ آذَى جَارَهُ حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ رِيحَ الْجَنَّةِ وَ مَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِيرُ وَ مَنْ ضَيَّعَ حَقَّ جَارِهِ

فَلَيْسَ مِنَّا وَ مَازَالَ جَبْرَئِيلُ يُوصِينِي بِالْجَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ"

جو اپنے پڑوسی کو تکلیف پہنچائے گا اللہ تعالیٰ اس پر جنت کی خوشبو حرام کر دے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہو گا اور وہ بڑا برا ٹھکانا ہے۔ جس نے اپنے پڑوسی کا حق ضائع کیا اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ اور جبرائیلؑ مجھے پڑوسی کے بارے میں ہمیشہ اس قدر تاکید کرتے رہے کہ مجھے گمان ہونے لگا کہیں اسے میرا وارث نہ بنا دیا جائے۔ (کافی: ج۲ص ۵۶)

۳۔ پڑوسی کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کوشش کرنا خصوصاً جب وہ مفلس و نادار لوگوں میں شمار ہو۔

۴- بہتر یہ ہے کہ انسان اپنے گھر میں منتقل ہونے سے پہلے پڑوسیوں کے بارے میں چھان بین کر لے اور ان کے اخلاق و کردار اور اچھے میل جول کے بارے میں پوچھ لے۔

۵- امام علیؑ سے روایت ہے کہ نبی پاکؐ سے پوچھا گیا:

قِيلَ يَا نَبِيَّ اللهِ اَفِي الْمَالِ حَقٌّ سِوَى الزَّكَاةِ قَالَ نَعَمْ بِرُّ الرَّحِمِ إِذَا أَدْبَرَتْ وَ صِلَةُ الْجَارِ الْمُسْلِمِ فَمَا (آمَنَ بِي) مَنْ بَاتَ شَبْعَاناً وَ جَارُهُ الْمُسْلِمُ جَائِعٌ ثُمَّ قَالَ مَا زَالَ جَبْرَئِيلُ يُوصِينِي بِالْجَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ"

نبی اکرمؐ سے سوال کیا گیا: اے اللہ کے نبیؐ! کیا مال میں زکوۃ کے سوا کوئی دوسرا حق بھی ہے؟ آپؐ نے فرمایا رشتہ دار جب قطع تعلقی کریں تو ان کے ساتھ صلۂ رحمی کرو اور مسلمان پڑوسی سے بھی صلہ رکھو۔ اور جو شخص خود پیٹ بھر کر رات بسر کرے جبکہ اس کا مسلمان پڑوسی صبح تک بھوکا ہو تو وہ ہم میں سے نہیں۔

(بحارالانوار: ج ۷۱، ص ۱۵۱)

کتاب روضۃ الواعظین میں رسول اللہؐ نے فرمایا: کیا تمہیں پڑوسی کے حقوق کے بارے میں علم ہے؟ تمہیں پڑوسی کے تھوڑے بہت حقوق کے علاوہ کچھ علم نہیں۔ جس کے شر سے اس کا پڑوسی محفوظ نہیں ہے وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ روزِ آخرت پر اور جب پڑوسی قرض مانگے تو اسے قرض دو۔ جب وہ خوش ہو تو مبارکباد دو۔ جب اسے کوئی تکلیف ہو تو اسے تسلی دو۔ اس کے گھر سے زیادہ اونچی عمارت نہ بناؤ کہ اسکے گھر میں ہوا کی رفت و آمد میں رکاوٹ پڑے، ہاں مگر اس سے اجازت لے کر۔ جب اسے پھل کی چاہت ہو تو اسے پھل ہدیہ کرو۔ اگر ظاہری طور پر کچھ نہ دے سکو تو چھپا کر دے دو اور اپنے بچوں کو ایسی شئے نہ دو جو پڑوسی کے بچوں کیلئے حسرت کا باعث ہو۔

پھر رسول اللہؐ نے فرمایا: پڑوسی تین قسم کے ہیں: پہلی قسم وہ ہے جن کے تین حقوق ہیں حق اسلام، حق پڑوس اور حق رشتہ داری۔ دوسری قسم کے پڑوسی ایسے ہیں جن کے دو حقوق ہیں: حق اسلام اور حق پڑوس۔ اور تیسری قسم کے پڑوسی ایسے ہیں جن کا صرف ایک حق ہے وہ کافر پڑوسی ہے جسکا صرف پڑوس کا حق ہے۔

حرام آوازوں کا سننا

- کان کی ذمہ داری کیا ہے؟
- شیطان کے ہاتھوں شکار ہونے سے بچو۔

مقدمہ

کان آنکھوں کی طرح قلب تک رسائی کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہیں جس کے ذریعہ معارف، حکمتیں، وعظ و نصیحت قلب تک پہنچتی ہیں اور اسی طرح سے بری باتیں بھی جیسے فسق وکفر، گمراہیاں اور دوسری ایسی باتیں جن پر ایک عبادت گزار کو کان نہیں دھرنے چاہئیں، وہ بھی قلب تک پہنچتی ہیں۔

کانوں کی ایک اہم مشکل یہ ہے کہ آنکھوں کے برعکس یہ ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور آوازیں غیر ارادی طور پر ان تک پہنچتی رہتی ہیں اس کے باوجود جس طرح اللہ تعالیٰ نے قلب اور آنکھوں پر ذمہ داری ڈال رکھی ہے، کانوں کو بھی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار نہیں دیا اور فرمایا:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا

اور اس کے پیچھے مت جانا جس کا تجھے علم نہیں ہے کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان سب سے باز پرس ہو گی۔ (سورہ اسراء۔ آیت ۳۶)

کان کی ذمہ داری:

وہ تمام چیزیں کہ جنہیں سننا حرام ہے اور انسان کو چاہیئے کہ خود کو ان سے بچائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا ہے انسان کو چاہیے کہ اپنے کانوں کو بری اور حرام باتوں کے سننے سے بچائے چونکہ جو کردار اللہ تعالیٰ نے کانوں کو سونپا ہے وہ اس سے اعلیٰ اور ارفع ہے کہ انہیں حقیر و ادنیٰ امور میں مصروف رکھے کہ جن کی بدولت وہ ایسی پست آوازوں کا عادی ہونے لگے جو

پہلے پہل ان کے ناجائز ہونے کی حساسیت کو کھو دیں اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے یہ آوازیں اچھی لگنے لگیں اور وہ خود بھی انہی آوازوں کے رنگ میں رنگ جائے۔ کان، اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت اور علم و معرفت کے حصول کا ذریعہ ہیں یہ ذہن اور قلب کو مفاسد، گناہ اور حرام آوازوں سے آلودہ کرنے کیلئے نہیں ہیں۔ جن آوازوں کا سننا حرام ہے ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

ا۔ غناء:

غناء انسان کے دین اور اخلاق کیلئے انتہائی مضر اور عظیم آفت ہے۔ غناء کے اثرات چونکہ ہم میں سے اکثر کیلئے واضح نہیں ہیں اور اسکا سننا کانوں کو بڑا پرکشش اور بھلا لگتا ہے، جبکہ درحقیقت غناء انسان کو لھو و لعب میں مبتلا کرنے اور اسکی عمر کے ضیاع کا سبب ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس کے ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں جو حرام چیزوں جیسے زنا، فسق اور کفر وغیرہ کا موجب بنتے ہیں۔ غناء ان لہو اور باطل باتوں میں سے ہے جن کے بارے میں خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ

باطل باتوں سے بچو (سورہ حج۔ ۳۰)

امام باقر علیہ السلام سے انکے ایک صحابی نے آیت "وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ" کے بارے میں پوچھا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: "قول الزور الغناء"؛ قول زور (باطل بات) سے مراد غناء ہے۔ اگر غناء حرام نہ ہوتا تو خداوند گانے اور اس کے سننے والے کو جہنم کے عذاب کا وعدہ نہ دیتا۔ امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

اَلْغِنَاءُ مِمَّا وَعَدَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَيْهِ النَّارَ وَتَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ
وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (سورہ لقمان۔ ۶)

غناء ان چیزوں میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے عذاب جہنم کا وعدہ دیا ہے اور اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ: اور انسانوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو بیہودہ کلام خریدتے ہیں تاکہ نادانی میں (لوگوں کو) راہ خدا سے گمراہ کریں اور اس کا مذاق اڑائیں، ایسے لوگوں کے لیے ذلت میں ڈالنے والا عذاب ہوگا۔

(کافی: ج ۶، ص ۴۳۱)

۲۔ حرام موسیقی:

غناء کی طرح حرام موسیقی سننا بھی حرام ہے۔ موسیقی بجانے اور سننے والے کو بھی گانے والے اور اس کے سننے والے کی طرح آخرت میں عذاب جہنم کا وعدہ دیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ بِنِعْمَةٍ فَجَاءَ عِنْدَ تِلْكَ النِّعْمَةِ بِمِزْمَارٍ فَقَدْ كَفَرَهَا"

خداوندا گرکسی کو کوئی نعمت عطا فرمائے اور وہ اس نعمت کے ملنے پر ساز وآواز بجائے تو وہ کفران نعمت کا مرتکب ہوا۔ (وسائل الشیعہ۔ج ۱۷ص ۱۲۷)

خدا نے غناء اور موسیقی کو کیوں حرام قرار دیا ہے؟

اگر ہم اہلبیت علیہم السلام سے منقول احادیث کا مطالعہ کریں تو یہ معلوم ہوگا کہ ان میں سے بہت سی احادیث میں غناء اور موسیقی کے منفی اثرات بیان ہوئے ہیں جن میں سے بعض درج ذیل ہیں:

۱۔گھٹیا ترین مخلوق: حضرت اباعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا:

"اخبث مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْغِنَاءُ يُورِثُ النِّفَاقَ الْغِنَاءُ يُورِثُ الفقر"

خداوند کی گھٹیا ترین مخلوق غناء ہے،غناء نفاق اور فقر کا باعث ہے۔

(مستدرک الوسائل۔ج ۱۳ص ۲۱۲)

۲۔نفاق کا سبب: حضرت اباعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا:

"ضَرْبُ الْعِيدَانِ يُنْبِتُ النِّفَاقَ فِي الْقَلْبِ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ الْخُضْرَةَ"

سارنگی بجانا دل میں اس طرح نفاق اگاتا ہے جس طرح پانی سبزہ اگاتا ہے۔(وسائل الشیعہ۔ج ۱۷ص ۳۱۳)

آپ علیہ السلام ہی کا ارشاد ہے:

"الْغِنَاءُ عُشُّ النِّفَاقِ"

غناء منافقت کا گھونسلا ہے۔(کافی: ج ۶ص ۴۳۱)

۳۔فحاشی کی طرف مائل کرنا: پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا!

"الْغِنَاءُ رُقْيَةُ الزِّنَى"

غناء زنا کو اچھا بنا کر پیش کرتا ہے۔(مستدرک الوسائل۔ج ۱۳ص ۲۱۴)

۴۔قساوت قلبی: حضرت محمد صلی اللہ لیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"يَا عَلِيُّ ثَلَاثَةٌ يُقْسِينَ الْقَلْبَ اسْتِمَاعُ اللَّهْوِ۔۔۔"

"تین چیزیں دل کو سخت بناتی ہیں لہو (غنا) کا سننا۔۔۔"(من لایحضرہ الفقیہ: ج ۴ص ۳۶۵)

موسیقی کے سننے پر دو قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں،ایک دنیا میں اور دوسرے آخرت میں؛

اس گناہ کبیرہ کی دنیاوی تاثیر کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری اُمت میں زمین کے دھنسنے اور پتھروں کی بارش جیسے واقعات ظاہر ہونگے؛ پوچھا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا کب ہوگا؟ فرمایا: جب موسیقی کے آلات، گانے والی عورتیں اور شراب خوری عام نظر آنے لگے گی۔ (وسائل الشیعہ۔ ج ۱۷، ص ۳۱۱)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

''بَيْتُ الْغِنَاءِ لَا تُؤْمَنُ فِيهِ الْفَجِيعَةُ وَ لَا تُجَابُ فِيهِ الدَّعْوَةُ وَ لَا يَدْخُلُهُ الْمَلَكُ''

جس گھر میں غناء ہو وہ مصیبتوں سے امان میں نہیں، اس میں دعا قبول نہیں ہوتی اور فرشتے اس میں داخل نہیں ہوتے۔ (وسائل الشیعہ۔ ج ۱۷، ص ۳۰۳)

اسی طرح سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''خَمْسَةٌ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ إِلَى أَنْ قَالَ وَ الْمُغَنِّي''

پانچ قسم کے لوگوں کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اپنی نظر رحمت نہیں کرے گا۔ فرمایا ان میں سے ایک گانے والا ہے۔ (مستدرک الوسائل: ج ۱۳، ص ۲۱۳)

اور جو شخص اپنے کانوں کو حرام آوازوں سے بچائے گا اس کے بارے میں روایت میں بیان ہوا ہے:

''إِنَّ اللّٰهَ يَقُولُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَلَائِكَتِي مَنْ حَفِظَ سَمْعَهُ وَ لِسَانَهُ عَنِ الْغِنَاءِ فَأَسْمِعُوهُ حَمْدِي وَ الثَّنَاءَ عَلَيَّ''

اللہ تعالیٰ روز قیامت فرمائے گا، اے میرے فرشتو! جس شخص نے اپنے کانوں اور زبان کو غناء سے بچائے رکھا اس سے میری حمد و ثناء سنو۔ (مستدرک الوسائل: ج ۱۳، ص ۲۱۴)

دیگر محرمات:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے مومن پر غیبت کرنے اور سننے کو حرام کیا ہے، چونکہ غیبت سننے والا، غیبت کرنے والے کے جرم میں شریک ہوتا ہے اور اس کیلئے جائز نہیں کہ اپنے مومن بھائی کی غیبت سنے اور لوگوں کو اپنے بھائی کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھے اور غیبت سے منع کر کے اسکی مدد نہ کرے۔ اسے اختیار حاصل ہے کہ غیبت سن کر خاموش رہے اور غیبت کرنے والوں کے جرم میں شریک ہو کر ان درندوں کے ساتھ درندہ بن کر اپنے مومن بھائی کا گوشت کھائے یا غیبت کی مخالفت کر کے اپنے بھائی کی مدد کرے تاکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اسکی مدد فرمائے۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''سَامِعُ الْغِيبَةِ أَحَدُ المغتابين''

غیبت سننے والا، غیبت کرنے والوں میں سے ایک ہے۔ (غرر الحکم: ص ۲۲۱)

۲۔گمراہ کن باتوں کا سننا کہ جس کی وجہ سے انسان کو اپنے دین اور اسکی تعلیمات کے بارے میں شک میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہو حرام ہے، چاہئے ریڈیو و ٹیلی ویژن سے سنی جائیں یا براہ راست کسی مجلس یا محفل میں۔

۳۔اسی طرح لوگوں کی ٹوہ لگانا اور چھپ کر ان کی رضایت کے بغیر باتیں سننا بھی حرام ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا

اور تجسس بھی نہ کیا کرو اور تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے۔(سورہ حجرات/ ۱۲)

شیطان کا آلۂ کار نہ بنیں:

عزیز بھائیو! آپ کو دنیا اور آخرت میں اپنے لیئے محفل و مقام کے انتخاب کا حق دیا گیا ہے۔آپ چاہیں تو مردار کھانے والوں کے ساتھ بیٹھیں اور ایسی محافل میں شرکت کریں جن میں دعا قبول نہیں ہوتی اور فرشتے بھی جہاں سے چلے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی ان پر نگاہ کرم نہیں کرتا، یا چاہیں تو اپنے کانوں کو ان پست امور میں استعمال کرنے سے بچائیں اور ان سے پرہیز کریں اور اپنے کانوں کو تحصیل علم، ہدایت کا سبب بننے والی آوازوں اور ذکر خدا سننے کیلئے کام میں لائیں تاکہ فرشتے آپ کیلئے استغفار کریں اور خداوند آپ کی طرف رحمت و نوازش کی نگاہ سے دیکھے، یہ اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے۔اپنے آپ کو نجات دیں اور شیطان کی چالوں سے بچائیں تاکہ اس کا آلۂ کار نہ بنیں۔

خلاصہ

- کان نعمت بھی ہیں اور ذمہ داری بھی۔
- اپنے کانوں کو غیبت اور غناء جیسی پست چیزوں سے پاک رکھیں۔
- غناء نفاق کو پروان چڑھاتا ہے، عقل ضعیف کرتا ہے اور گمراہیوں کی طرف دھکیلتا ہے۔

سوالات

صحیح یا غلط کی نشاندہی کریں:

۱ ہر حرام آواز سننے پر اللہ تعالیٰ انسان کو سزا دے گا۔()

۲ منافقت غناء کے اثرات میں سے ہے۔()

۳ غیبت کرنا حرام ہے لیکن غیبت سننا جائز ہے۔()

مطالعہ کیلئے

امام خمینیؒ کی ایک وصیت

”ایسے نوجوان کے نام جس سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی توفیق اور ولایت کی رہنمائی میں حق کے راستے پر چلے گا اور نجات حاصل کرے گا......

پیارے بیٹے!

جب تک آپ جوانی کی نعمت سے سرفراز ہیں اپنی اصلاح کرتے رہیں۔ کیونکہ عالم شباب میں شیطان جوکہ انسان کا بدترین دشمن ہے اس کوشش میں ہوتا ہے کہ وہ انسان کو اصلاحِ نفس سے روک دے اور اسے وقت کے وسیع ہونے کی اُمید دلائے۔ یوں وہ نوجوانوں کی نادانی سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور جھوٹے وعدوں پر اسے ٹرخاتا رہتا ہے تا کہ اسے اصلاحِ نفس سے مکمل طور پر روک دے۔ شب وروز گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو اصلاحِ نفس کرنے سے بالکل غافل کردیتا ہے، یہاں تک کہ اچانک وہ اپنا بڑھاپا اپنے سامنے پاتا ہے، جس میں اس نے اصلاحِ نفس کی اُمید باندھ رکھی تھی۔ لیکن اب بھی وہ شیطان کے وسوسوں سے امان میں نہیں ہوتا، کیونکہ اب وہ اسے اپنی عمر کے آخری حصہ میں توبہ کرنے کی آرزو دلاتا ہے، لیکن جب زندگی کے آخری لمحات آپہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا وجود ایسے شخص کیلئے قابل نفرت وجود میں تبدیل ہو جاتا ہے جو اسے دنیا سے جدا کرنا چاہتا ہے، جو اس کے لیئے محبوب ترین شے بن چکی ہوتی ہے۔ یہ حالت تو ان کی ہوتی ہے جن کے اندر فطرت کی آواز بالکل خاموش نہیں ہوتی۔ لیکن کچھ لوگوں کی حالت اس سے بھی بدتر ہوتی ہے، وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے نفس کی اصلاح کو مکمل طور سے بھلا بیٹھتے ہیں اور دنیا پوری طرح انہیں اپنے دھوکے میں مبتلا کردیتی ہے۔“

کبھی جوانی کی عمر میں انسان کے عقیدے، اخلاق اور تربیت کے اعتبار سے کچھ انحرافات پیدا ہوجاتے ہیں، امام خمینیؒ نے ایسے انحرافات اور غلط کاریوں کا سبب بننے والی کچھ وجوہات کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔ آپؒ نے فرمایا:

”اس امر میں کوئی شک نہیں کہ استعمار میڈیا کا غلط استعمال کررہا ہے یہاں تک کہ وہ بڑی مہارت سے نوجوانوں کے افکار کو زہرآلود کررہا ہے اور وہ ہم مسلمانوں کی ثقافت کو ایسے انداز میں منظم کررہا ہے، جس کی وجہ سے ہمارے جوان اپنے ملک میں واپس نہیں آتے۔ وہ استعمار ہمارے ٹی وی اور ریڈیو کے پروگرام اس طرح مرتب کررہا ہے کہ جس نے لوگوں کے اعصاب کو کمزور کردیا ہے اور ان کی قوت اور توانائیاں بے کار کاموں میں ضائع ہو رہی ہیں۔ یہ ہے استعماری ایجنڈا! جبکہ ہم اس قسم کے استعماری ہتھکنڈوں کے مخالف ہیں۔“

حرام کھانا

- انسان روح اور جسم کا مرکب ہے۔
- حرام مال کھانے سے کیا مراد ہے؟
- آخرت میں حرام کھانے کی کیا سزا ہے؟

مقدمہ

انسان، روح وجسم سے مرکب حقیقت:

بعض لوگ انسان کو فقط گوشت، خون، اور ہڈیوں پر مشتمل ایک مادی وجود شمار کرتے ہیں۔ وہ انسان کی حقیقت کو جسم کے علاوہ کچھ اور نہیں سمجھتے۔ اس فانی جسم کیلئے مضر اشیاء سے دوری اختیار کرتے ہیں، اسکی سلامتی، صحت، صفائی اور، خوبصورتی کا خیال رکھتے ہیں۔ اسے خوبصورت بنانے کیلئے مختلف قسم کی کریمیں، ورزشیں اور مخصوص غذائیں استعمال کرتے ہیں۔ جب انہیں جسمانی صحت میں خرابی کا احساس ہوتا ہے تو ڈاکٹروں سے رجوع کرتے ہیں تاکہ انکی صحت بحال ہو سکے۔

ایسے لوگ عام طور پر انسانی روح ونفس جیسی عظیم حقیقت سے غافل ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت فانی جسم کے تقاضے پورے کرنے کیلئے کوشاں رہتے ہیں لیکن باقی رہنے والی روح کو بھول جاتے ہیں۔ اپنے حیوانی پہلو کی خدمت اور حفاظت کرتے ہیں لیکن اس چیز کی جس کی وجہ سے انسان، انسان بنتا ہے اعتنا نہیں کرتے۔ ہر ممکن طریقے سے جسمانی لذتوں کے حصول کیلئے سعی وکوشش کرتے ہیں حتیٰ اگر ان لذتوں کے باعث ان کی عقل ہی کیوں نہ زائل ہو رہی ہو، کیا بے عقل انسان کو انسان کہا جاسکتا ہے؟

جسمانی صحت وسلامتی کا خیال رکھنا اچھی بات ہے بلکہ شرعی طور پر لازم ہے، لیکن جو چیز اس سے زیادہ اہم ہے وہ روح اور عقل کی سلامتی ہے۔ انسان کو اپنی روح کو مریض ہونے اور عقل کو معطل ہونے سے بچانا چاہیے۔ آئیے مل کر ایسے امور کو پہچانیں جو ہماری روح اور عقل کیلئے زہر قاتل کا کام کرتے ہیں تاکہ ہم ان سے دوری اختیار کرسکیں۔

حرام غذائیں کون سی ہیں؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہے اور ایسی غذاؤں سے اجتناب ہمارے لیے انتہائی ضروری ہے۔حرام غذا ہر وہ چیز ہے جسے خداوند متعال نے ہمارے لیے حرام قرار دیا ہے۔وہ مردار ہو یعنی غیر شرعی طریقے سے ذبح ہونے والا حلال گوشت جانور یا حرام گوشت جانور جیسے خنزیر اور کتے وغیرہ کا کھانا یا لوگوں کا مال ناحق کھانا، یا کسی نجس چیز کا کھانا، یہ سب حرام ہیں۔

کیا حرام غذائیں اثر رکھتی ہیں؟

جس طرح ناسالم غذائیں انسانی بدن کے مریض اور مسموم ہونے کا سبب بنتی ہیں اسی طرح سے حرام غذائیں روح، عقل اور قلب کو متاثر کرتی ہیں۔انکے استعمال سے انسان کا دل تاریک اور سخت ہو جاتا ہے اور اسکا مزاج اعتدال کھو دیتا ہے۔حرام غذاؤں سے جو خون اور گوشت بنتا ہے وہ شیطان اور اس کے لشکر کے وسیلوں میں سے ایک وسیلہ ہے اور انسان پر شیطان کے مسلط ہونے کا باعث ہے۔حرام کھانے والا شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی سے نکل کر شیطان اور اپنی خواہشات کا بندہ بن جاتا ہے۔اس سے بھی بدتر یہ کہ حرام کھانا انسان کی نسل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

''كَسْبُ الْحَرَامِ يَبِينُ فِي الذُّرِّيَّه''

حرام مال کمانے کے آثار (انسان کی) نسل میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔(کافی: ج ۵ ص ۱۲۴)

اسی طرح لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھانے والا آخرت میں آگ کھائے گا۔

آپ علیہ السلام ہی سے روایت ہے:

''مَنْ أَكَلَ مَالَ أَخِيهِ ظُلْماً وَ لَمْ يَرُدَّهُ إِلَيْهِ أَكَلَ جَذْوَةً مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''

جو شخص اپنے مومن بھائی کا مال ناجائز طور پر کھائے اور اسے واپس نہ کرے تو وہ قیامت کے دن آگ کا جلتا ہوا انگارا کھائے گا۔(کافی: ج ۲ ص ۳۳۳)

حرام چیز میں برکت نہیں ہوتی اور اسے راہ خدا میں خرچ کرنے پر کوئی اجر نہیں ملتا۔ایسا مال جمع کرنے والا رحمت خدا سے دور ہوتا ہے۔حضرت ابو الحسن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

''يَا دَاوُدُ إِنَّ الْحَرَامَ لَا يَنْمِي وَ إِنْ نَمَى لَا يُبَارَكُ لَهُ فِيهِ وَ مَا أَنْفَقَهُ لَمْ يُؤْجَرْ عَلَيْهِ وَ مَا خَلَّفَهُ كَانَ زَادَهُ إِلَى النار''

اے داؤد مال حرام میں وسعت نہیں ہوتی اور اگر بڑھ جائے تو اسمیں برکت نہیں ہوتی اور اس میں سے جو (راہ خدا میں) خرچ کیا جائے اس پر اجر نہیں ملتا اور اس میں سے جو مال انسان دنیا میں چھوڑ جائے

وہ اسے جھنم تک پہنچانے کیلئے زادراہ ہوتا ہے۔(کافی: ج۵،ص۱۲۵)

حرام مال کھانے کے مصادیق میں سے ایک سود ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

"وَ مَنْ أَكَلَ الرِّبَا مَلَأَ اللهُ بَطْنَهُ مِنْ نَارِ جَهَنَّمَ بِقَدْرِ مَا أَكَلَ وَإِنِ اكْتَسَبَ مِنْهُ مَالًا لَمْ يَقْبَلِ اللهُ مِنْهُ شَيْئاً مِنْ عَمَلِهِ وَ لَمْ يَزَلْ فِي لَعْنَةِ اللهِ وَ الْمَلَائِكَةِ مَا كَانَ عِنْدَهُ قِيرَاط"

جوشخص جس قدر سود کھائے گا اسی قدر اپنا پیٹ جہنم کی آگ سے بھرے گا اور جب تک اس کے پاس ذرہ بھر بھی سود کا مال ہوگا تو وہ کبھی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی لعنت سے دور نہیں رہ سکے گا۔

(وسائل الشیعہ: ج۱۸،ص۱۲۲)

جوشخص مال حرام کھاتا ہے وہ اہل بیت علیہم السلام کی ولایت کا اہل نہیں رہتا اور اس عظیم نعمت کو کھو دیتا ہے صادق آل محمد علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ:

"لَيْسَ بِوَلِيٍّ لِي مَنْ أَكَلَ مَالَ مُؤْمِنٍ حَرَاماً"

جوشخص کسی مومن کا مال ناجائز طور پر کھائے گا وہ میرا محب نہیں ہے۔(کافی: ج۵،ص۳۱۴)

شراب اور نشہ آور چیز کے قریب بھی نہ جائیں:

انسان کی انسانیت کا معیار اسکی عقل ہے۔ جوشخص جتنا زیادہ عاقل ہوگا اتنا ہی انسانیت کے نزدیک ہوگا، عقل ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اسکے احکام کی شناخت حاصل ہوتی ہے۔ اگر کسی کی عقل زائل ہو جائے تو وہ مقام انسانیت سے گر کر حیوان کی سطح پر آجاتا ہے اسی وجہ سے جب اہلبیت علیہم السلام شراب خوری اور دوسرے گناہوں کا آپس میں مقابلہ کرتے ہیں، تو شراب کو بڑا خطرہ قرار دیتے ہیں۔ چونکہ جوشخص کوئی دوسرا گناہ انجام دیتا ہے تو وہ بدستور خدا کی معرفت کا حامل ہوتا ہے لیکن جو کوئی مست ہو جائے اسکی عقل چلی جاتی ہے اور وہ خدا کی معرفت کھو دیتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"شُرْبُ الْخَمْرِ مِفْتَاحُ كُلِّ شَرٍّ"

شراب خوری ہر برائی کی چابی ہے۔(وسائل الشیعہ۔ج۲۵،ص۳۱۶)

جو انسان شراب پیتا ہے اسکی نماز قبول نہیں ہوتی۔ امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

"مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فَسَكِرَ مِنْهَا لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ أَرْبَعِينَ يَوْماً فَإِنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ فِي هَذِهِ الْأَيَّامِ ضُوعِفَ عَلَيْهِ الْعَذَابُ لِتَرْكِهِ الصَّلَاةَ"

اگر کوئی شخص شراب پیئے اور اسکی وجہ سے مست ہو جائے تو چالیس دن تک اسکی نماز قبول نہیں ہوتی

اوراگروہ ان دنوں میں نماز ترک کردے تو نماز چھوڑنے کیوجہ سے اسکا عذاب دوگنا ہوجائے گا۔

(من لا یحضرہ الفقیہ: ج۳،ص ۵۷۰)

شراب خوری دنیا کی طرح آخرت میں بھی انسان کے عیبوں اور رازوں سے پردہ اٹھا دیتی ہے اور وہ دنیا و آخرت کی آفات میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

''الذُّنُوبُ الَّتِی تَهْتِكُ السُّتُورَ شُرْبُ الْخَمْرِ''

شراب خوری حیاء کے پردوں کو چاک کردینے والے گناہوں میں سے ہے۔

(وسائل الشیعہ۔ج۱۶،ص ۲۷۴)

شراب پینے والا جنت میں داخل نہیں ہوسکے گا،حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''ثَلَاثَةٌ لَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ السَّفَّاكُ لِلدَّمِ وَ شَارِبُ الْخَمْرِ وَ مَشَّاءٌ بِالنَّمِيمَةِ''

تین طرح کے لوگ جنت میں داخل نہیں ہوں گے خون بہانے والا ،شراب پینے والا اور تکبر کے ساتھ چلنے والا۔(وسائل الشیعہ۔ج۲۵،ص ۳۰۵)

دوسری نشہ آور چیزیں بھی شراب کی طرح ہیں کیونکہ وہ شراب کی طرح عقل کو زائل کرتی ہیں۔

رب العزت کا قرآن میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

اے ایمان والو! شراب، جوا، بت اور پانسے سب ناپاک شیطانی عمل ہیں پس اس سے پرہیز کروتا کہ تم نجات حاصل کرسکو۔(المائدہ:۹۰)

حرام مال ترک کرنے والے کا انعام:

اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام کی ہیں انہیں اس لئے حرام قرار نہیں دیا کہ انسان کو سختی اور مشقت میں ڈالے بلکہ انسان کو صاحب مقام و منزلت اور پاکیزہ بنانے کی غرض سے ہر پست و حقیر چیز، جو اس کیلئے مضر اور اس کے سقوط کا سبب بنتی ہو، کو حرام قرار دیا ہے۔لہٰذا جو شخص اپنے آپ کو حرام چیزوں سے بچائے گا تو خداوند آخرت میں معاوضہ کے طور پر اسے دائمی گھر اور جنت عطا فرمائے گا، جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے اور اس میں ہر وہ چیز موجود ہے جسکی انسان خواہش کرسکتا ہے۔

اے عزیز برادر! اپنی جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کوشش کرنا آپ کے جسم کا فطری حق ہے لیکن آپ کی روح،

عقل اور قلب کے بھی کچھ حقوق ہیں انہیں ضائع نہ کریں اور انہیں فسق وفجور کے ماحول سے دور رکھیں۔ دنیا وآخرت میں انکے مقام ومنزلت میں کمی کا باعث بننے والے امور سے بچیں۔ فقط حلال رزق تلاش کریں وہ آپ کے لیے کفایت کرے گا۔ رزق حلال کمانے میں عظیم اجر موجود ہے۔ جیسا کہ فرمان امام باقر علیہ السلام ہے:

''اَلْعِبَادَةُ سَبْعُونَ جُزْءاً أَفْضَلُهَا طَلَبُ الْحَلَالِ''

عبادت کے ستر اجزاء ہیں ان میں سے سب سے افضل حلال روزی کی تلاش ہے۔ (کافی: ج ۵ ص ۷۸)

خلاصہ

جس شئے سے جسم کو تقویت حاصل ہوتی ہے یقیناوہ روح پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

حرام کھانا رُوح کو تاریک کر دیتا ہے۔

بغیر اجازت لوگوں کے اموال سے حلال شئے خرید نا بھی فعل حرام ہے۔

سوالات

صحیح یا غلط کی نشاندہی کریں:

۱ ہم کوئی ایسا کام نہیں کرسکتے جو انسان کی روح پر اثر انداز ہو۔ ( )

۲ اگر تھوڑی مقدار میں حرام مال کھایا جائے تو اثر نہیں کرتا۔ ( )

۳ آبِ جو (بیئر) حرام نہیں ہے کیونکہ یہ نشہ نہیں دیتی۔ ( )

مطالعہ کیلئے

روزِ قیامت فقیر کا حساب

اللہ عزوجل کی جانب سے فقراء کو دی جانے والی عطاؤں میں سے ایک روزِ قیامت حساب کی آسانی اور آخرت میں نعمتوں کی فراوانی ہے۔لہٰذا جن لوگوں کیلئے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ایسی نعمتیں مخصوص کر رکھی ہیں، انہیں چاہیے کہ دنیا کی ناداری اور فقیری پر صبر سے کام لیں اور شیطان سے بچیں کیونکہ اس نے فقراء کو دھوکہ دینے کیلئے بہت سے حیلے تیار کر رکھے ہیں جیسے فقر و ناداری پر آہ و فغاں اور ناشکری کرنا۔۔۔وغیرہ۔

آپؐ سے ہی روایت ہے کہ: ’’روزِ قیامت اللہ عزوجل ایک منادی کو حکم دے گا جس پر وہ ندا کرے گا فقراء کہاں ہیں؟ یہ سُن کر کچھ لوگ کھڑے ہو جائیں گے جنہیں جنت میں بھیجے جانے کا حکم دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ جنت کے دروازے پر آئیں گے جس پر جنت کے داروغے ان سے کہیں گے کہ کیا حساب سے پہلے ہی جنت میں داخل ہو رہے ہو؟ تو وہ کہیں گے: کیا ہمیں کچھ دیا تھا جو اس کا حساب کروائیں؟ چنانچہ اللہ عزوجل فرمائے گا، انہوں نے سچ کہا میرے بندو! میں نے تمہیں فقیر و نادار بنایا جبکہ میں تمہارے ساتھ تھا۔ البتہ آج کے روز کیلئے یہ سب ذخیرہ کر رکھا ہے۔ پھر ان سے فرمائے گا دیکھو اور لوگوں کے چہرے پہچانو، جس نے تمہارے ساتھ نیک سلوک کیا تھا اس کا ہاتھ پکڑ کر جنت میں داخل کر دو۔

چوتھی فصل

عبادات کے فقہی احکام

- علم فقہ حاصل کرنا
- ولایتِ فقیہ
- نجاسات اور ان کے احکام
- مطہرات
- وضو
- غسل اور تیمم
- مقدماتِ نماز
- افعالِ نماز

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

علماء حق اور علماء سوء کی شناخت کیسے؟

ایک مرتبہ ڈاکٹر محمد علی نقوی ؒ نے فرمایا "جو عالم دین ولی فقیہ امام خمینیؒ کی بالواسطہ یا بلاواسطہ مخالفت کرتا ہے وہ علماء سوء میں سے ہے جبکہ وہ علماء جو خط امام کے پیرو ہیں وہ علماء حقہ ہیں اور ایسے علماء کی پیروی لازم ہے۔آپ ہر محفل اور ہر جلسے میں نوجوانوں کو تاکید فرماتے کہ وہ ہر معاملہ میں خط امام کو پیش نظر رکھیں۔

علم فقہ حاصل کرنا

- ہم تقلید کیوں کرتے ہیں؟
- ہم پر تقلید کرنا کب واجب ہوتا ہے؟
- ہم مرجع تقلید کا انتخاب کیسے کرتے ہیں؟

مقدمہ

قرآن مجید نے تحصیل علم پر تاکید کی ہے اور انسان کو علم میں اضافے کیلئے دعا کرنے کا حکم دیا ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا

اور کہہ دیا کریں: پروردگارا میرے علم میں اضافہ فرما۔(طٰہٰ/ ۱۱۴)

اہلبیت علیہم السلام سے منقول روایات میں علم حاصل کرنے، خاص طور پر دین کی گہری آگاہی اور حلال وحرام سے آشنائی پر بہت زور دیا گیا ہے اور یہی علم حاصل کرنے کی بدولت علماء، انبیائے کرام کے وارث ہوتے ہیں۔اس علم کا حصول درحقیقت عبادت کی ہی ایک قسم ہے۔ چنانچہ امام رضا علیہ السلام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

”مُجَالَسَةُ الْعُلَمَاءِ عِبَادَةٌ“

”علماء کی محفل میں بیٹھنا عبادت ہے۔“(بحارالانوار۔ج ۱ص ۲۰۴)

اور حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی:

”يَا بُنَيَّ جَالِسِ الْعُلَمَاءَ وَزَاحِمْهُمْ بِرُكْبَتَيْكَ فَإِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يُحْيِي الْقُلُوبَ بِنُورِ الْحِكْمَةِ كَمَا يُحْيِي الْأَرْضَ بِوَابِلِ السَّمَاءِ۔“

”بیٹا! علماء کی محفل میں دوزانو ہو کر بیٹھا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ حکمت و دانائی کے نور سے دلوں کو اس طرح تازگی بخشتا ہے جس طرح آسمان سے بارش برسا کر زمین کو سرسبز وشاداب کر دیتا ہے۔“(بحارالانوار۔ج ۱ص ۲۰۴)

اس کے علاوہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"لَیْتَ السِّیَاطَ عَلَی رُءُوسِ أَصْحَابِی حَتَّی یَتَفَقَّهُوا فِی الْحَلَالِ وَ الْحَرَامِ"

"کاش! میرے اصحاب کے سروں پر اس وقت تک ایک کوڑا لٹکا رہتا جب تک کہ وہ حلال وحرام کی سمجھ بوجھ (علم فقہ) حاصل نہ کر لیتے۔" (بحارالانوار۔ ج ۱، ص ۲۱۳)

اسلام نے علم کی پیروی کرنے کی دعوت دی ہے تاکہ انسان کے تمام اعمال وانفرادی اور اجتماعی زندگی، ہدایت، استقامت اور ایمان کے پیمانے پر ہو۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر اسلام نے دینی مسائل اور شرعی احکام میں علمائے کرام کی پیروی کرنے اور ان کی تقلید کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات کی روشنی میں تقلید کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔

۱۔ ہم تقلید کیوں کرتے ہیں؟

یقیناً عقلمند اور بیدار مغز لوگوں کی یہ عادت اور معمول ہے کہ وہ جن امور میں خود مہارت نہیں رکھتے ان کے بارے میں بااعتماد ماہرین کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کے اس رجوع کرنے کو تقلید کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر سے رجوع کرنا اور اس کی ہدایات پر عمل کرنا بھی تقلید کی ایک قسم ہے۔ اس تقلید کا مقصد ایسی صحیح وسالم زندگی کی ضمانت دینا ہے جو مصائب وآلام، دکھوں، بے چینیوں اور بیماریوں سے محفوظ ہو۔

لیکن کچھ دوسری قسم کی بیماریاں بھی ہوتی ہیں جو جسم و روح دونوں کیلئے ایک ساتھ اذیت وتکلیف کا سبب بنتی ہیں۔ انسان اور معاشرہ کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ اور آخرت کے برے انجام سے ڈراتی ہیں۔

ان مہلک بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کرنا اور ان کے مضر اثرات سے بچنا ممکن نہیں سوائے اس کے کہ ایسے طبیبوں کی طرف رجوع کیا جائے جو روح اور بدن کا ایک ساتھ علاج کرنے والے ہوں اور ان کی ہدایات اور تجاویز پر عمل کیا جائے۔

یہ طبیب علماء دین ہی ہیں جو قرآن وسنت سے شرعی احکام کو سمجھنے کی مہارت رکھتے ہیں جس کی بناء پر ہمارے لیے نماز، روزہ، حج اور دوسرے امور کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، جن میں ہماری دنیا وآخرت کی خیر وصلاح موجود ہوتی ہے۔

علماء دین کی طرف رجوع کرنا، ان سے شرعی احکام معلوم کرنا اور ان پر عمل کرنا اس تمام عمل کو تقلید کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

اگر تمہیں معلوم نہیں تو اہل ذکر سے پوچھو (سورہ نحل: ۴۳)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں علماء اور فقہاء سے رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔

۲۔ ہم پر تقلید کرنا کب واجب ہوتا ہے؟

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بچوں اور دیوانگی میں مبتلا افراد پر نماز کی ادائیگی اور روزہ رکھنے جیسے احکام جاری نہیں فرمائے ہیں

کیونکہ وہ حلال وحرام میں فرق نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ واجب ترک کرنے پر ان کا حساب نہیں کرے گا اور نہ ہی کسی فعل حرام کو سرانجام دینے پر انہیں سزا دے گا۔

ذیل کی حدیث نبویؐ کا یہی مفہوم ہے کہ:

''بچے کو جب تک احتلام نہ ہو اور دیوانہ صحتمند نہ ہوجائے تو وہ مرفوع القلم ہیں (یعنی ان پر کوئی شرعی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی)۔'' اس لیے دین میں کسی کی تقلید کرنا بھی ان پر واجب نہیں ہوتا۔

لیکن جب انسان بالغ ہوجائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ نماز و روزہ ترک کرنے پر اس کا محاسبہ کرے گا اور فعل حرام کا ارتکاب کرنے پر اسے سزا دے گا، کیونکہ واجب کی ادائیگی اور حرام سے بچنا اس کی شرعی ذمہ داری ہے۔ انسان لڑکا ہو تو جب قمری سال کے حساب سے پندرہ برس (چودہ سال سات ماہ عیسوی) کا ہوجائے اور اگر لڑکی ہو تو وہ نو قمری سال (آٹھ سال نو ماہ عیسوی) کی ہوجائے تو اس پر شرعی احکام لاگو ہوجاتے ہیں۔ اور کبھی اس عمر سے پہلے بھی بلوغت کو پہنچ جاتا ہے۔ یعنی اگر اس کے زیرناف سخت بال اُگ آئیں یا اسے احتلام ہوجائے۔ لہٰذا اس انسان پر شرعی احکام جاری ہوجاتے ہیں اور اس پر واجب ہے کہ وہ سب سے زیادہ عالم فقیہ (اعلم) کی تقلید کرلے اور اپنے تمام افعال کو اس فقیہ کی طرف سے جاری ہونے والے فتاویٰ کے مطابق انجام دے۔

۳۔ ہم مرجع تقلید کا انتخاب کیسے کریں؟

جس فقیہ کی تقلید کی جائے اس میں متعدد صفات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے اہم صفات درج ذیل ہیں:

۱۔ اجتہاد: یہ کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں شرعی احکام کو استنباط کرسکتا ہو۔

۲۔ عدالت: وہ اطاعت الٰہی کا عادی ہو اور حرام کاموں سے اس قدر اجتناب کرتا ہو کہ یہ چیز اس کی طبیعت میں راسخ ہو چکی ہو۔

۳۔ اعلمیت: وہ حکم شرعی کے استنباط کرنے میں اپنے زمانہ کے تمام فقہاء و مجتہدین سے زیادہ ماہر ہو۔

لہٰذا اعلم کو پہچاننے کے تین طریقے بیان کئے گئے ہیں اگر انسان ان تین طریقوں سے پتہ چلالے کہ فلاں مجتہد اعلم ہے تو پھر اعلم کی تقلید کرنا چاہئے۔

۱۔ کسی انسان کو خود یقین آجائے مثلاً وہ ایسا شخص ہو جو خود صاحب علم ہو اور مجتہد اور اعلم کی پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۲۔ دو ایسے عالم اور عادل اشخاص جو مجتہد اور عالم کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہوں کسی کے مجتہد کے اعلم ہونے کی تصدیق کریں بشرطیکہ دو اور عالم اور عادل ان کی تردید نہ کریں۔

۳۔ انسان کسی عقلائی طریقے سے کسی شخص کے مجتہد یا اعلم ہونے کا اطمینان حاصل کرلے مثلاً کچھ اہل علم جو مجتہد یا اعلم کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے درمیان اس کے بارے میں ایسی شہرت ہو جس سے یقین حاصل ہوجائے۔

خلاصہ

۱. جب انسان بالغ ہو جاتا ہے تو اس پر شرعی ذمہ داریاں لاگو ہو جاتی ہیں۔ بلوغت ثابت ہونے کی چند علامات ہیں ان میں صحیح ترین یہ ہے کہ مرد کی عمر کے پندرہ قمری سال اور عورت کے نو قمری سال پورے ہو جائیں۔

۲. ایسے عادل فقیہ کی تقلید کرنا صحیح ہے جو تمام مجتہدین سے اعلم ہو۔

۳. انسان خود مجتہد اعلم کی پہچان کر سکتا ہو، یا اس کے بارے میں ایسی شہرت ہو جس سے یقین حاصل ہو جائے، یا اہل خبرہ میں سے دو عادل گواہی دیں۔

سوالات

۱. تقلید کیا ہے؟

۲. انسان مکلف کیسے ہوتا ہے؟

۳. ہم تقلید کرنے کیلئے مجتہد اعلم کی شناخت کیسے کر سکتے ہیں؟

مطالعہ کیلئے

امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف سے تعلق کے آداب

۱۔آپؑ کی بیعت کرنا:

دعائے عہد میں وارد ہوا ہے:

”اللّٰهُمَّ إِنِّي أُجَدِّدُ لَهُ فِي صَبِيحَةِ يَوْمِي هَذَا وَ مَا عِشْتُ مِنْ أَيَّامِي عَهْداً وَ عَقْداً وَ بَيْعَةً لَهُ فِي عُنُقِي لَا أَحُولُ عَنْهَا وَ لَا أَزُولُ أَبَداً“

”اے اللہ! میں آج کے دن کی صبح کو اور جب تک زندہ رہوں میری گردن پر یہ عہد و پیمان، بندھن اور بیعت ہے میں اس کی تجدید کرتا ہوں۔ نہ اس سے پھروں گا اور نہ اسے کبھی چھوڑوں گا۔ (بحارالانوار: ج ۵۳ ص ۹۵)

۲۔آپؑ کی زیارت کا اشتیاق ظاہر کرنا:

جیسا کہ روایات میں موجود ہے کہ امیر المومنینؑ نے اپنی اولاد میں سے امام مہدیؑ کا ذکر فرمایا اور ان سے ملاقات کا شوق ظاہر کرتے ہوئے اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ میں ان کے دیدار کیلئے بے چین ہوں۔

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے امام مہدیؑ کی ملاقات کا اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے فرمایا:

لَوْ أَدْرَكْتُهُ لَخَدَمْتُهُ أَيَّامَ حَيَاتِي

”اگر مجھے ان کا دورِ امامت نصیب ہوا تو میں اپنی زندگی کے باقی ایام ان کی خدمت میں گزاروں گا“۔

(الغیبۃ النعمانی۔ ص ۲۴۵)

اہلبیتؑ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم امام کی زیارت کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔ چنانچہ دعائے عہد کے الفاظ ہیں:

”اللّٰهُمَّ أَرِنِي الطَّلْعَةَ الرَّشِيدَةَ وَ الْغُرَّةَ الْحَمِيدَةَ وَ اكْحُلْ نَاظِرِي بِنَظْرَةٍ مِنِّي اليه“

”اے اللہ! مجھے حضرت کے خوبصورت چہرے کی زیارت نصیب فرما اور ان کے دیدار کو میری آنکھوں کا سرمہ بنا“

اور دعائے ندبہ میں ہے:

وَأَرِهِ سَيِّدَهُ يَا شَدِيدَ الْقُوَى

اے عظیم قوت کے مالک! اس بندے کو اس کے آقاؑ کی زیارت کرا دے۔

اور اسی دعا میں یہ بھی ہے "هل إِلَيْكَ يَا ابْنَ أَحْمَدَ سَبِيلٌ فَتُلْقَى" اے احمد مرسلؐ کے فرزند آیا آپ سے ملنے کا کوئی چارا ہو سکتا ہے۔

اور ایک دعا میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

اے اللہ! ہمیں ہماری زندگی اور مرنے کے بعد بھی اپنے بابرکت ولی کے مقدس چہرے کی زیارت نصیب فرما۔

۳۔ آپؑ کی ولایت پر ثابت قدم رہنا:

امام محمد باقر علیہ لاسلام سے روایت ہے، جسمیں آپؑ نے فرمایا:

لوگوں پر ایسا وقت آئے گا کہ ان کے امام مہدیؑ ان کی نظروں سے پوشیدہ ہو جائیں گے اس زمانے میں جو لوگ ہماری ولایت پر ثابت قدم رہیں گے ان کیلئے جنت کی بشارت ہے۔ ان کا کم ترین ثواب یہ ہو گا کہ اللہ جل جلالہ ان کو پکار کر فرمائے گا اے میرے بندو اور اے میری کنیزو! تم میرے پوشیدہ راز پر ایمان لے آئے، تم نے میرے غیب کی تصدیق کی اس لئے تمہیں میری طرف سے بہترین ثواب ملنے کی بشارت ہو تم میرے سچے بندے اور کنیزیں ہو، میں تمہارے اعمال قبول کرتا ہوں اور تم سے عفو و درگزر کرتا ہوں، تمہاری وجہ سے میں اپنے دوسرے بندوں کو بارش رحمت سے سیراب کرتا ہوں اور ان سے مصیبت کو دُور کرتا ہوں۔ اگر تم نہ ہوتے تو میں ضرور ان پر اپنا عذاب نازل کر دیتا۔ (الجواھر السنیہ۔ ص ۲۴۹)

۴۔ آپؑ کی جدائی پر غمگین ہونا اور گریہ کرنا:

کافی شریف میں امام صادق علیہ السلام سے وارد ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"نَفَسُ الْمَهْمُومِ لَنَا الْمُغْتَمِّ لِظُلْمِنَا تَسْبِيحٌ"

''ہم پر ہونے والے مظالم پر غمگین ہونے والے کا سانس لینا تسبیح ہے۔ (کافی۔ ج ۲ ص ۲۲۶)

اور آپ علیہ السلام سے ہی روایت ہے:

''وَاللّٰهِ لَيَغِيبَنَّ إِمَامُكُمْ سِنِيناً مِنْ دَهْرِكُمْ وَلَتُمَحَّصُنَّ حَتَّى يُقَالَ مَاتَ قُتِلَ هَلَكَ بِأَيِّ وَادٍ سَلَكَ وَلَتَدْمَعَنَّ عَلَيْهِ عُيُونُ الْمُؤْمِنِينَ''

''بخدا تمہارے امام ضرور کئی سال تک تم سے پوشیدہ رہیں گے اور تمہیں خوب آزمایا جائے گا یہاں تک کہا جائے گا کہ وہ وفات پا گئے ہیں، قتل کر دیے گئے ہیں یا کسی وادی میں دُور چلے گئے ہیں۔ اس لئے

مومنین کو آپؑ کی جدائی پر آنسو بہانے چاہئیں۔" (کافی۔ج ۱ص ۳۳۶)

کتاب عیون الاخبار میں آپؑ سے متعلق امام رضاؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "کتنے مومن مرد اور خواتین ہیں جو بہتے چشمے (امام حجتؑ) کی مصیبت پر حیران و پریشان اور رنجیدہ ہیں۔" (الامامۃ والتبصرۃ۔ص ۱۱۴)

۵- آپؑ کے ظہور کیلئے دعا کرنا:

خصوصاً درج ذیل دعا کرنا:

"اللّٰھُمَّ کُنْ لِوَلِیِّکَ الحُجَۃِ بنِ الحَسَنِ صَلَوَاتُکَ علَیہِ وعَلی آبائِہِ فِی ھٰذِہِ السَّاعَۃِ وَفِی کُلِّ سَاعَۃٍ وَلِیّاً وَحَافِظاً وَقَائِداً وَنَاصِراً وَدلیلاً وَعَیْناً حَتّٰی تُسْکِنَہُ أَرْضَکَ طَوْعاً وَتُمَتِّعَہُ فِیھَا طَوِیلا

خدایا اس لمحے اور ان تمام لمحات میں اپنے ولی حضرت حجۃ بن الحسن پر اور ان کے آباواجداد پر درود وسلام ہو اور ان کی سرپرستی اور ان کی نگہداری و رہبری اور ان کا مددگار اور راہنما رہنا اور ان کو اس طریقے سے زمین پر ساکن فرما جس طرح وہ چاہتے ہیں تاکہ زمین ایک طولانی عرصے تک ولی برحق کے وجود سے بہرہ مند ہو جائے۔

۶- آپؑ کی زیارت پڑھنا:

خصوصاً زیارت آلِ یٰسین پڑھنا جو آپؑ سے وارد ہے کہ جس میں آپؑ ہمیں یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہمیں ان کے وجود کا شعور و احساس کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ ہم کہتے ہیں:

"السَّلَامُ عَلَیْکَ حِینَ تَقُومُ السَّلَامُ عَلَیْکَ حِینَ تَقْعُدُ السَّلَامُ عَلَیْکَ حِینَ تَقْرَأُ وَ تُبَیِّنُ السَّلَامُ عَلَیْکَ حِینَ تُصَلِّی وَ تَقْنُتُ السَّلَامُ عَلَیْکَ حِینَ تَرْکَعُ وَ تَسْجُدُ"

"سلام ہو آپؑ پر جب آپؑ کھڑے ہوں اور جب آپؑ تشریف فرما ہوں۔ سلام ہو آپؑ پر جب آپؑ قرأت کرتے ہیں اور ظاہر ہوتے ہیں۔ سلام ہو آپؑ پر جب آپؑ نماز پڑھتے اور قنوت پڑھتے ہیں۔ سلام ہو آپؑ پر جب آپؑ رکوع و سجود کرتے ہیں۔" (بحار الانوار۔ج ۵۳ ص ۱۷۳)

۷- اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں آپؑ کو وسیلہ بنانا:

خواہ دنیوی معاملات ہوں یا اخروی، یا ہم انہیں اپنی شفاعت کا ذریعہ قرار دیں جیسا کہ دعائے توسل میں ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں امام صاحب العصر والزمانؑ کے ساتھ توسل کرنا وارد ہوا ہے جس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

"اللّٰھُمَّ إِنِّی أَسْأَلُکَ بِحَقِّ وَلِیِّکَ وَ حُجَّتِکَ صَاحِبِ الزَّمَانِ إِلَّا أَعَنْتَنِی بِہِ عَلَی جَمِیعِ أُمُورِی وَ کَفَیْتَنِی بِہِ مَئُونَۃَ کُلِّ مُوذٍ وَ طَاغٍ وَ بَاغٍ وَ أَعَنْتَنِی بِہِ فَقَدْ بَلَغَ مَجْھُودِی وَ کَفَیْتَنِی کُلَّ عَدُوٍّ وَ ھَمٍّ وَ غَمٍّ وَ دَیْنٍ وَ وُلْدِی وَ جَمِیعَ أَھْلِی وَ إِخْوَانِی وَ مَنْ یَعْنِینِی أَمْرُہُ وَ خَاصَّتِی آمِینَ رَبَّ الْعَالَمِینَ"

''اے میرے اللہ! میں تجھ سے تیرے ولی اور تیری حجت صاحب الزمان کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ ان کے واسطے تو میرے تمام امور میں مدد فرما اور ہر موذی، سرکش و باغی کے مقابلہ میں میری کفایت فرما کیونکہ میری تمام ہمت جواب دے چکی ہے اور مجھے ہر دشمن کے مقابلے میں، دکھ و پریشانی اور قرض کی ادائیگی میں کفایت فرما۔ میری اولاد، تمام اہل خانہ، بہن بھائیوں اور ان کے معاملے میں جن کے امور میرے ذمے ہیں میری مدد فرما اور خاص دوست و احباب کی مدد فرما۔ آمین یارب العالمین۔''

(بحارالانوار۔ ج ۹۱ ص ۳۵)

۸- آپؑ کے اسم گرامی کے ذکر ہوتے ہی احتراماً کھڑے ہونا:

خصوصاً لفظ ''قائم'' ذکر ہوتے وقت کھڑے ہو جانا چاہیے کیونکہ ایک روایت میں وارد ہوا ہے کہ ایک مرتبہ امام جعفر صادقؑ کی محفل میں آپ (مہدیؑ) کا نام مبارک لیا گیا تو آپ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ (البتہ کھڑا ہونا واجب نہیں ہے)

۹- آپؑ پر درود بھیجنا:

کثیر مقامات پر امام زمانہؑ پر درود بھیجنے کو مستحب قرار دیا گیا ہے جیسا کہ دعائے افتتاح اور امام حسن عسکریؑ سے وارد درود میں ذکر کیا گیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

'' الصَّلَاةُ عَلَى وَلِيِّ الْأَمْرِ الْمُنْتَظَرِ الْحُجَّةِ بْنِ الْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى وَلِيِّكَ وَ ابْنِ أَوْلِيَائِكَ الَّذِينَ فَرَضْتَ طاعتَهُمْ ''

''اے اللہ! اپنے ولی امر امام منتظر حجت ابن الحسنؑ پر درود بھیج۔ اے اللہ! اپنے ولی اور اپنے ان اولیاء کے فرزند پر درود بھیج جن کی اطاعت تو نے فرض قرار دی ہے۔'' (بحارالانوار۔ ج ۹۱ ص ۷۸)

۱۰- آپؑ کی جانب سے صدقہ کرنا:

سفر پر روانہ ہوتے وقت دعائے تصدق (صدقہ) میں یہ الفاظ وارد ہیں:

'' اللّهمّ إنّ هذه لك و منك و هى صدقة عن مولانا۔ صلوات الله عليه۔ و بين يدى أسفاره و حركاته و سكناته فى ساعات ليله و نهاره ''

''اے اللہ! یہ تیرے لیے اور تیری ہی جانب سے ہے۔ یہ صدقہ ہمارے آقا (یعنی امام مہدیؑ) کی طرف سے صدقہ ہے۔ شب و روز ان کے سفروں اور آمد و رفت میں ان پر درود بھیج۔''

ولایتِ فقیہ

- ولایتِ فقیہ کا مطلب کیا ہے؟
- اسلام میں ولایت کا مرتبہ کسے حاصل ہے؟
- ولایتِ فقیہ پر دلیل کیا ہے؟

مقدمہ

۱۔ ولایت فقیہ کا کیا معنی ہے؟

ولایت فقیہ کی بحث میں ولایت سے مراد حاکمیت، سرپرستی اور سلطنت و کنٹرول ہے جبکہ فقیہ سے مراد ایسا مجتہد جو جامع الشرائط ہو۔ جامع الشرائط فقیہ میں تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

☆ اس کا مجتہد ہونا (یعنی قرآن وسنت سے حلال وحرام کے مسائل کو نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہو)

☆ عادل ہونا (جیسے کہ روایت میں ہے کہ: گناہوں سے اپنے نفس کی حفاظت کرنے والا ہو، اپنے دین کا محافظ ہو، خواہشات نفسانی کی مخالفت کرنے والا ہو اور اللہ، رسولؐ اور امام معصومؑ کا مطیع ہو۔

☆ رہبریت کی صلاحیت کا حامل ہونا۔

(پس ولایت فقیہ یعنی جامع الشرائط فقیہ کی مسلمانوں کے جملہ امور میں سرپرستی،، حاکمیت اور کنٹرول ہے اور یہ حاکمیت سیاسی، اجتماعی، اقتصادی، ثقافتی اور عسکری تمام امور میں ہے اور ایک جملے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ولایت فقیہ امت کی قیادت کا منصب ہے۔)

۲۔ اسلام میں ولایت کسے حاصل ہے؟

اسلام میں ولایت صرف اللہ وحدہ لا شریک سے ہی مختص ہے اور کوئی شخص کسی پر ولایت اور سرپرستی کا اختیار نہیں رکھتا مگر یہ کہ وہ اس کے اذن سے ولی وسرپرست بنے لہذا اللہ تعالی نے انبیاء کو حق حاکمیت وخلافت عطا فرمائی ہے۔

چنانچہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ

اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ چنانچہ آپ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ (حکومت) کریں ۔(ص:۲۶)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا ہے مگر صرف اس لئے کہ حکم خدا سے اس کی اطاعت کی جائے۔(نساء:۶۴)

اسی طرح فرمایا:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ

ایمان والو بس تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ صاحبان ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکات دیتے ہیں۔(مائدہ/ ۵۵)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور صاحبان امر کی اطاعت کرو۔۔ (نساء:۵۹)

اس سے ثابت ہوا کہ انبیائے کرام اور آئمہ طاہرینؑ دو امور میں حاکم و سرپرست ہیں:

۱۔دینی لحاظ سے: جس سے وہ دینی امور میں مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۲۔دنیاوی لحاظ سے: جس کی بناء پر وہ حکومت کرنے اور ملت کے معاملات چلانے میں اتھارٹی ہیں۔

۳۔ ولایت فقیہ پر دلیل کیا ہے؟

زمانہ غیبت امام معصومؑ میں ولایت سے لاپرواہی برتنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ دینی اور دنیاوی تمام امور میں اس کی ضرورت مسلّم ہے۔ چنانچہ درج ذیل اسباب کی بناء پر عادل فقیہ، امام معصومؑ کی نیابت میں اُمت کے ولی ہیں:

(الف): چونکہ اللہ تعالیٰ ولایت حقیقی کا مالک ہے۔ اسی نے عادل فقیہ کو اُمت کے امور میں ولایت کی اجازت دی ہے۔ یہ حقیقت درج ذیل روایات سے واضح ہوجاتی ہے: امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے کہ:

"مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مِمَّنْ قَدْ رَوَى حَدِيثَنَا وَ نَظَرَفِي حَلَالِنَا وَ حَرَامِنَا وَ عَرَفَ أَحْكَامَنَا فَلْيَرْضَوْا بِهِ حَكَماً فَإِنِّي قَدْ جَعَلْتُهُ عَلَيْكُمْ حَاكِماً"

"تم میں سے جو ہماری حدیث کا بیان کرنے والا ہو، ہمارے حلال وحرام میں سمجھ بوجھ رکھتا ہو اور ہمارے احکام سے واقف ہوتو میں اسے تم پر حاکم بناتا ہوں۔" (کافی: ج ا ص ۶۷)

امام مہدیؑ کا فرمان ہے کہ:

"أَمَّا الْحَوَادِثُ الْوَاقِعَةُ فَارْجِعُوا فِيهَا إِلَى رُوَاةِ حَدِيثِنَا فَإِنَّهُمْ حُجَّتِي عَلَيْكُمْ وَ أَنَا حُجَّةُ اللهِ عَلَيْهِم"

"بہرحال پیش آنے والے حادثات وواقعات میں ہمارے راویان حدیث کی طرف رجوع کرو۔ کیونکہ وہ آپ پر میری طرف سے حجت ہیں اور میں ان پر خدا کی حجت ہوں" (بحارالانوار: ج ۵۳ ص ۱۸۰)

یعنی پیش آنے والے نئے واقعات کے سلسلے میں عادل فقہاء کی طرف رجوع کیا جائے۔ کثیر روایات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علماء انبیاء کرام کے وارث اور رسولؐ کے امین ہیں اور تمام امور کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں ہے۔

(ب): اسلام میں ولایت الٰہی، قانون کی ولایت ہے جو شریعت اسلامیہ کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس کے نازل کردہ قوانین وشریعت کے مطابق حکومت کریں۔

امام معصومؑ کے زمانہ غیبت میں ولایت سے چشم پوشی کرنا ممکن نہیں ہے۔ جس کی بناء پر دین شناس، اسلامی شریعت کے عالم کو ولایت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ شریعت سے ناواقف انسان سے شرعی حکمرانی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ شریعت کے مطابق حکومت کرنے والا، شریعت کا عالم ایسا فقیہ ہوتا ہے، جس کیلئے یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ وہ احکام الٰہی کو نافذ کرنے میں امانتداری سے کام لے تاکہ عوام پر اپنے مفادات اور ذاتی ترجیحات کو پس پشت رکھتے ہوئے، اُمت کی فلاح و بہبود کیلئے حکومت کرسکے۔ شریعت کے صحیح نفاذ کا ذمہ دار فقیہ عادل ہی ہوسکتا ہے۔ ان خصوصیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صرف فقیہ عادل ہی امام معصومؑ کے زمانہ غیبت میں ولی امر کی ذمہ داری کے لائق ہوتا ہے۔

۴۔ ہم ولی فقیہ کی اطاعت کیسے کریں؟

امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

"اس امر میں کسی شک وتردید کی گنجائش نہیں ہے کہ جو ولایت (حکومت کے سلسلے میں) نبی کریمؐ اور آئمہ اطہارؑ کیلئے تھی وہی حق ولی فقیہ کیلئے بھی ثابت ہے۔"

چنانچہ ولایت فقیہ، انبیاء اور آئمہؑ کی ولایت کا تسلسل ہے اور یوں ولایت فقیہ، اللہ کی ولایت سے منسلک ہے لہٰذا ولی فقیہ کے اوامر کی اطاعت کرنا اللہ تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت کرنا ہے اور ولی فقیہ کے اوامر کی مخالفت کرنا احکامات الٰہی کی مخالفت کرنا ہے۔

ولی فقیہ کی حقیقی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ حکم الٰہی کے مطابق احکام جاری کرے اور اسی مفہوم کی طرف روایات میں اشارہ کیا گیا ہے:

امام جعفر صادق علیہ السلام کی سابقہ حدیث کے تسلسل میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"فَإِذَا حَكَمَ بِحُكْمِنَا فَلَمْ يَقْبَلْهُ مِنْهُ فَإِنَّمَا اسْتَخَفَّ بِحُكْمِ اللهِ وَعَلَيْنَا رَدَّ وَ الرَّادُّ عَلَيْنَا الرَّادُّ عَلَى اللهِ وَ هُوَ عَلَى حَدِّ الشِّرْكِ بِاللهِ"

چنانچہ اگر وہ ہمارے حکم کے مطابق حکم جاری کرے اور اس کا حکم نہ مانا جائے تو اس (حکم نہ ماننے والے) نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بے حیثیت سمجھا اور ہماری تردید کی اور جو ہماری تردید کرے وہ اللہ تعالیٰ کی تردید کرنے والا ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک قرار دینے کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

(کافی: ج ۱، ص ٦٧)

روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ولی فقیہ کے احکامات بھی اسی طرح مکمل طور پر حجت ہیں جیسا کہ معصومینؑ کے احکامات حجت ہیں۔ جیسا کہ امام زمانہؑ کے فرمان سے ظاہر ہے کہ:

"وہ میری طرف سے تم پر ایسے ہی حجت ہیں جس طرح میں تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت ہوں۔"

خلاصہ

1. ولایت فقیہ، امت اسلامی کی رہبری کا منصب ہے۔
2. زمانۂ غیبت امام عصر میں ولی فقیہ کی اطاعت امام معصومؑ کی اطاعت ہے اور امام معصومؑ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

سوالات

1. ولایت فقیہ سے کیا مراد ہے؟
2. ایسی دلیل ذکر کریں جو ولایت فقیہ پر دلالت کرتی ہو؟
3. وہ کونسی روایت ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ولی فقیہ کے تمام احکامات پر اسی طرح عمل کرنا حجت ہے جس طرح معصومینؑ کے احکامات پر عمل کرنا حجت ہے؟

مطالعہ کیلئے

مکاشفہ

ایک دفعہ عبد الحسین برونسی نے جنگ کا ایک یادگار واقعہ میرے لئے بیان کرتے ہوئے کہا ہم لوگ اسلحہ خانہ میں سخت مصروف عمل تھے مخصوص ڈبوں میں گولہ بارود رکھ کران کو سیل کر رہے تھے۔ کام کے دوران میں نے ایک باحجاب خاتون کو دیکھا جو سیاہ برقعہ اوڑھے ہوئے تھیں اور ہماری طرح گولہ بارود ڈبوں میں بند کر رہی تھیں میں نے سوچا کہ یقیناً ان خواتین میں سے ہیں جو محاذ پر آتی ہیں۔ میں بالکل متوجہ نہیں تھا کہ خواتین کا اس طرف آنا ممنوع ہے۔ میں نے فوجیوں کی طرف دیکھا سب کام میں اسی طرح مصروف تھے کہ گویا ان محترمہ خاتون کو دیکھ ہی نہ رہے ہوں۔ میں سخت تعجب میں مبتلا تھا معاملہ غیر عادی لگ رہا تھا میں تجسس کی وجہ سے جاننا چاہتا تھا کہ حقیقت کیا ہے میں نزدیک آیا ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے گلا صاف کرنے والی آواز نکالی اور بڑی احتیاط سے کہا محترمہ! جہاں ہم مرد موجود ہیں آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا چہرہ میری طرف نہ تھا مکمل طور پر کھڑی ہوگئیں اور فرمایا:

آیا آپ میرے بھائی کی راہ میں زحمت نہیں اٹھا رہے؟ اچانک میرے ذہن میں امام حسین علیہ السلام کا خیال آیا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے خداوند کے لطف و کرم سے میں سمجھ گیا کہ مکاشفہ کی حقیقت کیا ہے؟ میں بے اختیار ہو چکا تھا اور سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں؟ بی بی سلام اللہ علیہا نے اسی حالت میں کہ ان کا چہرہ دوسری طرف تھا فرمایا: جو کوئی ہمارا مددگار ہو ہم بھی ضرور اس کی مدد کرتے ہیں۔" (از کتاب خاک ہای نرم کوشک)

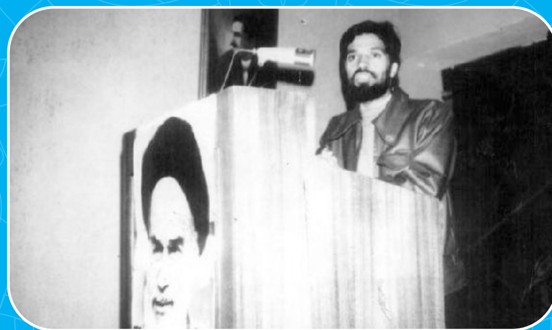

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

اطاعتِ ولایت

جن ایام میں ڈاکٹر شہید محمد علی نقویؒ سرکاری ملازمت سے فارغ ہوئے ان دنوں عراق ایران جنگ عروج پر تھی۔ ایران، عراق پر آخری ضرب لگانے کے لئے اپنے تمام وسائل استعمال کر رہا تھا۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ امام خمینی رضوان اللہ علیہ نے امام زمانہؑ کی سرزمین سے "صدائے ہل من ناصر" ان الفاظ میں بلند کی "ہر کس کہ می تواند باید جبہ برود" "جو شخص جنگ کی طاقت رکھتا ہے وہ محاذ پر جائے۔ نائب امام اور ولی فقیہ کی یہ صدا دنیا بھر میں گونجی تو پاکستان میں ڈاکٹر محمد علی نقویؒ نے اسے کربلا کی صدائے استغاثہ سمجھا اور محاذ پر پہنچ گئے۔ آپؒ نے زخمی مجاہدین کی خدمت اس انداز میں کی کہ آپ "ڈاکٹر پریشان" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ایرانی ڈاکٹر آٹھ گھنٹے جب کہ ڈاکٹر شہید محمد علی نقویؒ سولہ گھنٹے زخمیوں کے زخموں اور تکالیف کا علاج کرتے۔ چشم دید گواہوں کے بقول کہ ڈاکٹر صاحب اپنی ڈیوٹی کے دوران انتہائی کم سوتے اور کم کھاتے جب آپ سے آرام کرنے کو کہا جاتا تو آپ جواباً کہتے "میں خدمت کرنے آیا ہوں آرام کرنے نہیں۔"

تیسرا سبق

نجاسات اور ان کے احکام

- نجاسات کا حکم کیا ہے؟
- نجاسات کتنی ہیں؟
- نجاست کیسے دوسری شئے تک منتقل ہوتی ہے؟

نجاسات کا حکم:

شریعت اسلامی نے کچھ چیزوں کو نجس اور ناپاک قرار دیا ہے۔نجاسات کا کھانا پینا حرام ہے۔اور نماز کے دوران واجب ہے کہ بدن اور لباس ان نجاسات سے پاک ہو۔چنانچہ پہلے ہمیں نجاسات کی اقسام سے آگاہ ہونا چاہیے۔اس کے بعد ہم ان سے پاک ہونے کے طریقے سے آگاہی حاصل کریں گے۔نجاسات درج ذیل ہیں:

۱،۲: پیشاب و پاخانہ:

انسان اور خون جہندہ رکھنے والے ایسے حیوان جن کا گوشت کھانا حرام ہو ان کا پیشاب و پاخانہ نجس ہوتا ہے۔جیسے خرگوش، بلی، درندے، جنگلی چوہے۔چونکہ یہ خون جہندہ رکھنے والے حیوانات ہیں یعنی اگر ان جانوروں کو ذبح کیا جائے تو ان کے بدن سے خون دھار مار کر تیزی سے نکلتا ہے اور ان کا گوشت کھانا بھی حرام ہے۔لہذا ان کا پیشاب و پاخانہ نجس ہے۔

جبکہ ایسے حیوانات جو خون جہندہ نہیں رکھتے، یعنی ذبح کرتے وقت ان کا خون دھار مار کر نہیں نکلتا جیسے مچھلی، سانپ اور چھوٹے کیڑے مکوڑے وغیرہ ان کا پیشاب و پاخانہ پاک ہے۔

اور اسی طرح وہ حیوان کہ جو خون جہندہ رکھتے ہیں لیکن ان کا گوشت حلال اور شرعی طور پر کھایا جاتا ہے، جیسے اونٹ، بھیڑ، بکریاں اور مرغ وغیرہ ان کا پیشاب و پاخانہ بھی پاک ہے۔

۳،۴: خون و منی:

خون جہندہ رکھنے والے حیوان کا خون اور منی نجس ہیں خواہ اس کا گوشت حلال ہو یا حرام ہو۔لہذا خرگوش، بلی، چوہے، یا

اونٹ، بھیڑ اور مرغ کے خون اور منی کو نجس ہیں اور مچھلی، سانپ اور چھوٹے حشرات وغیرہ کا خون اور منی پاک ہے۔ ذبیحہ کے بدن میں باقی رہ جانے والا خون پاک ہے چنانچہ اگر گائے ذبح کی جائے اور اس کے بدن میں سے معمول کے مطابق خون نکل جائے تو باقی بچ جانے والا خون پاک ہوگا۔

۵: مردار:

یہ ایسا حیوان ہوتا ہے جسے شرعی طریقے کے مطابق ذبح نہ کیا گیا ہو چنانچہ اگر یہ خون جہندہ رکھنے والے حیوان کا بدن ہو تو نجس ہے خواہ اس کا گوشت حلال ہو یا حرام۔ البتہ بال، ناخن، اون، اونٹ کے بال، دانت اور سینگ وغیرہ جیسے اجزاء کہ جو بے روح ہیں وہ نجاست کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لیے مردار کے ان بے روح اعضاء پر نجاسات کا حکم نہیں لگایا جاتا، بلکہ ان اجزاء کے نجس ہونے کا حکم ہے جن میں روح موجود ہوتی ہے جیسے گوشت، چمڑا، آنتیں اور پٹھے وغیرہ۔

اسلامی ممالک سے درآمد کیا جانے والا گوشت اور چمڑا پاک ہے اور اس کا کھانا جائز اور نماز میں چمڑے کی اشیاء کے استعمال سے اجتناب ضروری نہیں۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مسلمان نے ان اشیاء کو کافر سے بغیر تحقیق کیے خریدا ہے تو اس صورت میں احتیاط واجب ہے کہ ان سے پرہیز کریں۔ البتہ غیر مسلم ممالک سے درآمد کیے جانے والا گوشت اور چمڑے کا استعمال جائز نہیں اور اس چمڑے کے ساتھ نماز بھی صحیح نہیں۔

۶،۷: خشکی پر رہنے والا کتا اور خنزیر:

یہ دونوں اپنے تمام اجزاء سمیت نجس ہیں خواہ وہ اجزاء بے روح ہوں یا روح دار۔

۸: نشہ آور مائع:

یہ نجس ہیں جیسے شراب اور دوسری تمام الکحل جو دراصل مائع حالت میں ہوتی ہیں۔ البتہ ایسی نشہ آور شئے جو اصل میں جامد ہو جیسے بھنگ وہ پاک ہیں لیکن اس کا کھانا پینا جائز نہیں ہے۔

۹: فقاع:

جو کی شراب

۱۰: کافر:

کافر وہ ہے، جو وجود الٰہی کا منکر ہو یا مشرک ہو، جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود مانتا ہو جیسے بتوں وغیرہ کو، اس حکم میں ناصبی بھی شامل ہیں جو اہلبیتؑ سے بغض رکھتے ہیں اور اعلانیہ ان سے دشمنی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور وہ غالی بھی اس حکم میں شامل ہیں جو اولیاء اللہ انبیاء اور آئمہ علیہم السلام کو خدا کے رتبہ پر مانتے ہیں۔ جیسا کہ امیر المومنینؑ سے روایت ہے کہ:

"هَلَكَ فِيَّ رَجُلَانِ مُحِبٌّ غَالٍ وَ مُبْغِضٌ قَالٍ"

''میرے بارے میں دو طرح کے لوگ ہلاک ہوں گے محبت میں حد سے گزر جانے والا اور اعلانیہ دشمنی

کااظہار کرنے والا۔"(نہج البلاغہ،حکمت نمبر ۱۱۴)

ضروریات دِین میں سے کسی ایک کاانکار کرنے والابھی کافر کے حکم میں ہے جیسے کوئی نماز،روزہ یاحج کے وجوب کامنکر ہو۔جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہوکہ اس طرح کرنے سے وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پرالزام دے رہاہے یانبی کریمؐ کی تکذیب کررہاہے۔

نجاست کیسے منتقل ہوتی ہیں؟

ایسی اشیاء جوان نجاسات سے چھوئیں اس وقت تک نجس نہیں ہوتیں جب تک نجاست ان میں اپنااثر ظاہر نہ کردیں یعنی نجاست ان اشیاء میں سرایت نہ کرجائے اس کیلئے کسی ایک شئے کاتر ہوناضروری ہےاوراگرکوئی خشک نجس شئے خشک پاک شئے سے لگے توپاک چیز نجس نہیں ہوگی۔

خلاصہ

- نماز کیلئے ضروری ہے کہ نجاست سے بچاجائےاورکھانے پینے میں بھی اس سے اجتناب ضروری ہے۔

نجاسات درج ذیل ہیں:

- خون جہندہ رکھنے والے ایسے جانورکاپیشاب،پاخانہ نجس ہے جس کاگوشت کھاناحرام ہو۔
- خون جہندہ رکھنے والے جانورکاخون،منی اورمردارنجس ہے خواہ اس کاگوشت کھاناحلال ہویاحرام۔
- بیئر(جوکی شراب)اورنشہ آورمائع اشیاء۔
- کافراورخشکی پررہنے والاکتااورخنزیر۔

کسی چیز سے نجاست لگنے سے وہ شئے اس وقت تک نجس نہیں ہوتی جب تک اس میں رطوبت سرایت نہ کرجائے۔

سوالات

۱. کونسے ایسے کام ہیں جن میں نجاست سے اجتناب کرناواجب ہے؟
۲. مردارکی ہڈی پاک ہوتی ہے یانجس؟
۳. نجاست کیسے دوسری شئے میں منتقل ہوتی ہے؟

مطالعہ کیلئے

مجھے نیند آرہی ہے

لقمان حکیم کسی کے غلام تھے۔ ان کا مالک ایک اچھا انسان تھا اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا معتقد تھا۔ البتہ وہ بڑا مغرور تھا۔ ایک شام معمول کے مطابق سب سو گئے جب آخر شب کا وقت ہوا اور لقمان نماز ِشب ادا کرنے کیلئے اٹھے تو انہیں اپنے مالک کے اُٹھنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے جو اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود ماننے کا مدعی تھا۔ لقمان کو بڑا تعجب ہوا آپ اس کے پاس گئے اور اس سے بولے اے میرے محترم مالک، نیند سے بیدار ہوں تاکہ ہم مل کر نماز ِشب پڑھیں، تاکہ اجر وثواب الٰہی کے مستحق قرار پائیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ سبوح و قدوس کی تسبیح پڑھنے میں مشغول ہے۔ میرے آقا نماز پڑھنے کیلئے بیدار ہو جائیے! اس نے جواب دیا مجھے نیند آرہی ہے تھوڑی دیر سونے دو میں جلد اُٹھ جاؤں گا، بے شک اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

جب اذانِ صبح کا وقت ہوا تو وہ دوبارہ اپنے مالک کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ اوّل وقت میں نماز پرھنے کیلئے اُٹھیئے۔ اس نے جواب دیا مجھے تھوڑی دیر سونے دو۔ میں جلد ہی اُٹھ جاؤں گا، اللہ تعالیٰ بڑا رحم کرنے والا ہے۔

طلوع آفتاب کے قریب لقمان تیسری مرتبہ اپنے آقا کے پاس یہ کہنے کیلئے گئے، میرے مالک بیدار ہو جائیے، صبح ہو چکی ہے، مرغ بانگ دے چکا اور سورج نکلنے میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ تو اس نے جواب دیا مجھے سونے دو۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحم کرنے والا ہے۔

سورج طلوع ہو گیا جبکہ مالک سب سے غافل گہری نیند میں ڈوبا رہا۔ اور اپنی نیند سے اس وقت بیدار ہوا جب سورج کی کرنوں کی تپش نے اس کی ٹانگوں کو گرمایا جو لحاف سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اُٹھنے کے بعد اس نے لقمان کو گندم دی اور کہا کہ فلاں کھیت میں جا کر یہ دانے وہاں (زمین میں) کاشت کردو۔

لقمان نے اپنے مالک کو سبق دینے کیلئے تمباکو کے بیج کاشت کر دیئے اور پلٹ کر اسے اس کام کی اطلاع دی تو آقا نے کہا کیا تم نے ایسا کر کے گناہ نہیں کیا؟ لقمان نے جواب دیا اللہ تعالیٰ بڑا رحم کرنے والا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ گندم تمباکو کی

نسبت زیادہ قیمتی ہے اس لیے میں نے تمباکو کاشت کیا ہے شاید ہمیں اس سے گندم حاصل ہو اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ان کے مالک نے کہا یہ آپ کو کس نے بتایا ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔خود آپ سے سیکھا ہے۔کیونکہ آپ شب بھر سوتے رہتے ہیں نماز صبح کیلئے بیدار نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ اللہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔اور یوں کہہ کر آپ جنت کی کامیابی، رضوان خدا اور حورعین کی اُمید رکھتے ہیں، جو روز قیامت میدان حشر میں آپ کو نصیب ہوگا! حالانکہ صورتحال اس کے برعکس ہے۔آپ جو بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔کیونکہ جو گندم کاشت کرتا ہے گندم کاٹتا ہے اور جو تمباکو کاشت کرتا ہے تمباکو کی فصل کاٹتا ہے۔اسی طرح دنیا بھی آخرت کی کھیتی ہے۔

(از کتاب: جہاد نفس، استاد آیت اللہ مظاہری)

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

خلق خدا کی خدمت اور انسانیت کا درد

ایک دفعہ ڈاکٹر محمد علی نقویؒ لاہور سے فیروز پور روڈ سے گزر رہے تھے، آپ کا ساتھی گاڑی بڑی تیزی سے چلا رہا تھا کہ ایسے میں دو ٹانگوں سے معذور ایک انسان اچانک آگے آگیا۔ ڈرائیور نے بریک لگائی اور گاڑی مشکل سے معذور کے قریب جارکی۔ آپ جلدی سے نیچے اترے معذور سے دست بستہ معافی مانگی اور اسے پکڑ کر سڑک کے دوسرے کنارے چھوڑ آئے، واپس لوٹے تو ڈرائیور ساتھی پر برس پڑے کہ انہوں نے گاڑی روک کر معذور کے گزر جانے کا انتظار کیوں نہیں کیا۔ آپ اس واقعہ پر دن بھر اداس رہے اور اپنے احباب کو ایسے لوگوں کا احساس دلواتے رہے۔ خدمت انسانی کا ایک واقعہ یوں بھی ملتا ہے کہ ایک شب آپ "مصباح القرآن ٹرسٹ" کے ہفتہ وار اجلاس میں شرکت کیلئے جارہے تھے دیکھا کہ ایک بڑھیا گندم کی بوری کے ساتھ کھڑی کسی مزدور کا انتظار کررہی تھی۔ آپ اماں کے پاس گئے، پریشانی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے ماجرا سنایا، آپ نے اپنے ساتھ والے دوست کو آستین چڑھانے کا اشارہ کیا اور ان کا بازو پکڑ کر مزدوروں کی طرح بوری اُٹھائی اور بڑھیا کے گھر (جو عمارت کی بلائی منزل پر تھا) کے کمرہ میں رکھ دی۔

مطہرات

- مطہرات (پاک کرنے والی اشیاء) کونسی ہیں؟
- نجاسات کیسے پاک ہوتی ہیں؟

ارشاد باری تعالیٰ:

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ

وہ تمہارے لیے آسمان سے پانی برساتا ہے تاکہ اس کے ذریعے تمہیں پاکیزگی عطا کر دے۔

(انفال/۱۱)

پچھلے سبق میں ہم نجاسات سے آشنا ہو چکے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ نماز کیلئے وران بدن اور لباس کا نجاست سے پاک ضروری ہے۔ اس سبق میں ہم مطہرات سے آشنائی حاصل کریں گے۔ مطہرات سے مراد وہ اشیاء ہیں جو نجس چیزوں کو پاک کرتی ہیں۔ مطہرات درج ذیل ہیں:

1۔ پانی:

خالص پانی کو شرعی اصطلاح میں آب مطلق کہتے ہیں، جبکہ پھلوں کے جوس اور شربت وغیرہ کو آب مضاف کہا جاتا ہے۔ نجاسات کو صرف آب مطلق یا خالص پانی پاک کرسکتا ہے۔ اور اس کی دو قسمیں ہیں؛ کُر پانی اور قلیل پانی۔

ا۔ کُر یا کثیر پانی:

کُر پانی جیسے دریا، کنویں اور چشمے کا پانی جو کہ زمین سے پھوٹ کر نکلتا ہے، اسی طرح بارش کا پانی جب وہ آسمان سے برس رہا ہو اور کسی جگہ پر ذخیرہ شدہ پانی جیسے ٹینکیوں کا پانی اگر وہ بڑی مقدار میں ہو یعنی کم از کم اس کا حجم ۴۳ مکعب بالشت ہو، جسے اصطلاح میں ایک کر کہتے ہیں (جو کہ ساڑھے تین بالشت لمبائی، اتنی ہی چوڑائی اور اتنی ہی گہرائی کا حجم ہے) کر پانی کہلائے گا۔

۲۔ قلیل پانی:

ایسا پانی جو کسی چھوٹی جگہ یا برتن میں ذخیرہ کیا گیا ہو یا وہ مقدار میں ایک کُر سے کم ہو۔

نوٹ: کُراور قلیل پانی میں فرق یہ ہے کہ

کُر ایسا پانی ہوتا ہے جس کی مقدار کم از کم اتنی ہو کہ اگر اسے ایک ایسے برتن میں ڈالا جائے جس کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی ہر ایک ساڑھے تین بالشت ہو، تو وہ بھر جائے اور اس کا وزن تقریباً 377 / 419 کلو گرام بنتا ہے۔ اس سے کم مقدار کو قلیل پانی شمار کرتے ہیں۔

کثیر پانی کا حکم یہ ہے کہ وہ خود بھی پاک ہے اور دوسری ناپاک شئے کو بھی پاک کر سکتا ہے۔ اور اگر اس میں کوئی نجاست جا پڑے تو جب تک نجاست کی وجہ سے اس کے رنگ، بو یا ذائقے میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو تو وہ پاک ہے۔ جبکہ قلیل پانی میں صرف ذرہ بھر نجاست پڑنے سے ہی وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔

۲۔ زمین:

یہ پاؤں کے نچلے حصے اور جوتے کو اتنی مقدار میں اس پر چلنے یا رگڑنے سے پاک کر دیتی ہے کہ اس سے عین نجاست دور ہو جائے۔ ان دونوں کو پاک کرنے کیلئے بذات خود زمین کا پاک ہونا اور اس نجاست کا زمین سے لگنا شرط ہے۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ وہ زمین پاک اور خشک ہو۔

۳۔ سورج:

یہ غیر منقولہ (جنہیں حرکت نہ دی جا سکتی ہو) اشیاء کو پاک کرتا ہے جیسے زمین، مکانات، گھروں کے دروازے، کھڑکیاں، درخت اور ان کے پھل جب تک درخت پر لگے ہوئے ہوں، گھاس اور سبزیاں کاٹنے سے پہلے اسی طرح چٹائیوں اور بانسوں سے بنے ہوئے شیڈ اور صحراؤں کو بھی پاک کر دیتا ہے۔

سورج مذکورہ چیزوں کو اس شرط پر پاک کرتا ہے کہ ان اشیاء پر نجاست کی رطوبت (تری) ہو جو سورج کی دُھوپ پڑنے پر خشک ہو اور عین نجاست کا زائل ہو جانا بھی شرط ہے۔

۴۔ استحالہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نجس ہو جانے والی شئی یا نجس شئے اپنی اصلی حالت بدل کر دوسری مختلف شئے کی شکل اختیار کر جائے مثلاً اگر نجس لکڑی کو جلا دیا جائے اور وہ راکھ بن جائے تو اس راکھ پر پاک ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔

۵۔ انتقال:

انسان یا حیوان کے بدن سے جوں یا مچھر وغیرہ جو خون چوستے ہیں، وہ خون منتقل ہو کر جب ان کے بدن کا جزء بن جائے تو پاک ہو جائے گا۔

۶۔ اسلام:

اگر کافر مسلمان ہو جائے تو وہ پاک ہو جائے گا۔

۷۔ تبعیت:

اگر میت کو تین واجب غسل دیے جا چکے ہوں تو اس کی تبعیت میں وہ تختہ بھی پاک ہو جائے گا جس پر مردے کو غسل دیا جاتا ہے۔اور اگر کافر اسلام قبول کرلے تو اس کا بیٹا (اولاد) بھی اپنے باپ کی پیروی کی وجہ سے پاک ہو جائے گا۔

۸۔ عین نجاست کا زائل ہونا:

اگر کسی حیوان کے بدن پر کوئی نجاست لگ جائے اور پھر خود بخود زائل ہوجائے تو اسے پانی سے دھو کر پاک کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ ازخود پاک ہوجائے گا۔ہر حیوان کے ظاہری بدن کی یہی حالت ہے۔اور اگر انسان کے منہ سے خون نکلے اور وہ اسے نگل لے یا تھوک دے تو اس کا منہ پانی سے دھوئے بغیر پاک ہوجائے گااور انسان کے بدن کے اندرونی حصے کی بھی یہی صورتحال ہے۔

۹۔ غائب ہونا:

اگر آپ کو اپنے ساتھی کے گھر کسی چیز کے نجس ہونے کا علم ہو پھر آپ کچھ مدت کیلئے وہاں سے چلے جائیں اور پھر دوبارہ اس سے ملنے کیلئے آئیں تو یہ احتمال رکھتے ہوئے کہ اس ساتھی نے اس چیز کو پاک کرلیا ہوگا آپ اس شئے پر پاک ہونے کا حکم لگائیں گے۔یا آپ کا ساتھی کہیں چلا جائے اور آپ اس کے لباس کو استعمال کرنا چاہیں کہ جو پہلے نجس تھا اور آپ کا دوست پاکیزگی اور طہارت کا خیال رکھنے والا تھا تو آپ اس لباس کو پر پاک ہونے کا حکم لگائیں گے۔

خلاصہ

۱ پانی بذات خود پاک ہے۔اور دوسری نجس چیزوں کو پاک کر دیتا ہے۔اس کی دو قسمیں ہیں:

کُر؛ کُر ایسا پانی ہوتا ہے جس کی مقدار کم از کم اتنی ہو کہ اگر اسے ایک ایسے برتن میں ڈالا جائے جس کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی ہر ایک ساڑھے تین بالشت ہو، تو وہ بھر جائے اور اس کا وزن تقریباً 377/ 419 کلو گرام بنتا ہے۔ کر پانی میں نجاست شامل ہونے سے جب تک نجاست کے اوصاف کی وجہ سے اس کا رنگ، بو یا ذائقہ تبدیل نہ ہو نجس نہیں ہوتا۔

قلیل؛ کر سے کم مقدار کو قلیل پانی شمار کرتے ہیں یہ پانی ذرا سی نجاست سے ملنے کی صورت میں نجس ہو جاتا ہے۔

۲ زمین پاؤں کے نچلے حصے اور جوتے کے تلوے کو پاک کر دیتی ہے اگر نجاست زائل ہو جائے تو۔

۳ سورج: زمین پر موجود غیر منقولہ اشیاء کو پاک کرتا ہے۔

۴ اسلام، کافر کو پاک کر دیتا ہے اور اس کی تبعیت میں اس کا بیٹا بھی پاک ہو جاتا ہے۔

۵ حیوان کے ظاہر اور انسان کے باطن سے عین نجاست زائل ہو جائے تو پاک ہونے کیلئے کافی ہے۔

۶ استحالہ، انتقال اور غائب ہونا مطہرات میں سے ہیں۔

سوالات

۱ پاک پانی کی اقسام کونسی ہیں؟

۲ زمین کے ذریعے پاک کرنے کی شرائط کیا ہیں؟

۳ مطہرات میں ”غائب ہونے“ کا مطلب کیا ہے؟

مطالعہ کیلئے

امام سجاد علیہ السلام کا فقراء کی خبر گیری کرنا

امام زین العابدینؑ کے پاس کوئی سائل اور فقیر آتا تو آپؑ اسے یہ کہہ کر خطاب فرماتے: ''خوش آمدید! اے آخرت کی طرف میرا زادِ راہ لے کر جانے والے''۔ آپؑ اکثر اوقات صدقات دیا کرتے اور دوسروں کو بھی صدقہ دینے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ آپؑ رات کی تاریکی میں لوگوں تک اس طرح صدقات پہنچاتے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہ ہو پاتا کہ کون انہیں دے رہا ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ آپؑ اہل مدینہ کے ایک سو خاندانوں کی اس طرح کفالت کیا کرتے تھے کہ انہیں یہ پتہ نہ چلتا کہ کون ان کو صدقات دے جاتا ہے۔ جب امامؑ کی وفات ہوئی تو انہیں اس بات کا علم ہوا۔

ایک روایت میں ہے کہ آپؑ رات کے وقت گندم کی بوری اپنی پیٹھ پر لاد کر لے جاتے تھے اور اسے صدقہ کر دیا کرتے تھے اور اس وقت یہ الفاظ آپؑ کی زبان اقدس پر جاری ہوتے: ''پوشیدہ طور پر صدقہ دینے سے ربّ کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے''۔

ایک روایت میں ہے کہ اہل مدینہ کہا کرتے تھے: ''ہمیں پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات ملتی رہیں یہاں تک کہ علی ابن الحسینؑ وفات پاگئے'' (تذکرۃ الخواص۔ص ۲۹۴)۔ اسی طرح ایک اور شخص نے سعید ابن مسیب سے کسی آدمی کا نام لے کر کہا کہ میں نے فلاں آدمی سے زیادہ متقی و پرہیزگار انسان نہیں دیکھا تو سعید نے اس سے پوچھا: کیا تم نے علی ابن الحسینؑ کو نہیں دیکھا؟ اس نے کہا: نہیں۔ تو وہ بولے: میں نے کسی کو علی ابن الحسینؑ سے زیادہ متقی و پرہیزگار نہیں دیکھا۔

ابو حازم کہتے ہیں:

''میں نے کسی ہاشمی کو علی ابن الحسینؑ سے زیادہ متقی و پرہیزگار نہیں دیکھا۔

جناب طاؤس نے بیان کیا کہ:

میں نے علی ابن الحسینؑ کو حجر اسود کے پاس سجدہ کی حالت میں دیکھا تو میں نے سوچا کہ یہ اہل بیتؑ کا ایک مرد صالح ہے مجھے ان کی مناجات ضرور سننا چاہیے۔ چنانچہ میں نے کان لگا کر سنا تو آپؑ کی زبان پر درج ذیل الفاظ جاری تھے:

''تیرا ایک ادنیٰ سا بندہ تیرے صحن میں ہے تیرا مسکین بندہ تیری بارگاہ میں حاضر ہے تیرا سوالی تیرے حضور میں ہے تیرا محتاج و فقیر بندہ تیری بارگاہ میں حاضر ہے''

جناب طاؤوس نے بیان کیا:

''بخدا میں جب بھی کسی مصیبت میں گرفتار ہوا تو میں نے ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگی تو اللہ نے وہ مصیبت ٹال دی''۔

آپؑ شب و روز میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔

ایک روز آپؑ گھر سے نکلے تو ایک آدمی سے ملاقات ہوئی جس نے آپؑ کو گالی دی۔ آپؑ کے دوست اور غلام اس سے انتقام لینے کیلئے آگے بڑھے تو امام علی زین العابدینؑ نے ان سے فرمایا: ٹھہرو، پھر آپؑ اس آدمی کے قریب آئے اور اس سے فرمایا: کس چیز نے آپ کو ہم سے دور کیا ہوا ہے؟ کیا آپ کی کوئی حاجت ہے جسے ہم پورا کرسکیں؟ یہ سُن کر وہ آدمی شرمندہ ہوگیا آپؑ نے اپنے اوپر سے جبہ اُتارا اور اسے ہدیہ کیا اور اسے ایک ہزار درھم دینے کا بھی حکم دیا اس کرم کو دیکھ کر وہ آدمی ان الفاظ میں گویا ہوا ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؑ آلِ رسولؐ ہیں۔'' (کشف الغمۃ۔ج،۲ص ۲۹۲)

وضو

- مَیں کیسے وضو کروں؟
- میرا وضو کیسے صحیح ہوگا؟
- مَیں وضو کو کیسے باقی رکھوں؟

مقدمہ

نماز کے صحیح ہونے کے لئے وضو کرنا ایک بنیادی شرط ہے۔ اس کے علاوہ دنیا و آخرت میں اس کے نورانی اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث کے مطابق، جب وضو کرنے والا اپنے چہرے پر پانی ڈالتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو روز قیامت روشن کر دے گا کہ جب کچھ چہرے روشن اور باقی چہرے تاریک اور سیاہ ہوں گے۔ پھر جب وہ اپنے ہاتھ دھوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی بیڑیاں حرام کر دیتا ہے، جب وہ اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے، جب وہ اپنے پاؤں کا مسح کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں قیامت کے دن اسے پُل صراط سے آسانی سے گزار دے گا کہ جس دن لوگوں کے قدم ڈگمگا رہے ہوں گے (الوسائل۔ج ۱ص ۳۷۸)

مَیں کیسے وضو کروں؟

وضو میں دو اعضاء دھوئے جاتے ہیں اور دو کا مسح کیا جاتا ہے: چہرہ اور دونوں ہاتھ (کہنیوں تک) دھونا، سر اور پاؤں کا مسح کرنا۔

وضو درج ذیل طریقے سے کیا جاتا ہے:

ہم اپنے دل میں اس طرح وضو کی نیت کرتے ہوئے ابتداء کرتے ہیں کہ مَیں وضو کرتا ہوں واجب قربۃً الی اللہ

پھر ہم پیشانی پر بال اُگنے کی جگہ سے لے کر تھوڑی کی نوک تک اپنا چہرہ دھوتے ہیں۔ البتہ چہرے کو اوپر سے نیچے کی جانب اس طرح دھویا جائے گا کہ چہرے کے تمام مقامات پر پانی پہنچ جائے۔

اس کے بعد ہم دونوں ہاتھ دھوتے ہیں، پہلے دایاں ہاتھ کہنی سے لے کر اُنگلیوں کے سروں تک دھوتے ہیں اور پھر اسی

طرح بایاں ہاتھ دھوتے ہیں ۔البتہ ہم اس میں کہنی پر پانی ڈالتے ہیں اور اُنگلیوں کے سروں پر ختم کرتے ہیں ۔اس کے بعد ہم سر کا مسح کرنے کیلئے ہتھیلی پر موجود تری سے سر کے سامنے والے حصے کا مسح کرتے ہیں ۔سر کے اگلے حصے پر موجود چھوٹے بالوں پر مسح کرنا چاہیے البتہ بال اگر زیادہ بڑے ہوں کہ سر کے ایک طرف کے بال دوسری طرف تک پہنچتے ہوں تو اس صورت میں بال ہٹا کر سر کی جلد پر مسح کرنا ہوگا۔

اس کے بعد ہم دونوں پاؤں کا مسح کرنے کیلئے دائیں ہاتھ پر موجود تری سے دائیں پاؤں کے ظاہری حصے کا اور بائیں ہاتھ کی تری سے بائیں پاؤں کا مسح کرتے ہیں ۔لیکن ہم انگلیوں کے سروں سے اوپر کی جانب پاؤں اور پنڈلی کے جوڑ تک یا پاؤں میں اُبھری ہوئی جگہ ٹخنوں تک مسح کرتے ہیں ۔خیال رہے کہ سر اور پاؤں کا مسح کرتے ہوئے ہاتھ کو حرکت دینا واجب ہے جبکہ اس کے برعکس (سر اور پاؤں کو ہلانا) صحیح نہیں ہے ۔

میرا وضو کیسے صحیح ہوگا؟

صحیح وضو کرنے کیلئے درج ذیل امور پر توجہ کی ضرورت ہے:

۱۔ پاک پانی سے وضو کریں۔

۲۔ مطلق پانی سے وضو کریں، نمک یا چینی ملے ہوئے یا عرق گلاب وغیرہ سے وضو نہیں ہوتا۔

۳۔ مباح پانی سے وضو کریں، غصب شدہ پانی سے وضو نہ کریں۔

۴۔ وضو شروع کرنے سے پہلے اعضائے وضو کو پاک کرلیں۔

۵۔ جلد تک پانی پہنچنے سے رکاوٹ بننے والی تمام اشیاء مثلاً انگوٹھی اور گھڑی وغیرہ کو اُتارلیں۔

۶۔ یہ اچھی طرح یقین کرلیں کہ پانی استعمال کرنے سے کوئی مرض لاحق نہ ہوتا ہو۔

۷۔ یہ یقین حاصل کرلیں کہ وضو کرنے کے علاوہ پینے اور دوسرے ضروری امور میں استعمال کرنے کیلئے کافی مقدار میں پانی دستیاب ہو۔

۸۔ خود وضو کریں (یعنی اعضائے وضو پر خود پانی پہنچائیں، لوٹے وغیرہ سے پانی ہاتھوں میں ڈلوانے کے لیئے مدد لینے میں حرج نہیں ہے)

۹۔ وضو کیلئے بیان کردہ ترتیب کے خلاف وضو نہ کریں۔

۱۰۔ اعضائے وضو کو دھوتے اور مسح کرنے کے دوران اتنا زیادہ وقفہ نہ کریں کہ اعضائے وضو مسح کرنے سے پہلے خشک ہوجائیں۔

مَیں وضو کیسے باقی رکھوں؟

باطہارت رہنا مستحب عمل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ

بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔(سورہ بقرہ۔ ۲۲۲)

اس لئے اگر آپ کا وضو باطل ہو جائے تو فوراً دوبارہ وضو کریں تاکہ آپ باطہارت رہ سکیں۔

وضو کو باطل کرنے والے امور درج ذیل ہیں :

۱۔ پیشاب خارج ہونا؟

۲۔ پاخانہ خارج ہونا۔

۳۔ ریح خارج ہونا۔

۴۔ ایسی نیند آنا جس میں نہ کچھ سنائی دے اور نہ دکھائی دے۔

۵۔ جنون، بیہوشی اور نشہ طاری ہو جانا۔

۶۔ ایسے فعل کا سرزد ہونا جس سے غسل واجب ہو جائے مثلاً منی کا نکلنا۔

اگر مَیں وضو نہ کروں تو کیا ہوگا؟

اگر آپ وضو نہ کریں گے تو آپ کی نماز صحیح نہ ہوگی۔امام محمد باقرؑ نے فرمایا:

لَاصلاۃَ إِلَّا بِطَهُور

''طہارت کے بغیر نماز نہیں ہوتی''۔(وسائل الشیعہ۔ج ا ص ۲۲۲)

اسی طرح حج کے دوران خانہ کعبہ کا طواف بھی صحیح نہیں ہوتا۔اور اگر آپ باوضو نہ ہوں تو آپ پر قرآن کریم کی کتابت کو مسّ کرنا بھی حرام ہوگا۔اور اللہ تعالیٰ کے اسمائے مقدسہ اور مخصوص صفاتی ناموں کو مسّ کرنا بھی حرام ہے۔

اسی طرح احتیاط کی بناء پر بغیر وضو کے انبیائے کرامؑ اور آئمہ معصومینؑ اور حضرت زہراء(س) کے اسمائے گرامی کو مس کرنا بھی حرام ہے۔

خلاصہ

۱. وضو سے مراد چہرہ، دونوں ہاتھ کا دھونا، سر اور پاؤں کا مسح کرنا ہے۔

۲. وضو کے صحیح ہونے کی شرائط یہ ہیں کہ پانی پاک، مطلق اور مباح ہو، وضو کرنے سے پہلے اعضائے وضو پاک ہوں، اسی طرح وضو کے صحیح ہونے میں دوسری شرائط کے ساتھ ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اعضائے وضو تک پانی پہنچنے میں کوئی رکاوٹ، یا کوئی ایسی بیماری جو پانی کے استعمال میں مانع ہو موجود نہ ہو۔

۳. پیشاب، پاخانہ اور ریح خارج ہونے سے اور اسی طرح نیند آ جانے سے اور ہر وہ شئے جس سے عقل زائل ہو جائے وضو باطل ہو جاتا ہے۔

۴. بغیر وضو کے نماز پڑھنا جائز نہیں اور کتابت قرآن، اللہ تعالیٰ کے اسمائے مقدسہ، انبیاء و آئمہ معصومین علیہم السلام اور حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کے اسمائے گرامی کو مس کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

سوالات

۱. مطلق پانی کا مطلب کیا ہے؟

۲. افعالِ وضو ترتیب کے ساتھ بیان کریں؟

۳. جب مکلف کو اُونگھ آتی ہے تو اس کی آنکھ بند ہونے لگتی ہے لیکن اسے آوازیں آ رہی ہوتی ہیں۔ کیا یہ وضو باطل ہونے کیلئے کافی ہے؟ اور کیوں؟

مطالعہ کیلئے

مومن کی وضع وقطع (۱)

سرمنڈوانا اور ناخن تراشنا:

۱- رسول اکرمؐ نے سر کے کچھ حصّے کو منڈوانا اور کچھ حصّے کو ایسے ہی چھوڑ دینے سے منع فرمایا ہے۔ (جیسا کہ دورِ حاضر میں بعض لوگ کرتے ہیں) روایت کی گئی ہے کہ نبی پاکؐ کے پاس ایک بچہ کو لایا گیا تا کہ آپؐ اس کیلئے دعا فرمائیں۔ اس بچے کی چوٹیاں نکلی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے آپؐ نے اس کیلئے دعا کرنے سے انکار کر دیا اور اس کا سر مونڈ نے کا حکم دیا۔

۲- ہر ہفتہ میں ایک بار سر تراشنا مستحب ہے اور سر تراشنے کے بعد پانی سے دھونا مستحب ہے۔

۳- بچے کی پیدائش کے ساتویں روز اس کا سر منڈوانا اور اس کے بالوں کے وزن برابر چاندی صدقہ کرنا مستحب ہے۔

۴- جو شخص اپنا سر منڈوانا چاہے اسے پیشانی سے ہڈیوں کی طرف بال منڈوانا اور یہ کہنا چاہیے: " بِسۡمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ ص اللَّهُمَّ أَعۡطِنِي بِكُلِّ شَعۡرَةٍ نُورًا يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ " "شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہؐ کے آئین وشریعت پر ایمان رکھتے ہوئے دعا کرتا ہوں اے اللہ! روز قیامت ہر بال کے بدلے مجھے نور عطا فرما۔ جب فارغ ہو جائے تو یوں کہے " إِذَا فَرَغَ فَلۡيَقُلۡ اللَّهُمَّ زَيِّنِّي بِالتَّقۡوَى وَجَنِّبۡنِي الرَّدَى " اے اللہ! مجھے تقویٰ سے زینت عطا فرما اور خرابی سے محفوظ رکھ"۔

۵- تیز دھار آلے سے داڑھی منڈوانا حرام ہے۔

۶- مونچھیں کاٹنا مستحب ہے اور ان کو بڑھانا مکروہ ہے۔

۷- ہر روز جمعہ ناخن تراشنا مستحب ہے۔

لباس پہننے کے آداب:

۱- اُجلے اور صاف ستھرے لباس پہنیں کیونکہ اللہ تعالیٰ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔

۲- لباس پہنتے وقت بسم اللہ پڑھیں۔

۳- لباس اس قدر طویل نہ ہو کہ زمین پر گھسیٹتے رہیں اور آلودہ ہو جائے۔

۴۔فقیر ونادار معاشرے میں فاخرانہ لباس نہ پہنیں اور نہ تکبر کریں اور نہ دوسروں کی تحقیر کریں۔

۵-نیالباس پہنتے وقت یوں کہے:

"اللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ ثَوْبَ يُمْنٍ وَ تُقًى وَ بَرَكَةٍ اللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي فِيهِ حُسْنَ عِبَادَتِكَ وَ عَمَلًا بِطَاعَتِكَ وَ أَدَاءَ شُكْرِ نِعْمَتِكَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي كَسَانِي مَا أُوَارِي بِهِ عَوْرَتِي وَ أَتَجَمَّلُ بِهِ فِي النَّاسِ"

اے اللہ! اسے خوشحالی تقویٰ اور برکت کا لباس قرار دے،اے اللہ مجھے اس لباس میں اپنی بہترین عبادت کرنے،اپنی اطاعت اور اپنی نعمت پر شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما تمام تعریفیں اس اللہ کی ذات کیلئے ہیں جس نے مجھے ایسا لباس پہنایا جس کے ذریعہ سے میں اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرتا ہوں اور لوگوں میں زیب وزینت کرتا ہوں۔(کافی: ج۶ص ۴۵۸)

۶-جس شخص کے پاس چند متعدد لباس ہوں تو اسے چاہیے جس کے پاس لباس نہ ہوں اسے ان میں سے کچھ صدقہ کردے اس طرح اسے بڑا اجر وثواب ملے گا۔نبی پاکؐ سے روایت ہے کہ:"جس نے خود لباس زیب تن کیا جب کہ اس کے بھائی کے جسم پر لباس نہ ہوتو اس شخص کا ایمان ہی نہیں رہا۔ (مکارم الاخلاق)

غسل اور تیمم

- ہم پر غسل کرنا کب واجب ہوتا ہے؟
- ہم کیسے غسل کریں؟
- ہم پر تیمم کرنا کیوں واجب ہوتا ہے؟ نیز تیمم کیسے اور کس چیز سے کیا جاتا ہے؟

نجاست یا مادی ہوتی ہے یا معنوی۔ معنوی نجاست دو طرح کی ہوتی ہے یا تو اس نجاست کی وجہ سے وضو کرنا لازم ہوتا ہے جیسا کہ پچھلے سبق میں ہم بیان کر چکے ہیں، یا اس نجاست کی وجہ سے غسل کرنا لازم ہوتا ہے جیسے جنابت وغیرہ۔

اس بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

" إِذَا اغْتَسَلْتَ مِنَ الْجَنَابَةِ فَقُلِ اللَّهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِی وَ تَقَبَّلْ سَعْيِی وَ اجْعَلْ مَا عِنْدَكَ خَيْراً لِی اللَّهُمَّ اجْعَلْنِی مِنَ التَّوَّابِينَ وَ اجْعَلْنِی مِنَ الْمُتَطَهِّرِين "

''جب تم غسل جنابت کرو تو یوں کہو'' اے اللہ میرے دل کو پاکیزہ کر دے، میری کوشش (عمل) کو قبول فرما، اپنی بارگاہ سے میرے لئے خیر عطا فرما، اے اللہ مجھے توبہ کرنے والوں میں شامل فرما اور مجھے پاکیزگی حاصل کرنے والوں میں سے قرار دے۔'') وسائل الشیعہ۔ج ۲،ص ۲۵۴)

ہم پر غسل کب واجب ہوتا ہے؟

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انسان کے بالغ ہونے کی ایک علامت احتلام ہونا ہے جو کہ انسان سے منی کا خارج ہونا ہے۔ اس لیے جب منی خارج ہوتی ہے تو انسان مجنب ہو جاتا ہے اور جب وہ نماز پڑھنا چاہے تو اس پر غسل جنابت کرنا واجب ہو جاتا ہے اسی طرح دوسری عبادات کیلئے بھی غسل کرنا واجب ہے جن کیلئے طہارت شرط ہے۔

ہم غسل کیسے کریں؟

ہم اس طرح غسل کرنے کی نیت کرتے ہیں۔ ''میں غسل جنابت کرتا/کرتی ہوں واجب قربۃ الی اللہ۔

پھر ہم درج ذیل طریقے سے غسل شروع کرتے ہیں:

۱۔ سب سے پہلے ہم اپنے پورے سر اور گردن کو پانی سے دھوتے ہیں۔

۲۔ اس کے بعد ہم اپنے جسم کی دائیں جانب (کندھا، ٹانگ، بازو اور اس کا درمیانی حصہ) دھوتے ہیں۔

۳۔ اس کے بعد بعینہ اسی طرح بائیں حصے کو دھوتے ہیں۔

اس طرح کے غسل کو غسل ترتیبی کہا جاتا ہے۔

البتہ نیت کر کے ایک ہی مرتبہ پورے جسم کو پانی میں ڈبونے سے بھی غسل ہو جاتا ہے۔ یعنی بیک وقت پورا جسم پانی کے اندر ڈوب جائے۔ اسے غسل ارتماسی کہا جاتا ہے۔ اس کیلئے پانی کا اتنی مقدار میں ہونا ضروری ہے کہ جس میں پورا جسم ایک ہی دفعہ ڈوب جائے۔

غسل کے صحیح ہونے کی شرائط کیا ہیں؟

صحیح غسل کرنے کیلئے درج ذیل امور کا خیال رکھیں:

۱۔ پاک پانی سے غسل کریں۔

۲۔ مطلق پانی سے غسل کریں۔ یعنی عرقِ گلاب یا کافور ملے پانی سے غسل نہیں ہو سکتا۔

۳۔ مباح پانی سے غسل کریں، غصب شدہ پانی سے نہیں۔

۴۔ پانی کو بالوں کی جڑ تک پہنچائیں۔

۵۔ جسم کے چمڑے تک پانی پہنچنے سے رکاوٹ بننے والی ہر چیز کو اُتار دیں۔

۶۔ بذاتِ خود غسل کریں۔

اگر غسل نہ کیا جائے تو کیا حرج ہے؟

اگر ہم غسل جنابت نہ کریں تو نہ ہماری نماز صحیح ہوتی ہیں، نہ حج، نہ خانہ کعبہ کا طواف صحیح ہوتا ہے اور نہ ہی ماہ رمضان کے روزے اور ان کی قضا صحیح ہوتی ہے۔

اگر ہم غسل جنابت نہ کریں تو قرآن مجید کو مس کرنا حرام ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے مقدس اور مخصوص صفاتی اسماء کو مس کرنا حرام ہے۔

انبیاء کرامؑ اور آئمہ معصومینؑ کے اسمائے گرامی کو مس کرنا حرام ہے۔

مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ میں داخل ہونا اگرچہ گزرنے کیلئے ہی کیوں نہ ہو حرام ہے۔

مذکورہ دونوں مساجد کے علاوہ دوسری مساجد میں ٹھہرنا حرام ہے اور اگر وہاں سے گزرنے یا کسی چیز کو اُٹھانے کی غرض سے ہو تو جائز ہے۔

مسجد میں کوئی چیز رکھنا اگرچہ باہر کھڑے ہو کر ہی کیوں نہ ہو حرام ہے اور مساجد کے ساتھ آئمہ طاہرینؑ کے حرم مبارک بھی اس حکم میں شامل ہیں۔

واجب سجدہ والی چار سورتوں کا پڑھنا اگرچہ کچھ آیات ہی کیوں نہ ہوں، حرام ہے۔ یہ سورتیں درج ذیل ہیں:

اقراء (علق)، النجم، السجدہ، فصلت۔

تیمم

- تیمم کب واجب ہوتا ہے؟
- ہم تیمم کیسے کریں؟
- ہم کس چیز پر تیمم کریں؟

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

...... پھر تمہیں پانی میسر نہ آئے تو پاک مٹی سے تیمم کرو پھر اس سے تم اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرو، اللہ تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا بلکہ وہ تمہیں پاک اور تم پر اپنی نعمت مکمل کرنا چاہتا ہے شاید تم شکر کرو۔

(سورہ مائدہ/۶)

تیمم کب واجب ہوتا ہے؟

جب ہمیں وضو یا غسل کرنے کے لئے کافی مقدار میں پانی میسر نہ ہو، یا کسی مرض کی وجہ سے پانی کا استعمال مضر ہو، یا پانی استعمال کرنے کا وقت تنگ ہو تو ایسے حالات میں نماز ادا کرنے کے لئے تیمم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

ہم تیمم کیسے کریں؟

پہلا عمل: ہم تیمم کی نیت کریں گے جو یوں ہے: "میں وضو یا غسل کے بدلے میں تیمم کرتا/کرتی ہوں واجب قربۃً الی اللہ"

دوسرا: ہم ایک مرتبہ اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ماریں گے۔

تیسرا: ہم اپنی ہتھیلیوں کو پیشانی کے بال اُگنے کی جگہ سے لے کر دونوں بھنوؤں اور پھر ناک کے شروع والے حصے تک پھیریں (مسح کریں) گے۔ بہتر یہ ہے کہ بھنوؤں پر بھی ہاتھ پھیرا جائے۔

چوتھا: ہم دائیں ہاتھ کی پشت پر بائیں ہاتھ سے مسح کریں گے۔

پانچواں: بائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی پشت پر مسح کریں گے۔

ہم کس چیز پر تیمم کریں؟

زمین پر تیمم کرنا صحیح ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا

پاکیزہ مٹی پر تیمم کرو ۔(نساء:۴۳)

یعنی پاکیزہ زمین سے مراد مٹی، ریت، کنکر، سنگِ مرمر وغیرہ جیسی جو بھی شئی قدرتی طور پر زمین پر پائی جاتی ہے۔

مذکورہ اشیاء موجود نہ ہونے کی صورت میں ہم گرد وغبار اکٹھا کر کے اس سے تیمم کر سکتے ہیں۔

نوٹ: معدنیات، لکڑی، کپڑے، نمک، چونا اور جو قدرتی طور پر زمین کا حصہ نہ ہو ان پر تیمم کرنا صحیح نہیں۔

خلاصہ

غسل واجب، نماز اور دیگر عبادات کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ہے۔

غسل دو طرح سے کیا جا سکتا ہے:

ترتیبی: پہلے سر اور گردن پھر دائیں جانب پھر بائیں جانب کو دھویا جاتا ہے۔

ارتماسی: اس میں ایک ہی دفعہ تمام جسم کو پانی میں ڈبویا جاتا ہے۔

غسل صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ پانی پاک اور مباح ہو نیز اسے جسم کی جلد تک پہنچایا جائے۔

مجنب کیلئے قرآن کریم کے الفاظ، اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنہ، انبیاء کرامؑ، آئمہ معصومینؑ اور حضرت زہراؑ کے اسماء کو مس کرنا جائز نہیں۔ مساجد اور روضہ ہائے مقدسہ میں ٹھہرنا اور اسی طرح واجب سجدہ والی سورتوں کا پڑھنا حرام ہے۔

تیمم میں دونوں ہتھیلیوں کو پیشانی پر پھیرنا پھر بائیں ہاتھ کا دائیں ہاتھ کی پشت پر اور دائیں ہاتھ کا بائیں ہاتھ کی پشت پر پھیرنا ہوتا ہے۔ یہ سارا عمل ایک بار مٹی پر دونوں ہاتھ مارنے کے بعد سرانجام دیا جاتا ہے۔

سوالات

۱. غسل ترتیبی کیسے ہوتا ہے؟
۲. کیا غسل میں بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا واجب ہے؟
۳. اللہ تعالیٰ کے اس فرمان تو پاکیزہ مٹی پر تیمم کرلو میں پاکیزہ مٹی سے کیا مراد ہے؟

مطالعہ کیلئے

مومن کی وضع قطع (۲)

خوشبو لگانا مستحب ہے:

۱- انبیائے کرامؑ کی یہ سیرت رہی ہے کہ وہ خوشبو لگاتے تھے۔ چنانچہ ہمیں بھی ان کی پیروی میں خوشبو کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ روزِ جمعہ خوشبو لگانا، اسی طرح نماز پڑھنے اور مسجد میں داخل ہونے کے لئے خوشبو لگانا بھی ایسی سنت ہے جس پر بڑی تاکید کی گئی ہے۔ روایت میں ہے کہ: ''روزِ جمعہ سب سے اچھی خوشبو لگایا کرو۔''

امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے:

''لَا یَنْبَغِی لِلرَّجُلِ أَنْ یَدَعَ الطِّیبَ فِی کُلِّ یَوْمٍ فَإِنْ لَمْ یَقْدِرْ عَلَیْهِ فَیَوْمٌ وَیَوْمٌ لَا فَإِنْ لَمْ یَقْدِرْ فَفِی کُلِّ جُمُعَةٍ وَلَا یَدَعْ''

''انسان کو کسی روز بھی خوشبو لگانا ترک نہیں کرنا چاہیے۔ اگر روزانہ خوشبو میسر نہ ہو سکے تو ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن خوشبو لگائے۔ اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو کم از کم روزِ جمعہ خوشبو لگانا ترک نہ کرے۔''

(بحار الانوار: ج ۷۳، ص ۲۵۴)

۲- خوشبو خریدنے پر مال خرچ کرنا مستحب ہے۔ رسول کریمؐ کھانے کی نسبت خوشبو پر زیادہ مال خرچ کرتے تھے۔ آپؐ خوشبو اور مٹھائی یا حلوے کا تحفہ واپس نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اگر کسی مسلمان کو کسی شخص کی جانب سے ہدیہ میں خوشبو میسر آئے تو اسے واپس نہیں کرنا چاہیے۔

سماعہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ مَیں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا جو تحفہ میں ملنے والی خوشبو واپس کر دیتا تھا تو آپؑ نے فرمایا:

لَا یَنْبَغِی لَهُ أَنْ یَرُدَّ الْکَرَامَه

''اسے عزت افزائی سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔'' (بحار الانوار۔ جلد ۷۳، ص ۹۲)

۳- منہ کو عرقِ گلاب سے دھونا اور محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام پر درود پڑھنا مستحب ہے۔ نبی کریمؐ سے روایت ہے کہ:

إِنَّ مَاءَ الْوَرْدِ يَزِيدُ فِي مَاءِ الْوَجْهِ وَيَنْفِي الْفَقْرَ

عرقِ گلاب سے منہ دھونے سے خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے اور فقر وغربت دُور ہوتی ہے۔

(بحارالانوار۔ جلد ۷۳، ص ۹۵)

۴- عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے کپڑوں پر خوشبو لگا کر اس طرح گھر سے باہر نکلے کہ اجنبی اس کی خوشبو سونگھے۔

انگوٹھی پہننا مستحب ہے:

۱- عقیق، یاقوت اور فیروزہ جڑی ہوئی انگوٹھی پہننا مستحب ہے۔ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا:

''تَخَتَّمُوا بِالْعَقِيقِ فَإِنَّ جِبْرِيلَ ع أَتَانِي بِهِ مِنَ الْجَنَّةِ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ تَخَتَّمْ بِالْعَقِيقِ وَ مُرْ أُمَّتَكَ أَنْ يَتَخَتَّمُوا بِهِ''

''عقیق والی انگوٹھی پہنو کیونکہ جبرائیلؑ نے یہ انگوٹھی مجھے جنت سے لاکر دی ہے اور کہا، اے محمدؐ! عقیق والی انگوٹھی پہنو اور اپنی اُمت کو بھی عقیق والی انگوٹھی پہننے کا حکم دو''۔ (مکارم الاخلاق ص ۸۵)

۲- دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا مستحب ہے۔ البتہ انگشت شہادت اور درمیانی انگلی میں انگوٹھی نہیں پہننی چاہیے۔

۳- انگوٹھی پہننے کی دعا درج ذیل ہے:

''اللَّهُمَّ سَوِّمْنِي بِسِيمَاءِ الْإِيمَانِ وَ تَوِّجْنِي بِتَاجِ الْكَرَامَةِ وَ قَلِّدْنِي حَبْلَ الْإِسْلَامِ وَ لَا تَخْلَعْ رِبْقَةَ الْإِيمَانِ مِنْ عُنُقِي''

''اے اللہ! ایمان کی علامت میری پہچان بنا، مجھے عظمت کا تاج پہنا، ایمان کی رسّی سے مربوط رکھ اور میری گردن سے ایمان کا قلادہ نہ اُتار''۔ (مکارم الاخلاق ص ۸۷)

۴- مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں۔

۵- ایسی انگوٹھی پہننا مستحب ہے جس پر قرآنی آیات کا نقش کندہ ہو۔

۶- جس انگوٹھی پر ماشاء اللّٰہ ولا قوۃ الا باللّٰہ، استغفر اللّٰہ کا نقش بنا ہوا سے پہننا مستحب ہے۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا: عقیق والی انگوٹھی پہنا کرو، کیونکہ جب تک یہ انگوٹھی تمہارے ہاتھ میں ہوگی تمہیں کوئی غم نہ ہوگا۔ ''(مکارم الاخلاق ص ۸۶)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی روایت ہے:

التَّخَتُّمُ بِالْيَاقُوتِ يَنْفِي الْفَقْرَ وَ مَنْ تَخَتَّمَ بِالْعَقِيقِ يُوشِكُ أَنْ يُقْضَى لَهُ بِالْحُسْنَى

''یاقوت والی انگوٹھی پہننے سے غربت اور فقر دُور ہوتا ہے اور جو شخص عقیق والی انگوٹھی پہنے گا اس کی نیکی میں اضافہ ہوگا''۔ (مکارم الاخلاق ص ۸۷)

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

انس و محبت

کنونشن کے پروگرام ختم ہوتے تو چاک و چوبند اور کانوں میں لہجے کی مٹھاس کا رس گھولنے والا سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی برادران کے حلقوں میں آتا۔ ہر ایک کو گلے لگاتا، ان کی تکالیف دریافت کرتا، ان کے تاثرات لکھتا، مشکلات پر ان سے معذرت چاہتا اور ان کی خدمت کے لئے رواں ہو جاتا۔ دن بھر وہ تنظیمی امور بجالاتا، رات کو خورد و نوش کے اہتمام کرتا اور اگر اسے وقت مل جاتا تو وہ برتن تک صاف کرتا۔

مقدماتِ نماز

- اوقاتِ نماز اور رکعات نماز کتنی ہیں؟
- نمازی کا لباس اور جگہ کیسی ہونی چاہیے؟
- قبلہ رُخ ہونا کیوں ضروری ہے؟

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"الصلاة عمود الدين و أنها أول ما يحاسب عليه العبد يوم القيامة من الأعمال و أول ما يسأل عنه العبد بعد المعرفة فإن قبلت قبل ما سواها وإن ردت رد ما سواها۔"

"نماز دین کا ستون ہے اور پہلا عمل جس کے بارے میں بندے سے سوال کیا جائے گا۔ وہ نماز ہے۔ اگر نماز قبول ہوگئی تو دوسرے اعمال قبول ہونے کا امکان ہے۔ اور اگر یہ رد کر دی گئی تو باقی اعمال بھی رد کیے جائیں گے۔" (امالی الصدوق:۶۴۱)

مقبول نماز:

صحیح نماز وہ ہوتی ہے جو تمام شرائط اور اس کے اجزاء کے ساتھ انجام پائے۔ مقبول نماز ایسی مکمل نماز ہے، جسے پورے خشوع و خضوع اور حضورِ قلب کے ساتھ ادا کیا جائے۔ انسان کی نماز اس صورت میں قبول ہوتی ہے جب وہ حضورِ قلب سے نماز ادا کرے۔ غفلت اور بھول چوک سے نماز پڑھے تو اس کی نماز پھٹے پرانے کپڑے کی طرح لپیٹ کر اس نمازی کے منہ پر دے ماری جاتی ہے۔ جبکہ حضور و خشوع قلب کے ساتھ ادا کی گئی نماز اگر قبول ہوگئی تو باقی اعمال بھی قبول ہو سکتے ہیں۔ ایسی ہی نماز مومن کیلئے (اپنے رب سے ملاقات) معراج ہے۔ اور اسی نماز کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ

"بے شک نماز بے حیائی اور برائی کے کاموں سے روکتی ہے۔" (عنکبوت:۴۵)

بہر حال اگر ہماری نماز کوّے کے ٹھونگے مارنے کی طرح جلدی جلدی ادا کی گئی ہو تو آخرت میں کسی درجہ پر اس کا اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے متعلق امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''إِنَّ الْعَبْدَ لَيُرْفَعُ لَهُ مِنْ صَلَاتِهِ نِصْفُهَا أَوْ ثُلُثُهَا أَوْ رُبُعُهَا أَوْ خُمُسُهَا فَمَا يُرْفَعُ لَهُ إِلَّا مَا أَقْبَلَ عليهِ بِقَلْبِهِ۔''

انسان کی نماز میں سے آدھا، تیسرا، چوتھا یا پانچواں حصہ اوپر جاتا ہے اور صرف وہی حصہ قبول ہوتا ہے جو اس نے توجہ سے ادا کیا ہو۔ (کافی: ج ۳ ص ۳۶۳)

اور نعوذ باللہ اگر ہم خضوع و خشوع کے ساتھ نماز ادا کرنے والوں سے پیچھے رہنے والوں میں سے ہوئے تو ہمارا کیا بنے گا؟ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا:

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ○ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ

تم کس وجہ سے دوزخ میں ہو؟ تو وہ کہیں گے ہم نماز ادا نہیں کرتے تھے ۔ (مدثر/ ۴۲، ۴۳)

مقدماتِ نماز:

ہماری نماز کے صحیح ہونے کیلئے اس میں درج ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ طہارت ۲۔ وقت ۳۔ مکمل شرعی لباس

۴۔ جگہ ۵۔ قبلہ رُخ ہونا

طہارت:

نماز کیلئے طہارت شرط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے شرعی تقاضے کے مطابق وضو، غسل یا تیمم کر رکھا ہو۔ اور یہ کہ اس کا بدن اور لباس پاک ہو۔

نماز کے اوقات اور تعداد رکعات:

ہر عاقل و بالغ مسلمان پر ہر روز پانچ نمازیں فرض ہیں۔ نماز فجر 2 رکعت، نماز ظہر 4 رکعت، نماز عصر 4 رکعت، نماز مغرب 3 رکعت اور نماز عشاء 4 رکعت۔

نماز فجر کا اوّل وقت طلوعِ فجر سے شروع ہو کر طلوعِ آفتاب تک ہے۔ نماز ظہر اور عصر کا وقت دوپہر کو زوال آفتاب سے شروع ہو کر غروبِ آفتاب تک رہتا ہے۔ نماز مغرب اور عشاء کا وقت غروبِ آفتاب (مشرق میں سرخی زائل ہونے کے) بعد سے لیکر آدھی رات تک ہوتا ہے۔

نوٹ: نماز وقت داخل ہونے سے پہلے ادا کرنا صحیح نہیں اور نماز کو اس کا وقت قضاء ہونے تک مؤخر کرنا بھی جائز نہیں

ہے۔اگر نماز کو اس کا وقت گزر جانے تک مؤخر کر دیا جائے تو اسے قضاء کی نیت سے بجا لانا واجب ہے۔

نماز گزار کے لباس کی شرائط:

نمازی پر فرض ہے کہ وہ ایسا لباس پہنے کہ جو دورانِ نماز اس کی شرم گاہ کو چھپا دے۔لباس کا پاک ہونا ضروری ہے یعنی اس پر کوئی نجاست نہ لگی ہوئی ہو۔لباس مباح ہو یعنی نمازی کی اپنی ملکیت ہو یا اسے استعمال کرنے کی اجازت حاصل ہو۔

اگر نمازی کا لباس جانور کی کھال سے بنا ہوا ہو تو اس کی دو شرائط ہیں:

۱۔ نمازی کا لباس ایسے جانور کی کھال سے بنایا گیا ہو جو حلال گوشت ہو۔

۲۔ یہ جانور اسلام کے شرعی طریقہ کے مطابق ذبح کیا گیا ہو۔

نمازی اگر مرد ہو تو اس کے لباس میں شرط یہ ہے کہ:

وہ سونے یا خالص ریشم سے بنا ہوا نہ ہو۔چنانچہ مرد کیلئے دورانِ نماز یا عام حالت میں بھی سونے یا خالص ریشم سے بنا ہوا لباس پہننا حرام ہے۔

نماز گزار کے مکان کی شرائط:

نماز کی جگہ کے لئے چند امور شرط ہیں:

۱۔ یہ کہ وہ مقام مباح ہو،اس لئے مسلمانوں کے ایسے گھروں میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔جن پر ان کے مالکان کی اجازت کے بغیر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔

۲۔ یہ کہ وہ جگہ ساکن ہو متحرک نہ ہو۔اس لئے کشتی،ہوائی جہاز میں نماز پڑھنا صحیح نہیں کیونکہ وہ ساکن نہیں ہوتے۔اگر نماز کا وقت تنگ ہو جائے تو ان میں بھی پڑھنے میں کوئی ہرج نہیں۔

۳۔ سجدہ کی جگہ نجس نہ ہو۔

قبلہ رُخ ہونا:

دورانِ نماز قبلہ رخ ہونا واجب ہے۔اسے استقبال کہا جاتا ہے۔قبلہ مکہ مکرمہ میں کعبہ شریف ہے۔اور اگر دورانِ نماز قبلہ کی سمت سے کافی مقدار میں رخ دوسری جانب ہو جائے تو نماز باطل ہے۔لیکن جان بوجھ کر ایسا نہ کیا جائے تو نماز باطل نہیں ہوتی۔

نماز شروع کرنے سے پہلے اذان و اقامت کہنا مستحب ہے۔

خلاصہ

- نماز کے صحیح ہونے میں نمازی کے بدن اور لباس کا پاک ہونا یعنی یہ کہ وہ اپنی شرعی ذمہ داری کے مطابق وضو یا غسل کیے ہوئے ہو۔ نماز صبح کا وقت طلوع فجر سے طلوعِ آفتاب تک ہوتا ہے۔ ظہرین کا وقت زوالِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک ہوتا ہے۔ مغربین کا وقت غروبِ شرعی سے نصف شب تک رہتا ہے۔
- نمازی کا لباس اس کی شرم گاہ کو چھپانے والا ہو، مباح ہو اور مرد نمازیوں کا لباس سونے یا خالص ریشم سے بنا ہوا نہ ہو۔
- نماز پڑھنے کی جگہ مباح اور ساکن ہو۔
- دورانِ نماز قبلہ کی طرف رُخ کرنا واجب ہے۔

سوالات

۱. کیا شرعی طریقے سے ذبح کی گئی لومڑی کی کھال میں نماز پڑھنا صحیح ہے اور کیوں؟
۲. نماز مغربین کا وقت کب شروع اور کب ختم ہوتا ہے؟
۳. بغیر مجبوری کے ہوائی جہاز میں نماز پڑھنا کیا حکم رکھتا ہے؟

مطالعہ کیلئے

حضورِ قلب

امام خمینیؒ فرماتے ہیں: نمازی کو چاہیے کہ اپنی پوری نماز کے تمام اعمال اور اذ کار حضور قلب سے انجام دے کیونکہ انسان کی اتنی ہی نماز قبول ہوگی جتنی وہ حضور قلب کے ساتھ انجام دے گا۔ حضور قلب سے مراد ایسی نماز ہے جسے توجہ کے ساتھ پڑھا جائے اور معبود حقیقی اللہ جل جلالہ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا احساس اور اس کی عظمت اور جلال کی ہیبت کو محسوس کرے اور اس کے سوا ہر ایک سے دل کو موڑ دے ۔ لہٰذا اس صورت میں وہ اپنے نفس کو کائنات کے عظیم مالک سے جب مخاطب اور مناجات کرتا ہوا پائے گا تو اس حالت کو شعوری طور پر حس کرنے سے اس کے دل میں خالق کائنات کی ہیبت بیٹھ جائے گی، اور ساتھ ہی اسے اپنے نفس کی اس کے حضور میں کی گئی کوتاہیوں کا احساس ہوگا تو خوف وخشیت اس کو گھیر لے گا۔ پھر جب وہ اس کی وسیع رحمت کو دیکھے گا تو اسے اس کی بارگاہ سے ثواب کے حصول کی اُمید پیدا ہوجائے گی۔ نتیجتاً اس پر خوف اور اُمید کی درمیانی کیفیت طاری ہوجائے گی اور یہی کامل بندوں کی صفت ہے اور اس کے لاتعداد درجات ہیں اور اس کے مراتب ،عبادت گزاروں کے بے شمار درجات کے تناسب سے لامحدود ہیں ۔

اسی طرح نماز کیلئے خضوع وخشوع ،اطمینان اور سکون ،اچھا لباس ،خوشبو اور نماز سے پہلے مسواک کرنا اور بال سنوارنا سزاوار اور مناسب ہے ۔ساتھ ہی نماز اس طرح پڑھی جائے جیسے الوداع کرنے والا وداع کرتا ہے، توبہ کی تجدید، گناہوں سے مغفرت اور استغفار اور اپنے پروردگار کے سامنے اس طرح عاجزی سے کھڑا ہونا جیسے فقیر غلام اپنے مولا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، نماز گزار کے افعال میں سے ہونا چاہیے ۔اور اسے اپنے اس قول اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) میں سچا ہونا چاہیے، نہ یہ کہ بول تو یہ رہا ہو مگر عبادت اپنی خواہشات کی کر رہا ہو اور مدد کسی اور سے مانگ رہا ہو۔ اسی طرح اسے نماز کی قبولیت میں موجود رکاوٹوں جن میں خود پسندی، حسد، تکبر، غیبت اور زکاۃ کا روکنا اور دیگر واجب حقوق کی عدم ادائیگی جو قبولیت نماز میں مانع ہیں، سے پرہیز کرنے کی پوری جدوجہد کرنی چاہیے ۔

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

حلف سے پاسداری

جب بطور مرکزی صدر ڈاکٹر محمد علی نقوی کو سٹیج پر لایا گیا تو آپ اشکبار تھے ۔سید امجد علی کاظمی رکن مشاورت نے آپ سے حلف لیا۔حلف کے دوران جب یہ جملے آئے کہ میں خدا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام زمانہؑ کے روبرو اقرار کرتا ہوں ۔تو آپ کی آواز گلے میں دب گئی اور آپ دیر تک سسکیاں لیتے رہے ۔آپ ایک دفعہ حلف لینے کے بعد تمام عمر اسی حلف پر قائم رہے ۔آپ اکثر فرمایا کرتے تھے "دوستو! بھائیو! حلف، عہدہ کے ایک سال کے لئے نہیں ہوتا بلکہ حلف کا تعلق زندگی سے ہوتا ہے ۔"

افعالِ نماز

- افعالِ نماز کیا ہیں؟
- ہم صحیح طریقہ سے نماز کیسے پڑھتے ہیں؟

افعالِ نماز:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

اے ایمان والو! رکوع کرو، سجدہ کرو اور اپنے ربّ کی عبادت کرو اور نیک عمل کرو کہ شاید اس طرح تم کامیاب ہو جاؤ ۔(سورہ حج/ ۷۷)

افعال نماز سے مراد وہ واجبات ہیں جن کا نماز کے دوران انجام دینا ضروری ہے ان کی تعداد گیارہ ہے اور یہ واجبات دو قسم کے ہیں ۔رکن اور غیر رکن

واجبات نماز: ۱) رکن ۲) غیر رکن

۱) **رکن:** ان کی تعداد پانچ ہے۔

۱۔نیت

۲۔تکبیرۃ الاحرام

۳۔قیام متصل بہ رکوع

۴۔رکوع

۵۔سجود

۲) **غیر رکن:** ان کی تعداد چھ ہے۔

۶۔قرأت

۷۔ذکر

۸۔تشہد

۹۔سلام

۱۰۔ترتیب

۱۱۔موالات

رکن نماز سے مراد ایسے واجبات ہیں کہ جن کو اگر جان بوجھ کر انجام نہ دیں یا بھولے سے انجام نہ دیں ہر دو صورتوں میں نماز باطل ہو جاتی ہے۔لیکن واجبات غیر رکن کو بھولے سے انجام نہ دیں تو نماز باطل نہیں ہوتی۔

◆ ہم صحیح نماز کیسے پڑھتے ہیں؟

نماز کو صحیح طور پر ادا کرنے کیلئے درج ذیل ارکان پر عمل کرنا ضروری ہے:

۱۔نیت کرنا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے دل میں یہ ارادہ کریں کہ مثلاً میں نماز فجر پڑھتا ہوں: قربۃً الی اللہ۔

۲۔تکبیرۃ الاحرام:

ہم نماز کو تکبیر (اللہ اکبر) کہہ کر شروع کرتے ہیں، اور اسے تکبیرۃ الاحرام کہا جاتا ہے۔اور واجب ہے کہ تکبیرۃ الاحرام کہتے وقت انسان سیدھا کھڑا ہو جبکہ رفع یدین کرنا یعنی ہاتھوں کو کانوں کے برابر اُٹھانا مستحب ہے۔

۳۔قرأت:

تکبیرۃ الاحرام کے بعد نماز کی پہلی اور دوسری رکعت میں سورہ الحمد اور کوئی دوسری سورہ مثلاً سورتوحید پڑھتے ہیں۔جبکہ نماز کی تیسری اور چوتھی رکعت میں ایک ایک مرتبہ سورہ حمد یا تسبیحات اربعہ پڑھی جاتی ہے۔تسبیحات میں درج ذیل الفاظ پڑھے جاتے ہیں:

''سُبْحَانَ اللهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَ اللهُ اَکْبر'' اسے تین مرتبہ دہرایا جاتا ہے جو کہ مستحب ہے۔

مردوں پر نماز ظہر و عصر میں بالاخفات (آہستگی سے) جبکہ نماز فجر، مغرب اور عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں بالجہر (بلند آواز سے) قرأت کرنا واجب ہے۔البتہ خواتین کیلئے تمام نمازوں میں آہستہ پڑھنا جائز ہے۔نامحرم کی غیر موجودگی میں وہ بھی فجر، مغرب اور عشاء بلند آواز سے قرأت کر سکتی ہیں۔

۴۔رکوع کرنا:

سورہ الحمد اور دوسری سورہ کی قرائت کے بعد رکوع کرنا واجب ہے۔رکوع کرنے کیلئے اس قدر جھکنا کہ دونوں ہاتھ گھٹنوں

تک پہنچ جائیں ضروری ہے، ہر رکعت میں ایک مرتبہ رکوع کرنا واجب ہے اور اس میں ذکر پڑھنا یعنی: سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیمِ وَ بِحَمْدِهِ کہنا واجب ہے۔

۵۔سجدہ:

رکوع میں ذکر کرنے کے بعد نمازی سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔اس کے بعد وہ اعضائے سجدہ کو زمین پر رکھ کر سجدہ کرتا ہے۔ اعضائے سجدہ سات ہیں: پیشانی، دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں کے انگوٹھے۔دونوں سجدوں کے درمیان ایک مرتبہ پرسکون ہو کر بیٹھنا ضروری ہے۔سجدے میں ذکر پڑھنا مثلاً: سُبْحَانَ رَبِّیَ الْأَعلیٰ وبحمده کہنا واجب ہے۔

ایسی جگہ جہاں پر سجدہ کرنے کیلئے پیشانی رکھتے ہیں وہ زمین کا قدرتی ٹکڑا (مٹی، ریت، پتھر اور کنکر وغیرہ ہو) یا وہ اُن نباتات میں سے ہو جنہیں کھایا یا لباس کے طور پر پہنا نہ جاتا ہو۔لہذا خس اور کپاس کے پتے پر سجدہ کرنا صحیح نہیں۔مقام سجدہ کا پاک ہونا بھی واجب ہے۔

۶۔تشہد:

نماز کی دوسری رکعت یا آخری رکعت کے دونوں سجدے ادا کرنے کے بعد اطمینان کی حالت میں دوزانو ہو کر بیٹھنا اور تشہد پڑھنا واجب ہے تشہد میں یہ ذکر پڑھا جاتا ہے:

"أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَ رَسُولُهُ اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّد"

۷۔سلام:

نماز کی آخری رکعت سے فارغ ہونے کے بعد سلام کہنا واجب ہے۔سلام کے جامع الفاظ یہ ہیں:

السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللهِ وَ بَرَكَاتُهُ السَّلَامُ عَلَىٰ عِبَادِ اللهِ الصَّالحين السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رحمةُ اللهِ وَ بَرَكَاتُهُ

رکوع سجود کرتے ہوئے اور تشہد و سلام پڑھتے ہوئے پرسکون حالت میں ہونا واجب ہے۔

افعال نماز کو ادا کرتے ہوئے اتنا زیادہ فاصلہ کرنا جائز نہیں (کہ لوگ کہیں کہ نماز نہیں پڑھ رہا) بلکہ افعال نماز کو ایک دوسرے کے بعد مسلسل ادا کیا جانا چاہیے، اصطلاحاً اسے موالات کہتے ہیں۔

افعال نماز کو بجالاتے ہوئے ترتیب کا خیال رکھنا واجب ہے۔اس لئے پہلے عمل کو بعد میں اور بعد والے عمل کو پہلے ادا کرنا جائز نہیں۔

دوسری رکعت میں قراءت اور رکوع کے درمیان دعائے قنوت پڑھنا مستحب ہے۔

نماز کے بعد تعقیبات پڑھنا مستحب ہے ان میں بہترین عمل تسبیح زہراءؑ پڑھنا ہے۔

خلاصہ

- نماز کے واجب اعمال مندرجہ ذیل ہیں:
- نیت،تکبیرۃ الاحرام،قیام،قراءت،ذکر،رکوع،سجود،تشہد،سلام،ترتیب اور پے در پے افعال نماز بجالانا۔

سوالات

۱. نماز میں ترتیب سے کیا مراد ہے؟
۲. کیا نماز فجر میں عورت پر بالجہر قرآت کرنا واجب ہے؟
۳. رکوع میں ذکر کرتے ہوئے سکون کی شرط عائد کی جاتی ہے اس سکون سے کیا مراد ہے؟

مطالعہ کیلئے

نمازِ غفیلہ

نمازغفیلہ کا پڑھنا مستحب ہے۔اسے نماز مغرب کے بعد ادا کیا جاتا ہے اور اسکا طریقہ یہ ہے کہ: پہلی رکعت میں سورہ الحمد کے بعد درج ذیل آیات پڑھی جاتی ہیں:

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (انبیاء:۸۷)

اور دوسری رکعت میں الحمد کے بعد

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (انعام:۵۹)

پھر جب یہ پڑھ لے تو ہاتھ اُٹھاتے ہوئے یوں کہے:

" اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ بِمَفَاتِحِ الْغَيْبِ الَّتِي لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا أَنْتَ أَنْ تُصَلِّيَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ وَ أَنْ تَفْعَلَ بِي كَذَا وَ كَذَا ثُمَّ "

پھر اپنی مرضی سے دعا مانگے اس کے بعد کہے:

" اللَّهُمَّ أَنْتَ وَلِيُّ نِعْمَتِي وَ الْقَادِرُ عَلَى طَلِبَتِي تَعْلَمُ حَاجَتِي فَأَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّد عليه وعليهم السلام لما قضيتها لی "

اور اللہ سے اپنی حاجت طلب کرے۔اگر اللہ عزوجل نے چاہا تو اس کی مراد پوری کر دے گا۔

گلستان جوانان

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

انقلاب سے پہلے انقلاب کی حمایت

انقلاب کی آمد سے چند ماہ قبل ایرانی طلباء نے مال روڈ لاہور پر شاہ ایران کے ظلم کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا تو ڈاکٹر محمد علی نقویؒ نے اس مظاہرہ کی قیادت کی اور تکبیر کا پہلا نعرہ بھی آپ نے بلند کیا۔انہیں ایام میں شاہ کی حکومت فدایان خمینیؒ پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی تھی۔ایک وقت میں سینکڑوں نوجوان شہید کیے جا رہے تھے تو آئی ایس او پاکستان نے امامؒ کی حمایت اور شاہ کے خلاف پہلی بار مال روڈ لاہور پر مظاہرہ کیا جس کی قیادت سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقویؒ نے کی، اس موقع پر لاہور کے ڈپٹی کمشنر سعید مہدی نے ڈاکٹر صاحب کو بلا کر کہا" آپ واپس چلے جائیں وگرنہ ہم ماریں گے'ڈاکٹر صاحب نے جواباً کہا " ہم میدان میں واپس جانے کیلئے نہیں اترے، ہم اپنا مشن پورا کریں گے اور آپ اپنا مشن پورا کریں "۔

امام خمینیؒ اور انقلاب اسلامی

امام خمینیؒ ولادت سے قم ہجرت تک:

20 جمادی الثانی ولادت سیدۃ النساء العالمین حضرت فاطمۃ الزہراؑ کا دن ہے، اسی تاریخ کو انہی کی اولاد سے ۱۳۲۰ھ بمطابق 24 ستمبر 1902ء کو ضلع خمین، صوبہ مرکزی کے علم اور ہجرت و جہاد کے جذبوں سے سرشار ایک گھرانے میں سید روح اللہ موسوی خمینیؒ نے عالم طبیعت میں قدم رکھا۔ ابھی روح اللہ کی ولادت سے پانچ ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا تھا کہ حکومت وقت کے حمایت یافتہ طاغوتی سرداروں نے آپ کے والد کے حق پسندانہ نعروں کا جواب گولی سے دیا اور آپ کو خمین سے عراق جاتے ہوئے شہید کر دیا کیونکہ سید مصطفی نے ان سرداروں کی زور آزمائیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا تھا۔ اس طرح امام بچپن میں ہی یتیمی کے غم میں مبتلا اور شہادت کے مفہوم سے آشنا ہوئے۔

حضرت امام خمینیؒ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر بچپن اور لڑکپن میں ہی اس زمانے کی مروجہ تعلیمات اور دینی مدارس کے نصاب میں شامل مقدمات کا کچھ حصہ حاصل کرنے کے بعد 1919ء میں شہر اراک کے حوزہ علمیہ کا رخ کیا اور پھر 1921ء میں قم کی طرف ہجرت کی۔ یہاں آپ نے مندرجہ ذیل علمائے کرام سے کسب فیض کیا:

مرحوم آقا میرزا محمد علی ادیب تہرانی، مرحوم آیت اللہ سید محمد تقی خوانساری، مرحوم آیت اللہ سید علی یثربی کاشانی، آیت اللہ حاج شیخ عبدالکریم حائری یزدی۔

امام خمینیؒ جلد ہی، فقہ، اُصولِ فقہ، فلسفہ، عرفان وسلوک اور اخلاقیات کے شعبوں میں ایک صاحب نظر استاد اور مجتہد کے طور پر پہچانے جانے لگے۔ کئی سالوں کے جہاد بالنفس، شرعی ریاضتوں اور عرفانی اُصولوں پر کاربند رہنے کی وجہ سے امام کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جلوہ گر ہونے والی اعلیٰ صفات کے علاوہ آپ کے اپنے مخصوص سیاسی اُصول تھے۔ آپ کو اس نظریے پر بھی

مکمل یقین تھا کہ خطرات سے بھرپور اس پرآشوب دور میں عوام کیلئے اُمید کی واحد کرن دینی درسگاہوں کے مقاصد،علمائے کرام اور دینی قیادت کی طاقت کا تحفظ ہے۔

حوزہ علمیہ قم میں قیام کے دوران حضرت امام خمینیؒ نے مدرسہ فیضیہ، مسجد اعظم، مسجد محمدیہ، مدرسہ حاج ملا صادق، مسجد سلماسی وغیرہ کے مقامات پر فقہ، اصول فقہ، فلسفہ، عرفان وسلوک اور اسلامی اخلاقیات کے متعدد درس دیئے۔ ہزاروں علماء اور ذہین اور قابل قدر دانشوروں کی تربیت امام خمینی کی چند سالہ تدریسی کاوشوں کا پرفیض ثمر ہے۔

شہید استاد آیت اللہ مطہریؒ اور شہید مظلوم آیت اللہ ڈاکٹر بہشتیؒ جیسے مفکرین کو بھی یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے کئی برس تک اس عارف کامل کے سرچشمہ فیض سے استفادہ کیا ہے۔

راہ خدا میں مقابلہ و جہاد کا جذبہ امامؒ کے اعتقادی نظریات، تربیت، گھریلو ماحول اور پوری زندگی کے سیاسی اور معاشرتی میدانوں میں موجزن رہا ہے۔ آپ نے دورِ جوانی سے ہی جدوجہد شروع کی جو آپ کے روحانی اور علمی پہلوؤں کے تکامل کے ساتھ ایران اور عالم اسلام کے سیاسی اور معاشرتی حالات کے مطابق مختلف صورتوں میں جاری رہی۔

رضاشاہ پہلوی کے ضدِ دین اقدامات:

رضاخان نے اپنی بادشاہت کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے بعد ابتدائی سالوں میں ہی ایرانی معاشرے سے اسلامی ثقافت کے اثرات کو مٹانے کیلئے وسیع منصوبے بنائے۔ علمائے کرام کو مختلف طریقوں سے بے جا تنگ کرنے کے ساتھ ساتھ سرکاری احکامات کے ذریعے مجالس، عزاداری اور مذہبی تقریروں پر پابندی لگائی گئی۔ مدرسوں میں قرآن مجید اور دینی مسائل و احکام کی تعلیم اور نماز جماعت کو ممنوع قرار دیا گیا اور مسلمان ایرانی خواتین کے سروں سے پردے ہٹانے کا راگ الاپا گیا۔ شاہ کے ان ناپاک عزائم کے پس پردہ مقاصد کو بھانپتے ہوئے اصفہان کے علماء نے آیت اللہ نور اللہ اصفہانی کی قیادت میں 1927ء میں احتجاجی طور پر اصفہان سے قم کی طرف ہجرت کرنے کے بعد یہاں پر دھرنا دینے کا اعلان کیا جو کہ 106 دن تک جاری رہا۔ رضا خان کے کارندوں کے ہاتھوں دسمبر 1927ء میں اس تحریک کے قائد کی شہادت کے ساتھ عملی طور پر دھرنا مہم اپنے اختتام کو پہنچی۔

1927ء میں ہی قم میں رضاخان پہلوی کے ساتھ آیت اللہ بافقی کے تنازعہ و اختلاف کا واقعہ پیش آیا۔ جس کی وجہ سے فوج کے ذریعے قم شہر کا محاصرہ کیا گیا اور شاہ کے ہاتھوں اس عالم دین کو زدوکوب کرنے کے بعد رے نامی شہر کی جانب ان کو شہر بدر کر دیا گیا۔

یہ سانحہ اور اس جیسے دیگر حوادث، اس دور کی قانون ساز اسمبلی میں ہونے والے حالات، خاص طور پر نامور اور مجاہد عالم دین آیت اللہ سید حسن مدرس کی جدوجہد نے، امام خمینیؒ کی حساس اور عزم وولولے سے مالا مال روح پر گہرا اثر ڈالا۔

رضاخان پہلوی نے حوزہ علمیہ قم کے نظام کو درہم برہم کرنے کیلئے علمائے کرام سے سرکاری طور پر امتحان لینے کا فرمان جاری کیا۔ امام خمینیؒ اس حکم کی مخالفت میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور آپ نے قم کے بعض نامور علماء کو اس منصوبے کے پس پردہ عزائم

سے خبردار کیا۔ جو سادہ اندیشی کی بنا پر اس کارروائی کو ایک اصلاحی قدم قرار دے رہے تھے۔ امام پر فلسفہ، عرفان اور اخلاقیات کے دروس بند کرنے کیلئے دباؤ بڑھا دیا گیا لیکن آپ نے اپنے درس کو ایک خفیہ مقام پر منتقل کر کے شاگردوں کی فکری تربیت جاری رکھی۔ ان کوششوں کا نتیجہ شہید آیت اللہ مطہریؒ جیسی شخصیات کی تربیت کی صورت میں نکلا۔

◆ امام خمینیؒ کی بیداریٔ اُمت تحریک:

امام معاشرے کے حالات اور دینی درسگاہوں کی صورت حال پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ آپ معاصر تاریخ کی کتب اور رسائل و جرائد کے مطالعے کے علاوہ تہران رفت و آمد کے ذریعے آیت اللہ مدرس جیسے اکابرین کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی معلومات میں اضافہ فرماتے رہتے تھے لہٰذا آپ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مشروطیت (آئینی تحریک) کی شکست اور بالخصوص رضاخان پہلوی کے برسر اقتدار آنے کے بعد رونما ہونے والے ذلت آمیز حالات کا ازالہ کرنے کا واحد راہ حل حوزہ علمیہ کے علماء کی بیداری بلکہ اس سے قبل دینی درسگاہوں کی نشاۃ ثانیہ اور علمائے کرام کے ساتھ عوام کا روحانی رابطہ ہے۔

امام خمینیؒ نے 1943ء میں کتاب ''کشف الاسرار'' کی تصنیف و اشاعت کے ذریعہ نہ صرف رضاخان پہلوی کی بادشاہت کے بیس سالہ دور میں رونما ہونے والے سانحات کو بے نقاب کیا بلکہ اسلام اور علمائے کرام کا دفاع کرتے ہوئے منحرف عناصر کے شکوک و شبہات اور طعن و تشنیع کا مدلل جواب دیا۔ آپ نے اسی کتاب میں اسلامی حکومت کا تصور پیش کرتے ہوئے اس کی تشکیل کیلئے تحریک چلانے کی ضرورت پر زور دیا۔

اگلے سال مئی 1944ء میں امام خمینیؒ کی زندگی کا پہلا سیاسی بیان شائع ہوا جس میں انہوں نے علمائے اسلام اور اسلامی معاشرے سے کھل کر ایک ہمہ گیر تحریک چلانے کی اپیل کی تھی۔ اس بیان کا لہجہ، متن اور مخاطبین واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان افسوسناک حالات میں امام خمینیؒ کو حوزہ ہائے علمیہ سے کسی بروقت تحریک کی توقع نہ تھی بلکہ بیان جاری کرنے کا مقصد خطرے کی گھنٹی بجانا اور نوجوان طالب علموں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا تھا اور جیسا کہ توقع کی جا رہی تھی، حضرت امام خمینیؒ کی طرف سے تحریک چلانے کی اپیل پر کسی خاطر خواہ ردعمل کا اظہار نہ ہوا لیکن آپ کی شمع وجود کے گرد پروانہ وار محفلوں کی صورت میں حلقہ باندھے طلبہ کے ضمیروں میں اُمید کی کرنیں پھوٹ پڑیں۔

امام خمینیؒ نے اپنے گراں قدر اہداف کی تکمیل کی خاطر 1949ء میں حوزہ علمیہ کو نئے خطوط پر منظم کرنے کیلئے آیت اللہ مرتضیٰ حائری کے تعاون سے ایک جامع پروگرام بنا کر آیت اللہ بروجردی کے سامنے پیش کیا۔ امام کے شاگردوں کے علاوہ حوزہ کے روشن ضمیر طلبہ نے اسے بہت سراہا۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی صورت میں حوزہ علمیہ ایک ہمہ گیر علمی ادارے میں تبدیل ہو سکتا تھا لیکن بعض فاسد علماء راستے کی رکاوٹ بنے کیونکہ وہ اس پروگرام کو اپنی پر تعیش اور آرام دہ زندگی میں خلل سمجھتے تھے۔

تہران میں 12 جولائی 1952ء کو تیل کے قومیانے کی تحریک نے جنم لیا۔ تیل کو قومیانے کی تحریک کی کامیابی کا شیریں

مزہ چکھنے سے پہلے ایرانی عوام کو اس کے بعد کے پیدا ہونے والے اختلافات، ناخوشگوار واقعات اور بالآخر 19 اگست کی فوجی بغاوت کے نتائج کا کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔ فدائیان اسلام نے اپنی سرگرمیاں ترک نہ کیں حتیٰ کہ اس دور کے وزیر اعظم حسین علاء کے قتل میں ناکامی کے بعد اس تنظیم کے رہنما گرفتار کر لئے گئے اور دسمبر 1955ء میں فدائیان اسلام کے گرفتار شدہ رہنماؤں کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

1957ء میں ساواک (شاہ کی خفیہ پولیس) کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کا قیام، نیز حکومت کی طرف سے شدت سے مخالفین کو کچلنے اور تشدد کی فضا کو وسعت دینے اور تیزی کے ساتھ امریکی اصلاحات کیلئے معاشرتی حالات سازگار بنانے کیلئے کیا جا رہا تھا۔

30 مارچ 1961ء کو آیت اللہ العظمیٰ بروجردی رحلت فرما گئے۔ آپ کی گرانقدر خدمات اور علمی شخصیت نے ایرانی معاشرے میں مرجعیت کو سب سے زیادہ عوامی اعتماد کی حامل پناہ گاہ کی حیثیت عطا کی۔ آپ کی یہی حیثیت بذات خود شاہی حکومت کے عزائم کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی لہٰذا آپ کی رحلت ایک ناقابل تلافی نقصان سمجھی جاتی تھی۔ 1962ء کے اوائل میں آیت اللہ کاشانی بھی دارفانی کو وداع کہہ گئے جن کا نام سن کر ایک زمانے میں شاہ ایران پر لرزہ طاری ہو جایا کرتا تھا۔ آیت اللہ بروجردی کی رحلت کے بعد امریکہ کی مدنظر اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کیلئے شاہی حکومت تیزی سے سرگرم عمل ہوئی بلکہ اس نے مرجعیت کو ایران سے باہر منتقل کرنے کیلئے جدوجہد شروع کی لیکن اس کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔

8 اکتوبر 1962ء کو امیر اسد اللہ علم کی کابینہ نے ایک بل کی منظوری دی جس کی رو سے علاقائی اور صوبائی کونسلوں کے رائے دہندگان اور اُمیدواروں کے مسلمان ہونے، قرآن مجید پر حلف اُٹھانے کے علاوہ اُمیدواروں اور رائے دہندگان کے مرد ہونے کی شرائط حذف کر دی گئیں۔ مندرجہ بالا اول الذکر دو شرائط کا حذف کرنا اور ان میں تبدیلی براہ راست استعماری بہائی مذہب کے پیروکاروں کو کاروبار مملکت کے حساس معاملات میں حصہ دار بنانے کی خاطر کی گئی تھی۔ شاہ کے اصل عزائم کو بے نقاب کرنے کے علاوہ، علماء اور دینی مدارس کی بھاری ذمہ داری کا احساس دلانے میں امام خمینیؒ کا کردار بہت ہی اہم اور موثر تھا۔ شاہ اور اسد اللہ علَم کے نام علماء کے احتجاجی خطوط سے عوام کے مختلف طبقات میں علماء کی حمایت کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ شاہ اور وزیر اعظم کے خلاف امام خمینیؒ کے ٹیلگراموں کا لہجہ بہت سخت اور دھمکی آمیز تھا۔ آپ کے ایک ٹیلگرام میں کہا گیا تھا" میں ایک بار پھر تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ خداوند متعال اور آئین کی پیروی کیلئے اپنا سر خم کرو، قرآن مجید، علمائے قوم اور مسلم عمائدین کے احکام کی خلاف ورزی کے سخت نتائج سے ڈرو۔ جان بوجھ کر بلاوجہ ملک کو خطرات سے دو چار نہ کرو، ورنہ علمائے اسلام تمہارے خلاف بولنے سے دریغ نہیں کریں گے"۔

آپ کی رائے یہ تھی کہ حکومت کو علاقائی اور صوبائی کونسلوں کا قانون، سرکاری طور پر اور عملاً منسوخ کرنے کا اعلان کرنا چاہیے۔ بالآخر شاہی حکومت نے شکست تسلیم کر لی اور 29 نومبر 1962ء کو علاقائی اور صوبائی کونسلوں سے متعلق قانون کے بل کو منسوخ کرنے پر مبنی خبر سرکاری اخباروں میں شائع ہوئی اور عوام نے اس عظیم کامیابی کا جشن منایا۔

15 خرداد کی تحریک:

محرم کا مہینہ آپہنچا، امام خمینیؒ نے عوام کو شاہ کی جابر و آمر حکومت کے خلاف انقلاب کی دعوت دینے کیلئے اس موقع سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا۔عاشورہ کے دن ایک لاکھ کے اجتماع نے تہران میں امام خمینیؒ کی تصویر اُٹھا کر مظاہرہ کیا اور پہلی بار دارالحکومت میں کاخ مرمر (محل) کے سامنے جو شاہ کی رہائش گاہ تھی، ڈکٹیٹر مردہ باد کے نعرے لگائے۔

امامؒ نے 13 خرداد (جون 1963ء) کو عصر عاشور کے وقت مدرسہ فیضیہ میں ایک تاریخی خطاب کیا جو 15 خرداد کی تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔امامؒ کے خطاب کا اکثر حصہ پہلوی خاندان کے برے اعمال، نیز شاہ اور اسرائیل کے خفیہ تعلقات کو فاش کرنے پر مبنی تھا۔امام خمینیؒ کے فرمودات شاہ پر بجلی بن کر گرے۔شاہ کی توسیع پسندی جنون کی سرحدیں چھو رہی تھی اور اس کا فرعونی تکبر زبان زد خاص و عام ہو چکا تھا۔اسی لیے اس نے تحریک کی آواز کو دبانے کا حکم دیا۔چنانچہ ابتدائی اقدام کے طور پر 14 خرداد (4 جون) کی شام کو امام خمینیؒ کے ساتھیوں کی بڑی تعداد کو گرفتار کرلیا گیا اور 15 خرداد (5 جون) کو فجر سے پہلے آدھی رات کے وقت 3 بجے تہران سے بھیجے گئے سوکمانڈروں نے امام خمینیؒ کے دولت کدے کا محاصرہ کیا اور امامؒ کو گرفتار کر کے سراسیمگی کے عالم میں تہران لے گئے۔اس وقت آپ نماز تہجد میں مصروف تھے۔

امامؒ کی گرفتاری کی خبر قم اور اس کے نواحی علاقوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، اردگرد کے دیہاتوں اور شہر کے گلی کوچوں سے لوگ اپنے رہبر کے گھر کی طرف اُمڈ آئے۔لوگوں کا بنیادی مقصد"موت یا خمینیؒ" تھا جس کی آوازیں پورے قم کی فضا میں گونج رہی تھیں۔عوام کا اشتعال اتنا زیادہ تھا کہ ابتداء میں پولیس کے کارندے ان سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کرتے ہوئے بھاگ نکلے اور بعد میں وہ اپنی طاقت یک جا کر کے واپس آئے۔آس پاس کی فوجی چھاؤنیوں سے فوج کے امدادی دستے قم کی طرف روانہ ہوئے،لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر حرم حضرت معصومہ قمؑ سے باہر نکل رہا تھا کہ مشین گنوں کے منہ سے گولیاں برسنے لگیں۔عوام اور پولیس میں مڈبھیڑ کئی گھنٹے تک جاری رہی، اس دوران خون کی ندیاں بہادی گئیں۔تہران سے فوجی جہازوں کی پروازیں شروع ہوگئیں، قم کی فضا میں پہنچ کر ان جہازوں نے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانے کیلئے ساؤنڈ وال توڑتے ہوئے ہولناک آوازیں نکالیں۔اس دن قم کی شام، شام الم تھی۔امام کی گرفتاری کی خبر جب تہران، مشہد، شیراز اور دیگر شہروں میں پھیلی تو ان شہروں میں بھی قم کی طرح حالات کشیدہ ہو گئے۔

15 خرداد ایرانی عوام کے اسلامی انقلاب کے آغاز کا دن تھا۔

7 اپریل 1964ء کو شام کے وقت بغیر کسی اطلاع کے امامؒ کو رہا کر کے قم پہنچا یا گیا۔

جب کیپچولائزیشن (امریکی باشندوں کے سیاسی اور سفارتی تحفظ) کے قانون کی تجدید حکومت کے دستورالعمل میں شامل کی گئی تو امامؒ نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔امامؒ نے شاہ کی دھمکیوں کی پرواہ کئے بغیر شاہ کی سالگرہ کے دن قم اور دوسرے شہروں کے علمائے کرام اور عوام کے جم غفیر سے اہم تاریخی خطاب فرمایا۔اس خطاب کا موضوع ایران کی اسلامی مملکت

کے معاملات میں امریکی مداخلت کی مذمت اور شاہ کی غداریوں کو بے نقاب کرنا تھا۔امام خمینیؒ نے اپنا یہ معروف جملہ اسی خطاب میں فرمایا تھا" امریکہ، برطانیہ سے بدتر ، برطانیہ امریکہ سے بدتر اور سوویت یونین ان دونوں سے بدتر ہے ۔ یہ سب ایک دوسرے سے بدتر اور سب ایک دوسرے سے ناپاک تر ہیں لیکن آج ہمارا واسطہ ان خبیثوں سے ہے، امریکہ سے ہے، امریکی صدر کو جان لینا چاہیے کہ وہ ہماری قوم کے نزدیک دنیا کا سب سے زیادہ قابل نفرت شخص ہے، ہماری ساری مصیبتیں اسی امریکہ کی وجہ سے ہیں"۔

امامؒ کی جانب سے کیپچولائزیشن بل سے پردہ اُٹھانے کی کارروائی نے اکتوبر،نومبر 1964ء میں ایران کو ایک نئی تحریک کی دہلیز پر لاکھڑا کیا۔شاہی حکومت کو ماضی کا تلخ تجربہ تھا کہ امامؒ کی گرفتاری کی وجہ سے ملک کے اندر حکومت کو متعدد قسم کی مشکلات سے روبرو ہونا پڑے گا۔اور اسی طرح آپ کو جان سے مار دینے کی صورت میں بھی ملک کے اندر ایک ایسی بغاوت جنم لے سکتی تھی جس پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا لہٰذا آخر کار امامؒ کو ملک بدر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

4 نومبر 1963ء کی صبح ایک بار پھر تہران سے بھیجے ہوئے مسلح کمانڈروں نے قم میں امامؒ کی رہائش گاہ کا محاصرہ کیا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ امامؒ کو گذشتہ سال کی طرح عین نماز تہجد کے وقت گرفتار کیا گیا۔اس کے بعد آپ کو تہران کے ہوائی اڈے مہر آباد پر پہنچا دیا گیا جہاں پر پہلے سے تیار ایک فوجی طیارے کے ذریعے آپ کو ترکی کے دارالحکومت انقرہ لے جایا گیا۔

امامؒ کی جلاوطنی کے اگلے دن آیت اللہ حاج آقا مصطفی خمینی کو بھی گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور کچھ دنوں کے بعد ان کو بھی جلاوطن کر کے اپنے والد گرامی کے پاس ترکی بھیج دیا گیا۔امام خمینیؒ کی ترکی جلاوطنی کا دور بہت سخت اور اذیت ناک تھا۔حد یہ ہے کہ آپ کو علماء کا لباس پہننے کی بھی ممانعت کی گئی تھی ۔ذہنی وجسمانی تشدد کے باوجود آپ کو سازش قبول کرنے پر آمادہ نہ کیا جاسکا۔امام خمینیؒ 11 ماہ تک ترکی میں رہے۔

5اکتوبر 1965ء کو امام خمینیؒ کو ان کے فرزند آیت اللہ حاج آقا مصطفی کے ہمراہ ترکی سے ان کی جلاوطنی کی دوسری منزل عراق بھیج دیا گیا۔بغداد پہنچنے کے بعد امام خمینیؒ ائمہ اطہارؑ کی زیارت کیلئے کاظمین، سامرہ اور کربلا کے دورے پر گئے اور ایک ہفتے کے بعد اپنی اصل اقامت گاہ نجف اشرف تشریف لے گئے ۔ان شہروں میں طلبہ، علماء اور عوام نے آپ کا شایان شان استقبال کیا۔اس سے شاہی حکومت کی سوچ کے برعکس یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ 15 خرداد کی تحریک کے پیغام کو عراق بالخصوص نجف اشرف میں بھی عوامی مقبولیت حاصل ہوئی تھی ۔نجف اشرف میں امام کے 13 سالہ طولانی قیام کا آغاز ایسے حالات میں ہوا کہ جن کی رو سے بظاہر ایران اور ترکی میں پایا جانے والا براہ راست دباؤ اور پابندیاں موجود نہیں تھیں لیکن آپ کو بڑے پیمانے اور تکلیف دہ حد تک مخالفتوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا البتہ دشمنوں کی طرف سے نہیں بلکہ دین کا لبادہ اوڑھے ہوئے دنیا پرست اور نام نہاد علماء کی جانب سے ۔

امام خمینیؒ نے نجف اشرف پہنچنے کے فوراً بعد خطوط اور نمائندوں کے ذریعے ایران میں جہادی عناصر سے اپنا رابطہ قائم کیا

اور آپ نے ان کو ہر موقع پر 15 خرداد کی تحریک کے مقاصد کی تکمیل کیلئے ثابت قدم رہنے کی تاکید فرمائی۔ امام خمینیؒ کی جلاوطنی اور مخالفین کا قلع قمع کرنے کے بعد شاہی سرخ فیتے کی حکومت کا سیاہ ترین دور شروع ہوا۔ ساواک اپنی مطلق العنانیت کے عروج پر پہنچی حتیٰ کہ دور دراز علاقوں میں بھی کسی ملازم کی تقرری سے پہلے ساواک کی تائید ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اس دور میں عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ کے صرف نام رہ گئے تھے۔ شاہ سمیت گنے چنے بعض درباری حضرات اور خواتین ملک کے سیاہ وسفید کے مالک بنے ہوئے تھے۔

شاہ ایران پوری طاقت کے ساتھ اپنی من گھڑت تہذیب کے فروغ کیلئے تگ و دو کر رہا تھا جس کی بنیاد ان مقاصد پر مبنی تھی۔ غیر ملکی ثقافت کا پرچار، بے ہودگی، سینکڑوں امریکی اور یورپی کمپنیوں کے ہاتھوں ایران کے قومی ذخائر کی لوٹ کھسوٹ، ایران کی نسبتاً آزاد زراعت کی بنیادوں کی تباہی، ایران کی پیداواری صلاحیت رکھنے والی انسانی طاقت کو شہروں کی مضافاتی بستیوں کی طرف دھکیل کر اسے بے روزگار اور صارف عناصر میں تبدیل کرنا، (غیر ملکی صنعت پر) منحصر اسمبل کی جانے والی غیر ضروری صنعتوں کا فروغ، ایران اور خلیج فارس کے علاقے میں ایرانی قوم کے سرمائے سے قائم کیئے جانے والے امریکی سراغ رساں، جاسوسی اور فوجی اڈوں کا قیام۔

امامؒ نے جلاوطنی کے تمام عرصے میں سخت تکالیف کے باوجود کبھی بھی جہاد اور مقابلے کے عمل کو ترک نہیں کیا۔ آپ نے تقریروں اور پیغامات کے ذریعے لوگوں کے دلوں کے اندر کامیابی و کامرانی کی اُمید کو زندہ رکھا۔

7 جون 1967ء کو امام خمینیؒ نے عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر ایک پیغام میں اپنا انقلابی فتویٰ صادر کیا۔ جس میں آپ نے اسرائیل کے ساتھ اسلامی ممالک کے ہر قسم کے تجارتی اور سیاسی روابط نیز عالم اسلام میں اسرائیلی مصنوعات کے استعمال کو حرام قرار دیا۔ اس فتوے نے شاہ اور اسرائیل کے درمیان فروغ پانے والے تعلقات کو سخت دھچکہ پہنچایا۔

چار سال درس و تدریس، سعی و کوشش اور افکار کو جلا بخشنے کے بعد امام خمینیؒ کچھ حد تک حوزہ علمیہ نجف اشرف کی فضا میں تبدیلی لانے میں کامیاب ہوئے۔ 1969ء تک ملک کے اندر موجود بے شمار مجاہدوں کے علاوہ عراق، لبنان اور دیگر اسلامی ممالک میں بڑی تعداد میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے تھے جو امام خمینیؒ کی تحریک کو اپنے لئے مشعل راہ قرار دیتے تھے۔ امام خمینیؒ نے 1970ء کے اوائل میں" اسلامی حکومت یا ولایت فقیہ" کے موضوع پر درس کا آغاز کیا۔ دروس کے اس مجموعے کو "ولایت فقیہ" یا" حکومت اسلامی" کے عنوان سے کتابی شکل دے کر موسم حج میں ایران، عراق اور لبنان سے چھپوا کر تقسیم کیا گیا جس سے تحریک میں ایک جان پڑ گئی۔

1971ء میں ایرانی بادشاہت کے اڑھائی ہزار سالہ جشن کے عنوان سے دنیا کے بہت سے ممالک کے سربراہوں کی موجودگی میں، ایرانی قوم پر خطیر لاگت سے منعقد ہونے والی افسانوی تقریبات مسلط کی گئیں۔ امام خمینیؒ نے اپنے بیانات کے ذریعے زبردستی ٹھونسی جانے والی ان تقریبات کی مذمت کرتے ہوئے ملک کی پسماندگی اور ایرانی معاشرے کے اندر موجود تلخ

حقیقتوں کو بے نقاب کیا۔

چوتھی عرب اسرائیل جنگ کے دوران شاہ، اسرائیل کا ایک طاقتور حلیف سمجھا جاتا تھا لیکن امام خمینیؒ نے ایک پیغام میں ایرانی قوم سے صیہونی حکومت کی جارحیت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کی اپیل کی۔

مارچ 1971ء میں شاہ نے" رستاخیز" کے نام سے ایک درباری پارٹی بنائی اور اعلان کیا کہ پوری ایرانی قوم کو اس پارٹی کی رکنیت حاصل کرنا چاہیے اور جو اس کی مخالفت کرے گا اسے پاسپورٹ بنوا کر ملک سے باہر نکل جانا پڑے گا۔ اسلام اور ایران کی مسلمان قوم کے مفادات کے خلاف ہونے کی وجہ سے امام خمینیؒ نے اس پارٹی کی رکنیت حاصل کرنا پوری قوم کیلئے حرام قرار دیا۔ نتیجتاً شاہی حکومت نے اس پارٹی کو خود ہی کالعدم قرار دے دیا۔

1975ء کے اوائل میں شاہ نے اپنی مذہب مخالف پالیسیوں کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے ایک گستاخانہ حرکت کا ارتکاب کیا۔ اس نے سرکاری کیلنڈر کو پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت سے بدل کر ہاخامنشیان بادشاہت کا آغاز قرار دیا۔ اس موقع پر امام خمینیؒ نے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے فتویٰ دیا کہ بے بنیاد شاہی کیلنڈر کا استعمال حرام ہے۔ ایرانی عوام نے رستاخیز پارٹی کو حرام قرار دینے کے فتویٰ کی طرح اس افسانوی کیلنڈر کے آغاز کو حرام قرار دینے کے فتویٰ کو سراہا۔ حکومت نے مجبوراً اپنا فیصلہ واپس لیتے ہوئے شہنشاہی کیلنڈر کی منسوخی کا اعلان کیا۔

1971ء میں ہی بغداد اور تہران کے حکام کے درمیان دوستی، امام خمینیؒ کی جدوجہد کے راستے میں پہلے سے زیادہ رکاوٹیں کھڑی کرنے کا باعث بنی لیکن یہ رکاوٹیں امام کو جہادی عمل کا تسلسل جاری رکھنے سے باز نہ رکھ سکیں۔

23 اکتوبر 1977ء کو آیت اللہ حاج آقا مصطفی خمینیؒ نے جام شہادت نوش کیا۔ اس موقع پر ایران میں منعقد ہونے والی شاندار تقریبات حوزہ ہائے علمیہ کی دوبارہ بیداری اور ایران کے مذہبی معاشرے کی تحریک کا از سر نو آغاز ثابت ہوئیں۔ امام خمینیؒ نے حیران کن انداز میں اپنے فرزند کی شہادت کو اللہ تعالیٰ کی غیبی رحمت قرار دیا۔ شاہی حکومت نے انتقام کی آگ بجھانے کیلئے روزنامہ اطلاعات کے ایک مقالے میں امام کی شان میں توہین کی۔ اس مقالے کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے 9 جنوری 1978ء کو قم شہر میں ایک احتجاجی مہم شروع ہوئی جس کے دوران بعض انقلابی طلبہ کا خون بہایا گیا۔ اس طرح ایک بار پھر تحریک کا آغاز قم سے ہوا۔ یہ تحریک 15 خرداد کی تحریک سے بالکل مختلف حالات میں قلیل مدت کے دوران پورے ملک کے اندر پھیل گئی۔ اس تحریک کے شہداء کے سوئم، ہفتم اور چہلم کے موقعوں پر تحریک میں مزید تیزی آئی۔ اس دوران امام خمینیؒ کے عقیدت مند آپ کے پیغامات اور تقریروں کی کیسٹیں ریکارڈ کرا کے ملک بھر میں تقسیم کرتے رہے۔ جن میں امام نے عوام کو دعوت دی کہ وہ بادشاہت کی بنیادوں کو گرا دیں اور اسلامی حکومت کی تشکیل کیلئے استقامت کے ساتھ تحریک جاری رکھیں۔ عوام کے قتل عام کے باوجود، شاہِ ایران بھڑکی ہوئی آگ کے شعلوں کو نہ بجھا سکا۔ شاہ کی سیاسی چالیں اور فوجی ہتھکنڈے عوام کے غم و غصہ کی لہر کو کم کرنے میں معمولی اثر چھوڑنے سے پہلے ہی، امام خمینیؒ کی طرف سے پردہ چاک کرنے والے بیانات اور جہادی

منشور کے اجراء کے ساتھ ناکام ہو جاتے تھے۔

7 ستمبر 1978ء کو تہران کے میدان شہداء (ژالہ) میں فوج نے عوام کا سفاکانہ قتل عام کیا اور سرکاری طور پر ایران کے شہروں میں نامعلوم مدت تک مارشل لاء نافذ کر دیا گیا لیکن امامؒ کے پیغامات نشر ہونے کے بعد عوام نے مارشل لاء کی پرواہ کئے بغیر دن رات مظاہرے جاری رکھے۔ ہر آن، ہر گھڑی اللہ اکبر، مرگ بر شاہ (شاہ مردہ باد) اور درود بر خمینیؒ کی صدائیں گونجتی رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ گلی کوچوں سے مشین گنوں کی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

امام خمینیؒ نے اپنی تحریک کی ابتداء اس آیہ شریفہ کی رہنمائی کی بنیاد پر کی۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

ترجمہ: اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔ (سورہ رعد/۱۱)

امامؒ پہلے ثقافتی تبدیلی کو پیدا کرنے، اس کے بعد عوام کے ذریعے انقلاب برپا کر کے معاشرتی تبدیلیاں پیدا کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ انقلاب اسلامی ایران میں مساجد اور دینی مراکز، عوامی تحریک اور اجتماع کے اصل مراکز تھے۔ عوام کے نعرے عام طور پر دینی تعلیمات اور امام خمینیؒ کی رہنمائیوں پر مبنی ہوتے تھے۔

امام خمینیؒ کی عراق سے پیرس کی طرف ہجرت

عراق اور ایران کے وزرائے خارجہ کی ایک ملاقات میں امام خمینیؒ کو عراق سے نکال دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ 4 اکتوبر 1978ء کو امام نجف اشرف کو خیر باد کہہ کر کویتی سرحد کی طرف نکل پڑے لیکن کویتی حکومت نے ایران کے ایماء پر امام کو کویت میں داخل ہونے سے روک دیا۔ امام نے اپنے فرزند سید احمد خمینیؒ سے مشورہ کے بعد پیرس جانے کا فیصلہ کیا اور 6 اکتوبر کو امام خمینیؒ پیرس پہنچے۔

پیرس میں امام خمینیؒ کے چار ماہ قیام کے دوران نوفل لوشاتو دنیا کے خبری حلقوں کا اہم ترین مرکز بنا رہا۔ امام نے متعدد انٹرویوز اور پریس کانفرنسوں کے ذریعے دنیا کو اسلامی حکومت کے بارے میں اپنے نظریات اور تحریک کے آئندہ مقاصد سے آگاہ کیا۔ اس طرح دنیا کے بہت سے لوگ آپ کے افکار اور تحریک سے واقف ہوئے۔ اس دوران آپ نے ایران میں تحریک کے مشکل ترین دور کی قیادت کی۔

آخر کار 16 جنوری 1979ء کو شاہ، ایران سے فرار ہو گیا۔ یہ خبر پہلے تہران میں، اس کے بعد پورے ایران میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ خبر سن کر عوام سڑکوں پر نکل آئی اور خوشی کے جشن منانے لگی۔

جنوری 1979ء کے اواخر میں امام خمینیؒ کے ملک واپسی کے فیصلے کی خبر عام ہوئی۔ جو بھی یہ خبر سنتا اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپکنے لگتے کیونکہ عوام 14 سال سے خوشی کے ان لمحات کیلئے دن گن رہے تھے۔ بالآخر یکم فروری 1979ء کی صبح

14 سال وطن سے دور رہنے کے بعد امامؒ ایران واپس تشریف لائے۔ ایرانی عوام کا بے مثال استقبال عظیم اور نا قابل انکار تھا۔ مغربی خبر رساں ایجنسیوں نے بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے استقبالی ہجوم کی تعداد 6 سے 7 ملین افراد تک بتائی۔ امامؒ کی تقریر سننے کیلئے لوگوں کا جم غفیر ائیر پورٹ سے شہدائے انقلاب اسلامی کے مزار بہشت زہرا کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں خطاب کرتے ہوئے امامؒ نے زور دے کر فرمایا تھا" میں اس قوم کی حمایت سے حکومت تشکیل دوں گا"۔

8 فروری 1979ء کو ائیر فورس کے جوانوں نے امام خمینیؒ کی قیام گاہ تہران میں حاضر ہو کر آپ کے ساتھ تجدید عہد کیا۔ شاہی فوج مکمل سقوط کے دھانے پر پہنچ چکی تھی۔ کیونکہ اس سے قبل بڑی تعداد میں فوجی آفیسرز نے امام خمینیؒ کے فتوے پر چھاؤنیوں کو چھوڑ کر عوامی صفوں میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ 9 فروری 1979ء کو تہران کے اہم ترین ائیر بیس پر ائیر فورس کے جوانوں نے بغاوت کی تو مخصوص شاہی گارڈ انہیں کچلنے کیلئے آگے بڑھی، ادھر عوام انقلابی فوجیوں کی حمایت کیلئے میدان کارزار میں کود پڑے۔ 10 فروری کو پولیس اسٹیشنوں اور مختلف سرکاری اداروں پر یکے بعد دیگرے عوام نے قبضہ کیا۔ آخر کار 11 فروری کی صبح کو ایران میں امام خمینیؒ کی تحریک اور اسلامی انقلاب کی کامیابی کا سورج طلوع ہونے کے ساتھ ساتھ ظالم بادشاہوں کا طویل سلسلہ بادشاہت بھی ختم ہو گیا۔

غیر یقینی صورتحال، شاہی حکومت کے تحفظ اور امام خمینیؒ کی کامیابی کا راستہ روکنے کیلئے بین الاقوامی سطح پر ہونے والی تمام تر کوششوں کے باوجود اسلامی انقلاب اپنی جدوجہد کے پہلے مرحلے میں ہی کامیاب ہو گیا۔ لہٰذا یہ کامیابی عام تبدیلی سے ہٹ کر ایک معجزہ سمجھی جاتی ہے۔ امام خمینیؒ کے بے شمار عقیدت مندوں کو عام تجزیہ و تحلیل سے ہٹ کر آپ اور آپ کے اقوال اور وعدوں پر دلی یقین تھا لیکن عام سیاسی تجزیہ کار اور ایران کے حالات و واقعات سے واقفیت رکھنے والے لوگ شاہی اقتدار کے آخری دنوں تک اس طرح کی کامیابیوں کو ناممکن سمجھتے رہے۔

امام خمینیؒ کی کامیابیوں کا راز، نفسانی خواہشات کے ساتھ آپ کا مقابلہ اور حقیقی شہودی معرفت حاصل کرنے کیلئے کی جانے والی انتھک جدوجہد میں مضمر ہے۔ امام کی شخصیت کے نفسانی، روحانی اور علمی پہلوؤں کے تکمیلی مراحل کا جائزہ لیے بغیر آپ کی سیاسی جدوجہد کے اہداف اور محرکات کو سمجھنا ناممکن ہے۔

4 نومبر کو کالج، یونیورسٹیوں کے مسلمان طالبعلموں کے ایک گروہ، جس کا نام "امامؒ کے نقش قدم پر چلنے والے طلبہ" تھا تہران میں امریکی سفارت خانے پر قبضہ کیا اور سفارت خانے کی حفاظت پر مامور مسلح امریکی پہرے داروں کی مزاحمت کو ناکام بناتے ہوئے امریکی جاسوسوں کو گرفتار کیا۔ سفارتخانے سے ملنے والی دستاویزات آگے چل کر پچاس جلدوں پر مشتمل کتاب کی صورت میں شائع ہوئیں جس کا عنوان "ایران میں امریکی جاسوسی اڈے کی دستاویزات" رکھا گیا۔ یہ نا قابل تردید دستاویزات ایران اور دنیا کے مختلف ممالک میں امریکہ کی سازشوں اور بے شمار مداخلتوں کو بے نقاب کرنے کے علاوہ دنیا کے مختلف مقامات پر امریکہ کے بہت سے ایجنٹوں سے رابطہ رکھنے والوں اور جاسوسوں کے نام نیز جاسوسی کے امریکی طور طریقوں اور

امریکہ کی سیاسی حرکات کے رازوں کو فاش کرنے کیلئے کافی ہیں ۔ یہ واقعہ امریکی حکومت کیلئے بہت بڑی ذلت کا باعث بنا۔

امام خمینیؒ نے طلبہ کی اس انقلابی کارروائی کی حمایت کرتے ہوئے اسے پہلے والے انقلاب سے بھی بڑے انقلاب کا نام دیا۔

گرفتار ہونے والے جاسوسوں کی رہائی کیلئے بنایا گیا امریکی منصوبہ صحرائے طبس میں رونما ہونے والے ایک حیران کن معجزانہ واقعے میں ناکامی سے دوچار ہوا۔ 24 اپریل 1980ء کو C-130 قسم کے چھ فوجی طیارے ایران کے مشرقی صحرا میں واقع ایک سابقہ (متروکہ) امریکی اڈے پر اُترے ۔ پروگرام کے تحت آپریشن میں حصہ لینے والے اور سواری کے طور پر استعمال ہونے والے آٹھ ہیلی کاپٹروں کو یہاں پہنچنا تھا۔ ان طیاروں کو ایندھن حاصل کرنے کے بعد ہیلی کاپٹروں کے ساتھ تہران کی طرف پرواز کر کے اندرون ملک امریکی ایجنٹوں کی مدد سے امام خمینیؒ کی رہائش گاہ سمیت دیگر حساس اداروں کو بم سے اُڑانا تھا لیکن اچانک ایک طوفان آیا جس کی وجہ سے صحرا کی ریت ہوا میں اُڑنے لگی، ایک دو ہیلی کاپٹر نیمٹس نامی بحری بیڑے کی طرف واپس جانے پر مجبور ہوئے اور بعض ہیلی کاپٹروں کو آس پاس کے صحراؤں میں ہنگامی طور پر اترنا پڑا۔ نیچے اترے ہوئے کسی طیارے سے ٹکرانے کے بعد ایک اور ہیلی کاپٹر کے پرخچے اُڑ گئے ۔ اس حادثے میں آٹھ فوجی بھی ہلاک ہوئے اور اس وقت کے امریکی صدر جیمی کارٹر نے آپریشن کو ناکام قرار دے کر اسے ادھورا چھوڑنے کا اعلان کیا۔

جب اسلامی جمہوری حکومت کو سرنگوں کرنے کیلئے متعدد امریکی منصوبے ناکام ہو گئے تو امریکہ نے صدام کے ذریعے ایران پر آٹھ سالہ جنگ مسلط کی ۔ امام نے فوراً جارحیت کے خلاف مزاحمت کا حکم دیا۔ آپ نے ابتدائی خطاب میں تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ جنگ کی آگ بھڑکانے کا اصل ذمہ دار امریکہ ہے اور اسی نے صدام کو اکسایا ہے ۔ آپ نے کھل کر عوام کو یقین دلایا کہ اگر دشمن کی جارحیت کے مقابلے کو شرعی فریضہ سمجھ کر خدا کی راہ میں اُٹھ کھڑے ہوں تو دشمن کی شکست یقینی ہے ۔ اگرچہ ظاہری اسباب وعلل اس کے برعکس ہی کیوں نہ ہوں ۔

ایرانی عوام خدا پر ایمان اور غیبی امداد پر اعتقاد کے ساتھ امامؒ کی قیادت پر بھروسہ کئے ہوئے تھے ۔ اور آخرکار فتح نے مظلوم قوم کے قدم چومے اور دشمن قدم بہ قدم اپنی سرحدوں کے اندر تک پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ امام خمینیؒ کی زندگی کے آٹھ سال اس دفاع مقدس کی قیادت میں گزرے ۔

یکم جنوری 1989ء کو امامؒ نے گورباچوف کے نام ایک خط لکھا جس میں آپ نے پیش گوئی کی تھی کہ " آج کے بعد کیمونزم کو دنیا کی سیاسی تاریخ کے عجائب گھروں میں ڈھونڈنا چاہیے " ۔ امامؒ نے اس خط میں سوویت یونین میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا گہرا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں " کیمونزم کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز " سے تعبیر کیا۔ تعجب یہ ہے کہ اس خط میں ایک اور پیش گوئی کرتے ہوئے یقینی انداز میں خبردار کیا گیا تھا جس سے اس دور کے عالمی حالات کے تجزیئے میں امام خمینیؒ کی قدرت کی نشاندہی ہوتی ہے ۔

امام خمینیؒ ایسے اہداف اور امنگوں سے لوگوں کو آگاہ کر چکے اور جو کچھ انہیں بیان کرنا چاہیے تھا بیان کرنے کے علاوہ عملی

میدان میں اپنے تمام وجود کو اپنے اہداف ومقاصد کی تکمیل کی راہ میں بروئے کار لا چکے تھے۔اور اب امام 5 جون 1989ء کی دہلیز پر کھڑے اس عزیز دوست سے ملاقات کی تیاری کر رہے تھے جس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے انہوں نے تمام عمر صرف کی تھی۔امامؒ کا سر معبود حقیقی کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں جھکا۔اللہ کے علاوہ انہوں نے کسی اور طاقت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا اور آپ کی آنکھیں ذات احدیت کے سوا کسی اور ذات کی خاطر پرنم نہ ہوئی تھیں۔آپ کے تمام عارفانہ کلام میں محبوب حقیقی کی جدائی کے غم اور اسی کے لمحہ وصال کی تشنگی کی روداد بیان کی گئی ہے اور اب امام کیلئے وہ پرشکوہ لمحہ پہنچنے والا تھا جو آپ کے عقیدت مندوں کیلئے بہت زیادہ جانسوز وجانگداز اور ناقابل برداشت تھا۔

ہفتہ 13 خرداد بمطابق 3 جون 1989ء کو رات 10 بج کر 20 منٹ پر وصال کا لمحہ آپہنچا اور اس دل کی دھڑکن بند ہوگئی جس نے کروڑوں دلوں کو نور خدا اور روحانیت کے ذریعے زندہ کیا تھا۔زندگی کی آخری رات میں بھی امامؒ کے لب ذکر خدا میں ہل رہے تھے جبکہ آپ 87 سال کی ضعیف العمری میں کئی قسم کے آپریشنوں کی تکلیفیں سہہ چکے تھے۔مختلف اقسام کی دواؤں کی بوتلوں کی نالیاں امامؒ کے مبارک ہاتھوں میں لگی ہوئی تھیں تاہم ان حالات میں بھی امامؒ نافلہ شب میں مصروف اور قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے۔عمر شریف کے آخری لمحات میں بھی امام پر ایک ملکوتی طمانیت اور سکون طاری تھا۔آپ مسلسل کلمہ توحید اور حضور اکرمؐ کی نبوت پر شہادت کے الفاظ پڑھتے رہے اور اسی حالت میں آپ کی روح ملکوت اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔امامؒ کی جدائی سے دلوں میں ایسی آگ بھڑک اُٹھی جسے بجھانا ناممکن تھا۔امام کے وصال کی خبر نشر ہوئی تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی تباہ کن زلزلہ آیا ہے۔خبر سنتے ہی لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔اس موقع پر ایران اور دنیا کے گوشہ وکنار میں امام کے نام اور پیغام سے آشنائی رکھنے والی ہر آنکھ اشکبار تھی۔

مندرجہ بالا حقائق کی رو سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ امام خمینیؒ کی زندگی کی طرح آپ کی رحلت بھی ایک نئی بیداری اور نئی تحریک کا سرچشمہ بن گئی۔آپ کا مشن اور آپ کی یاد امر ہوگئی کیونکہ امام خمینیؒ بذات خود ایک حقیقت ہیں اور حقیقت ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

امام خمینیؒ کوثر کے جلوؤں کی ایک جھلک تھے اور کوثر ولایت کا چشمہ، ہر زمانے میں زمین پر جاری رہتا ہے۔ بالآخر خدا کے اس عبد صالح کی حکایت اسی طرح زندہ رہے گی۔

گر کسی ہست کہ فریاد کند بودن را

ہمہ از ہمت آن رند خدا جو باشد

(کوئی ہے جو زندہ رہنے کا نعرہ بلند کر سکے؟ صرف وہی خدا پرست شخص یہ جرأت کر سکتا ہے)

سلام علیہ یوم ولد و یوم مات و یوم یبعث حیا

(سلام ہو اس پر جس دن وہ پیدا ہوا، جس دن اس نے وفات پائی اور جس دن وہ دوبارہ زندہ کیا جائے گا)

رہبر معظم انقلاب سید علی خامنہ ای کی مختصر سوانح حیات

ولادت:

سید علی خامنہ ای (ایرانی سال کے مطابق) ۱۳۱۸ ہجری شمسی (1939ء) میں مشہد مقدس میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد آیت اللہ سید جواد کا شمار مشہد کے مجتہدین میں ہوتا تھا۔ آپ کے دادا حسین خامنہ ای کا تعلق آذر بائیجان سے تھا اور وہ نجف میں مقیم تھے۔

آپ کی والدہ سید ہاشم نجف آبادی (میر داماد) کی بیٹی ہیں، جو خود مشہد کے معروف عالم دین رہے ہیں۔ یہ خاتون انتہائی نیک، دینی احکامات سے واقف اور اسلامی اخلاق سے بہرہ مند شمار ہوتی تھیں۔

بچپن:

سید علی خامنہ ای کا بچپن ایک ایسے باپ کی زیرنگرانی گزرا جو اپنی سخت گیری کے باوجود انتہائی شفیق اور محبت کرنے والے شخص تھے اور والدہ بھی نہایت مہربان تھیں۔ آپ کا بچپن علمائے دین اور طالب علم خاندان کی حیثیت میں بہت تنگدستی میں گزرا۔

آیت اللہ خامنہ ای خود اس بارے میں فرماتے ہیں:

"میرا بچپن بہت تنگدستی میں گزرا۔ ہمارے خاندان کی صورتحال یہ تھی کہ ہم روزانہ گیہوں کی روٹی بھی نہیں کھا سکتے تھے بلکہ عام طور پر جو کی روٹی کھایا کرتے تھے۔ مجھے آج بھی بچپن کی وہ باتیں یاد ہیں جب رات کو ہمارے گھر میں کھانا نہیں ہوتا تھا اور میری والدہ ان پیسوں سے دودھ یا کشمش خرید لیتی تھیں جو ہماری نانی (یا دادی) مجھے یا میرے بھائی بہن کو کبھی کبھار دے دیا کرتی تھیں اور ہم اسی کو روٹی کے ساتھ کھا لیا کرتے تھے۔ میرے والد کا وہ گھر جس میں میری ولادت ہوئی، ۶۰، ۷۰ میٹر کا

 ایک غریب محلہ میں واقع چھوٹا سا مکان تھا۔اس میں صرف ایک کمرہ اور ایک چھوٹا سا تاریک اور گھٹن آلو دتہہ خانہ تھا۔"

آپ نے چھٹی جماعت کا سرٹیفکیٹ اپنے والد سے چھپ کر شام کی کلاسوں میں شرکت کر کے حاصل کیا اور اس کے بعد خفیہ طور پر انٹر تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔آپکی اسلامی تعلیمات کی ابتداء ایک مدرسہ سے ہوئی جس میں آپ نے عربی سیکھنا شروع کی۔ ۱۴سال کی عمر میں سلیمان خان نامی دینی علوم کے مدرسہ میں داخل ہو گئے اور ادبیات عرب کی تعلیم کو وہیں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔کتاب" شرائع" اپنے والد سے پڑھی اور جب حج کی بحث کا آغاز ہوا تو والد کی تجویز پر کتاب" لمعہ" کی بحث ِحج میں شرکت کرنے لگے۔مدرسہ سلیمان خان کے بعد مدرسہ نواب چلے گئے اور سطحی دروس (درس خارج سے پہلے کے دروس) کو مکمل کیا۔اس کے بعد مرحوم آیت اللہ العظمیٰ میلانی کے درس ِخارج میں شرکت کرنے لگے۔اس وقت آپ کی عمر ۱۶سال تھی۔

تعلیم وتدریس:

آپ نے تدریس کا عمل اپنی طالب علمی کے ساتھ ہی (یعنی انٹر کے فوراً بعد) شروع کر دیا تھا۔آپ نے پہلی کتاب جس کی باقاعدہ تدریس کی وہ" شرح امثلہ" یا" صرف میر" تھی جو آپ مشہد کے دو ذاکروں کو پڑھایا کرتے تھے۔آپ ۱۳۳۷ ہجری شمسی (۱۹۵۸ء) تک مشہد میں رہے اور اس دوران صرف ونحو ،معانی ،بیان ،اصول ِفقہ اور علم فقہ کی تدریس میں مصروف رہے۔تدریس کا یہ سلسلہ قم منتقل ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔

۱۳۴۳ (۱۹۶۴ء) میں جب آپ قم سے دوبارہ مشہد تشریف لائے،اس وقت بھی تدریس آپ کے روزمرہ کے پروگرام میں شامل تھی۔یہ سلسلہ ۱۳۵۶ (انقلاب سے ایک سال پہلے) تک جاری رہا اور اس وقت آپ حوزۂ علمیہ کے اعلیٰ سطح کے دروس (مکاسب وکفایہ) پڑھایا کرتے تھے۔اس زمانے میں آپ کی عمر ۲۸ سال سے زیادہ نہیں تھی۔آج بھی آپ کا درسِ خارج علوم دین کے طالب علم کے لئے ایک اہم مرکز شمار ہوتا ہے۔

اساتذہ:

آپ نے درس خارج سے قبل ساڑھے پانچ سال تک آقائے علوی، آقائے مسعود،اپنے والد بزرگوار،مرحوم آقا مرزا احمد مدرس یزدی،مرحوم آیت اللہ العظمیٰ میلانی اور آیت اللہ شیخ قاسم قزوینی جیسی شخصیات کے درس خارج میں شرکت کی۔فلسفہ آیت اللہ میرزا جواد آقا تہرانی سے پڑھا اور اس کے بعد شیخ رضا ایسی (جو مشہد میں فاضل اساتید میں سے تھے) کے درس میں شرکت کی۔

نجف اور قم روانگی:

ایران کے بزرگ اساتذہ سے استفادہ کرنے کے بعد آپ نجف روانہ ہو گئے جہاں آپ نے مرحوم آیت اللہ العظمیٰ حکیم،

مرحوم آیت اللہ العظمیٰ خوئی، مرحوم آیت اللہ العظمیٰ شاہرودی، مرحوم آقا میرزا باقر زنجانی، مرحوم آقا میرزا حسین یزدی اور مرحوم آقا سید یحییٰ یزدی سے کسب فیض کیا۔

آپ خود اس بارے میں کہتے ہیں:

"ان تمام دروس میں مجھے آیت اللہ حکیم کا درس روانی اور اعلیٰ فقہی نظریات کی بنا پر بہت پسند آیا۔ اور ایک درس آیت اللہ آقا میرزا حسین بجنودی کا پسند آیا جو مسجد طوسی میں درس دیا کرتے تھے۔ پھر میں نے نجف میں رکنے کا ارادہ کیا اور اپنے والد کو خط لکھا کہ اگر ہو سکے تو میں یہیں رک جاؤں۔ لیکن والد نے اجازت نہیں دی اور میں مشہد لوٹ آیا۔ کچھ عرصہ بعد قم روانہ ہو گیا۔ قم جا کر میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے تمام دروس میں جا کر دیکھوں اور پھر جو پسند آیا اس میں مستقل شرکت کروں گا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ ان دروس میں سے میں امام خمینیؒ کے درس اور اس کے بعد آیت اللہ آقا مرتضیٰ حاج شیخ اور آیت اللہ العظمیٰ بروجردی کے درس میں جانے لگا۔ امام خمینیؒ کے فقہ و اصول کے درس میں مستقل طور پر شرکت کیا کرتا تھا۔ فلسفہ اور شفاء کے لئے کسی حد تک علامہ طباطبائی کے درس سے استفادہ بھی کیا۔"

عملی جدو جہد:

آیت اللہ خامنہ ای ایک باتقویٰ اور بہادر مجاہد ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی قلم، زبان اور ہتھیار کے ذریعہ جہاد کرتے ہوئے گزاری۔ اور خاص طور پر ۱۳۴۱ ہجری شمسی کہ جب امام خمینیؒ نے اپنی عظیم اسلامی تحریک کا آغاز کیا، تو اس کے بعد ایک لمحہ کیلئے بھی آپ نے جدو جہد کو ترک نہیں کیا۔

سیاسی جدو جہد میں شرکت کی تحریک نواب صفویؒ کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ اس بارے میں رہبر معظم خود فرماتے ہیں:

" سیاسی جدو جہد کے میدان میں اترنے کے حوالے سے ۱۳۳۱ اور ۱۳۳۲ ہجری شمسی کا دور تھا کہ میں نے سنا کہ مرحوم نواب صفوی مشہد آئے ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے میرے اندر ایک پوشیدہ جذبہ تھا جو مجھے مرحوم نواب کی طرف کھینچنے لگا۔ نواب کو دیکھنے کو بڑا دل چاہا۔ اور پھر یہ خبر ملی کہ نواب مدرسہ سلیمان خان میں آ رہے ہیں۔ میں بھی وہیں کا طالب علم تھا۔ وہ دن میری زندگی کا ناقابل فراموش دن ہے۔ جب وہ فدائیان اسلام کے چند افراد کے ساتھ مدرسہ میں آئے اور سخت لہجے میں تقریر شروع کی۔ ان کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ اسلام کو زندہ ہونا چاہیے۔ اسلام کو حکومت کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے انہوں نے شاہ، برطانیہ اور حکومتی عہدیداروں کو سخت لہجے میں مورد الزام ٹھہرایا اور جھوٹا قرار دیا اور کہا: "یہ عہدیدار مسلمان نہیں ہیں۔" میں یہ الفاظ پہلی بار مرحوم نواب کی زبان سے سن رہا تھا اور اس قدر مجھ پر اثر ہوا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہوں۔ وہیں پر اعلان ہوا کہ دوسرے دن وہ مدرسہ نواب جائیں گے۔ مدرسہ کی طرف آتے ہوئے وہ نعرے لگا رہے تھے۔ اے غیرت مند مسلمان بھائی! اسلام کو حکومت کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ وہ مدرسہ پہنچ گئے۔ وہاں بھی انہوں نے تفصیلی اور پر جوش تقریر کی۔ پھر جب مرحوم نواب

مشہد سے چلے گئے تو ہمیں ان کی کوئی اطلاع نہیں ملی، یہاں تک کہ ان کی شہادت کی خبر مشہد پہنچی۔ جب ان کی شہادت کی خبر مشہد پہنچی تو ہم غیض وغضب میں اس طرح مبتلا ہو گئے تھے کہ مدرسہ کے صحن میں بے اختیار نعرے لگا رہے تھے اور شاہ کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ مرحوم آیت اللہ حاج شیخ مرحوم نے نواب صفوی ؒ کی شہادت پر ردعمل کا اظہار کیا تھا اور اپنے درس میں مرحوم نواب صفوی ؒ اور ان کے ساتھیوں کی حکمرانوں کے ہاتھوں شہادت پر سخت تنقید کی تھی اور اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے کہا: ہمارے ملک کا اب یہ حال ہوگیا ہے کہ فرزند رسولؐ کو حق گوئی کے جرم میں قتل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انقلاب اسلامی کی چنگاری نواب صفوی ؒ کے وسیلے سے میرے دل میں پیدا ہوئی۔ مجھے اس بارے میں کوئی تردید نہیں ہے کہ پہلی چنگاری شہید نواب صفوی ؒ ہی نے میرے دل میں روشن کی تھی۔ بنابریں مرحوم نواب صفوی ؒ کے اثرات ہی سبب بنے کہ ۱۳۳۴ یا ۱۳۳۵ ہجری شمسی میں ہماری جدوجہد کا آغاز ہوگیا۔ وہ اس طرح کہ فرخ نامی شخص صوبائی گورنر کے طور پر مشہد آیا جو دینی اقدار ورسم ورواج کا سرے سے قائل نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ماہ محرم اور صفر میں جب کہ مشہد کے سینما عام طور پر بند ہو جاتے تھے، اس نے سینما میں صرف ۱۴ محرم تک چھٹی کا اعلان کیا اور جب کچھ شورشرابا ہوا تو اس نے ۲۰ محرم تک چھٹی میں اضافہ کر دیا۔ لہٰذا ہم چند افراد مل بیٹھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے پمفلٹ لکھا اور ڈاک کے ذریعہ مختلف علاقوں میں بھیج دیا۔"

۱۳۴۱ ہجری شمسی (۱۹۶۲ء) میں امام خمینی ؒ کی آواز پر حوزۂ علمیہ قم نے قیام کیا اور اس مرکز علم وتقویٰ اور جہاد وشہادت میں ایک نیا جوش پیدا ہوگیا۔

علماء اور دینی طلاب انتہائی خلوص اور شجاعت کے ساتھ امام خمینی ؒ اور دوسرے مراجع تقلید کی ہدایات کو ایران کے دور دراز علاقوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ آیت اللہ خامنہ ای نے اس معاملے میں عظیم کردار ادا کیا تھا۔ آپ نے قم کی سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے مشہد کے علماء وطالب علموں کے ساتھ رابطہ کو مضبوط کیا اور کوشش کرتے رہے کہ خراسان کے تمام علماء کی سرگرمیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طالب علموں کو زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر طور پر تیار کریں۔

آپ کی یہ کوششیں اس قدر موثر اور زبردست تھیں کہ ۱۳۴۲ ہجری شمسی (۱۹۶۳ء) میں امام خمینی ؒ کی جانب سے آپ کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ تین اہم پیغام مشہد لے کر جائیں۔ یہ تین پیغام ۱۵ خرداد ۱۳۴۲ ہجری شمسی (۱۹۶۳ء) کے تقدیر ساز واقعہ سے متعلق تھے۔

آپ نے اپنی سیاسی جدوجہد کے آغاز سے انقلاب اسلامی کی کامیابی (۱۱ فروری ۱۹۷۹ء) تک اپنی بابرکت زندگی کا اکثر حصہ جیل، جلاوطنی یا شاہ کی انٹیلی جینس ایجنسی، ساواک سے بچنے کی خاطر روپوشی میں گزارا۔

انقلاب کی کامیابی کے بعد آپ کی ذمہ داریاں:

۱۔ ثقافتی انقلاب کی شوریٰ کی رکنیت۔
۲۔ امام خمینی ؒ کے استقبال کی کمیٹی کی ذمہ داریاں۔

۳۔مارچ اپریل ۱۹۷۹ء میں امام خمینیؒ کی جانب سے صوبہ سیستان و بلوچستان میں ذمہ داریاں۔
۴۔وزارت دفاع میں شورائے انقلاب کی نمائندگی۔
۵۔سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی کی سرپرستی۔
۶۔یونیورسٹی کے طالب علموں کے مسائل کا حل۔امام خمینیؒ کے کہنے پر یونیورسٹی کے طالب علم آپ کے پاس آتے اور اپنے مسائل بیان کرتے تھے۔
۷۔تہران کی نماز جمعہ کی امامت۔

آیت اللہ طالقانی کی وفات کے بعد ۱۹۸۰ء میں امام خمینیؒ نے ایک حکم جاری کیا جس کے مطابق آیت اللہ خامنہ ای کو نماز جمعہ،تہران کی امامت پر منصوب فرمایا۔امام خمینیؒ نے اس حکم میں لکھا: آپ کو جوکہ الحمدللہ بہترین ماضی رکھنے والی شخصیت ہیں اور علم وعمل میں شائستہ مقام رکھتے ہیں،تہران کی نماز جمعہ کی امامت کے لئے منصوب کیا جاتا ہے۔

۸۔مجلس شورائے اسلامی (پارلیمنٹ) میں نمائندگی۔
۹۔اعلیٰ دفاعی کمیٹی میں امام خمینیؒ کے مشیر۔
۱۰۔صدارت۔

شہید رجائی اور شہید باہنر کی شہادت کے بعد علماء اور تمام انقلابی اداروں کی جانب سے آپ کو صدارت کا امیدوار قرار دیا گیا اور عام انتخابات میں آپ عوام کی اکثریت رائے سے اسلامی جمہوریہ ایران کے تیسرے صدر منتخب ہوئے۔

آپ کی صدارت کا آغاز ایسے زمانے میں ہوا جب ملکی صورتحال انتہائی حساس تھی۔امام خمینیؒ کے ۷۲ باوفا ساتھیوں بالخصوص شہید بہشتی،باہنر اور رجائی کی شہادت،مسلسل ہونے والے دھماکے،ٹارگٹ کلنگ اور اس سے پیدا ہونے والے حالات،،بنی صدر جیسے غدار کی صدارت کے برے اثرات،عراق کی جانب سے ایران پر مسلط کی جانے والی جنگ سے پیدا ہونے والی مشکلات،اقتصادی بائیکاٹ اور بہت سے دوسرے عوامل کی وجہ سے ملکی حالات انتہائی بحرانی تھے۔

۲ تیر ۱۳۶۰ ہجری شمسی (1982ء) کو جب آپ مسجد ابوذر میں تقریر کر رہے تھے تو سنگدل منافقوں نے آپ پر قاتلانہ حملہ کیا جس سے آپ شدید زخمی ہو گئے۔اس قاتلانہ حملے کے بعد امام خمینیؒ نے ایک پیغام آپ کو بھیجا جس میں تحریر فرمایا:

" آپ،جوکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حسینؑ بن علیؑ کی نسل سے ہیں اور اسلام اور اسلامی ملک کی خدمت کے علاوہ آپ کا کوئی جرم نہیں ہے اور جنگی محاذ پر فدا کار سپاہی،محراب میں تعلیم دینے والے استاد اور (نماز) جمعہ و جماعت میں بہترین خطیب اور انقلابی میدان میں ہمدرد رہنما ہیں،دشمنان انقلاب اور اسلام نے آپ پر قاتلانہ حملہ کر کے اپنی سیاسی فکر کے معیار،عوام کی مخالفت اور ظالموں کی حمایت کو ثابت کر دیا ہے۔انہوں نے آپ پر حملہ کر کے پورے ملک بلکہ دنیا بھر کے لاکھوں نظریاتی انسانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔یہ لوگ سیاسی شعور سے اتنے بے بہرہ ہیں کہ انہوں نے ایک ایسی شخصیت پر حملہ کیا کہ جس

کی دعوت کی پکار پوری صلاحیت اور مضبوطی کے ساتھ مسلمانوں کے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔میں خامنہ ای عزیز کو مبارک باد پیش کرتا ہوں جو جنگی محاذ پر سپاہی کے لباس میں اور محاذ جنگ کے علاوہ عالم دین کے لباس میں اس مظلوم ملت کی خدمت (میں مصروف ہیں) اور خداوند متعال سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے آپ کی صحت وسلامتی کیلئے دعا کرتا ہوں"

رہبر انقلاب:

عالم اسلام کے چمکتے سورج، عالم عرفان کے دمکتے ستارے، مجاہدین راہ حق کے دل کا سرور انقلاب اسلامی کے عظیم رہبر، راہ حق میں کئی برسوں کی جدوجہد، خالص محمدی اسلام کو متجلی کرنے اور اسلام اور مسلمانوں کی سچی خدمت کے بعد ۱۳ خرداد ۱۳۶۸ ہجری شمسی (1989ء) میں اس دنیا سے رحلت کر گئے اور عالم اسلام کو سوگوار کر دیا۔انقلاب کے عظیم رہبر کے انتقال کے بعد مجلس خبرگان نے ایک خصوصی اجلاس میں پوری اکثریت کے ساتھ آیت اللہ خامنہ ای کو امام خمینیؒ کا جانشین اور اسلامی انقلاب کا رہبر منتخب کرلیا۔

امام خمینیؒ کی توجہ:

اسلامی نظام کے بانی (امام خمینیؒ) کے کلام میں آیت اللہ خامنہ ای کا ایک خاص مقام نظر آتا ہے۔آپ ایک مقام پر رہبر معظم انقلاب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "میں آپ کو جمہوری اسلامی (ایران) کا ایک مضبوط بازو سمجھتا ہوں اور ایسا بھائی سمجھتا ہوں جو فقہی مسائل سے آگاہ اور ان پر پابند ہیں اور ولایت فقیہ سے متعلق فقہی بنیادوں کی پوری حمایت کرتے ہیں"

امام خمینیؒ آگے چل کر انہیں چمکتا سورج کہتے ہوئے فرماتے ہیں: "اسلام اور اسلام کی بنیادوں سے وفاداری رکھنے والوں اور دوستوں میں آپ ان نادر افراد میں سے ہیں جو سورج کی طرح روشنی پہنچا رہے ہیں۔"

دین کے دشمن منافقوں کے ہاتھوں آیت اللہ خامنہ ای پر قاتلانہ حملے کے بعد امام خمینیؒ نے فرمایا: "میں نے آقائے خامنہ ای کی پرورش کی ہے۔نیز امام خمینیؒ آپ کو آیہ "أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" وہ کفار پر سخت گیر اور آپس میں مہربان ہیں۔(سورہ فتح:۲۹) کا مصداق سمجھتے ہیں۔

آیت اللہ خامنہ ای کی اسلامی انقلاب کے ساتھ ہمراہی اور ہمگامی کے بارے میں امام خمینیؒ فرماتے ہیں: "میں انہیں کئی سالوں سے پہچانتا ہوں، جس زمانے میں تحریک کا آغاز ہوا، یہ (انقلابی فکر پہنچانے میں) ماہر تھے اور پیغام پہنچانے کے لئے اطراف میں جایا کرتے تھے۔اور اس کے بعد جب انقلاب اپنے عروج پر پہنچا تو اس وقت بھی آپ آخر تک موجود تھے اور آج بھی ہیں۔یہ خدا کی ایک نعمت ہیں جو اس نے ہم کو دی ہے۔"

امام خمینیؒ ایک اور جگہ پر آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"آپ جنگی محاذ پر ایک فداکار سپاہی ،محراب میں استاد (نماز) جمعہ و جماعت میں بہترین خطیب اور انقلابی میدان میں ہمدرد رہنما ہیں۔"

ایک اور مقام پر آیت اللہ خامنہ ای کی علمی عظمت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"جو بولنے والے افراد ہیں وہ یونیورسٹی میں آمدورفت رکھیں۔اور میں آقائے سید علی کو تجویز کرتا ہوں کہ وہ ضرور یونیورسٹیز میں آمدورفت رکھیں،آقائے خامنہ ای۔آپ ان کے پاس جاسکتے ہیں اور میری جانب سے ان سے کہہ دیں کہ وہ آقائے مطہری کی جگہ آمدورفت رکھیں۔بہت بہتر ہے۔وہ دینی وفکری سمجھ بوجھ کے کام ہیں۔گفتگو بھی کرسکتے ہیں بات بھی کرسکتے ہیں۔"

امام خمینیؒ آپ کو پوری صراحت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا نمونہ سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں آپ سے عرض کرتا ہوں ،اگر آپ گمان کرتے ہیں کہ پوری دنیا میں سربراہان مملکت ،بادشاہوں اور ان جیسے دوسرے افراد کے درمیان ایک آدمی آقائے خامنہ ای جیسا آپ کو مل جائے گا جو اسلام کے ساتھ وفادار ہو اور جس کے دل کی بنیاد اس بات پر قائم ہو کہ ملت کی خدمت کی جائے تو نہیں ملے گا۔"

رہبری کے حوالے سے امام خمینیؒ کی تائید:

رہبری کے اعتبار سے بھی امام خمینیؒ کی آپ پر خاص توجہ تھی۔

چنانچہ آقائے رفنجانی کہتے ہیں:

"جن دنوں رہبری کے مسئلے پر کچھ بحث ومباحثہ ہوا تو ہم پریشان ہورہے تھے کہ رہبری کے معاملے میں خلاء پیدا نہ ہوجائے۔"

امام خمینیؒ نے فرمایا:

"رہبر کے معاملے میں خلاء پیدا نہیں ہوگا تمہارے پاس رہبری کے قابل شخصیت ہے۔" ہم نے پوچھا" وہ کون؟" تو آپ نے آقائے خامنہ ای کی موجودگی میں فرمایا:" یہی آقائے خامنہ ای۔"

مرحوم سید احمد خمینیؒ (فرزند امام خمینیؒ) بھی اس بارے میں ایک یادگار واقعہ سناتے تھے۔

"جب آیت اللہ خامنہ ای شمالی کوریا کے دورے پر گئے ہوئے تھے اور امام خمینیؒ ٹی وی پر اس کی رپورٹ دیکھ رہے تھے۔اس وقت آپ نے فرمایا تھا کہ حق بات یہ ہے کہ یہ (خامنہ ای) رہبر بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

اسی طرح امام خمینیؒ کی بیٹی خانم زہرا مصطفوی کہتی ہیں:

"میں نے جانشین رہبر (آقائے منتظری) کی برطرفی سے مدتوں پہلے ذاتی طور پر امام خمینیؒ سے آئندہ کے رہبر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے آقائے خامنہ ای کا نام لیا تھا۔میں نے ان کے علمی مرتبہ کے بارے میں پوچھا تو امام خمینیؒ نے صراحت کے ساتھ کہا تھا۔ولی فقیہ کے لئے جو اجتہاد ضروری ہے،یہ اس کے مالک ہیں۔"

رہبر معظم کے اخلاقی فضائل وعلمی مقام

علمی مقام:

آپ ایک ایسے عالم ہیں جومختلف اسلامی علوم (فقہ،اصول،تفسیر،حدیث،فلسفہ ورجال تاریخ،اقتصاد،سیاست،مسائل اجتماعی،ادب وہنر میں صاحب نظر ہیں اورحوزہ علمیہ ویونیورسٹی میں قابل قبول شخصیت ہیں۔آپ ایک مسلّم مجتہد،مدیرمُدبّر ایک دقیق جامعہ شناس،صاحب نظرمحقق ،گہرے نکات بیان کرنے والے مفسّر ،ماہر اقتصاد دان،باتجربہ سیاستدان ،مسلط تاریخ دان،بڑے ادیب اورہنر کے شعبے میں صاحب نظر ہیں ۔

عاشقِ قرآن:

آیۃ اللہ العظمیٰ خامنہ ای مکتبِ قرآن کے تربیت یافتہ اوراس سے حقیقی آشنا ہیں ۔آیاتِ قرآنی کی تلاوت کوآپ دل وجان سے سنتے ہیں ۔معارف وحی کی روشنی میں اپنی کامیابی اورامیدوں کو پانے والے ہیں،شاہ ایران کے طاغوتی گروہ کے سیاہ اورتاریک دور میں جب قرآن مجالس عزااورمساجد کی حد تک محدود تھااورقاریان قرآن سن رسیدہ،ضعیف لوگ تھے اس وقت بھی آپ کاتفسیر قرآن کادرس غبارآلود دلوں کی پاکیزگی کا سبب تھااورآپ معارف قرآن کے شیرین مطالب سے عاشقان قرآن کے تشنہ ذہنوں کو سیراب فرماتے تھے ۔انقلابی اورمسلمان جوانوں کے لئے آپ پناہ گاہ تھے ۔اس زمانے میں جب ظاہری روشن فکرافراد جوسرگرداں تھے اورانہوں نے اپنی جان وفکرکی توجہ کاافق مشرق ومغرب کوقرار دیااوراپنے مقاصد کو وہاں تلاش کررہے تھے نام نہاد روشن فکرلوگ تلاوتِ قرآن کامذاق اڑا رہے تھے اوراسے پرانے زمانے کے دستور سے توصیف کرتے تھے ۔ایسے وقت میں آپ نے قرآن سے دل لگایا،اپنی توجہ قرآن پرمرکوز کردی اوراس خورشید عظیم کے نوروحرارت سے آپ سکون واطمینان حاصل کرتے تھے ۔

قناعت اورآزادی:

سادگی اورقناعت آپ کی زندگی کاایک افتخار ہے،قناعت اورسادگی کے زیور سے آراستہ ہونااورطمع،حرص اورتکبر جیسے اخلاقی رذائل سے پاک ہونا آپ کے روشن حالات واخلاق میں سے ہے ۔کبھی بھی آپ کی زندگی میں ایسا نہیں ہواکہ غنی ہونے پر اسراف اورفضول خرچی کی ہو یاتنگدستی وناداری کی وجہ سے عزت نفس کو پامال کیا ہو۔آپ نے مسلسل اپنے آپ کو دنیا کے فریب دینے والے جلووں کی آلودگی سے محفوظ رکھا۔آپ نے استقامت،بلندنظری اوربزرگواری کواپنی زندگی کاشیوہ قرار دیا۔

حجۃ الاسلام والمسلمین قرائتی فرماتے ہیں: "اپنی دختر عزیز کے عقد کیلئے ہم آپ کے ذاتی گھر گئے آپ کے گھر کا قالین ایسا تھا کہ جا بجا دھاگے نکل آئے تھے، آپ کی صدارت کے زمانے میں جب نماز میں ان کی اقتدا کر رہے تھے آپ نے اپنے کمرے کے اضافی بلبوں کو بجھا دیا اور صرف ایک بلب روشن رہنے دیا۔"

◆ عاشق اہل بیت علیہم السلام:

آپ مکتب اہل بیت علیہم السلام سے تربیت یافتہ ہیں اور ان کی زندگی سے درس لینے والے ہیں۔ آپ کا وجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان سے سچے عشق اور محبت سے پر ہے۔ آپ اہل بیت علیہم السلام کی پیروی اور ان سے توسل کو بلند کمالات اور بے مثال خالق سے تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، آپ کی مسلسل کوشش، اپنی بابرکت عمر کو اس نورانی راہ میں صرف کرنا اور اہل بیت علیہم السلام کیلئے منعقد ہونے والے جشن اور سوگواری کی مجالس میں ہمیشہ حاضر ہونا یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کس قدر اہل بیتؑ کے عاشق ہیں۔

◆ لوگوں کے ساتھ آپ کی محبت:

آپ کی پوری بابرکت زندگی مستضعف اور دیندار لوگوں سے محبت میں گزری ہے، یہی چیز لوگوں کے پاک دلوں میں امید کی کرن روشن کرنے اور ان کے اعتماد کا باعث ہے۔

اسلامی انقلاب کے مختلف حوادث کے دوران اور اس کے بعد میدان جنگ میں اور ملک کو سنبھالنے میں نہ تھکنے والے اس عظیم مجاہد کا چہرہ درخشان ہے، اب بھی مستضعفین اور ملک کے دور دراز علاقوں کے غریبوں اور رفاہی امکانات سے محروم لوگوں کے دیدار کے ذریعہ محبت اور خلوص کے ساتھ ان کے ہم نشین ہو کر ان کے دلوں کو اپنی محبت سے پر کرتے ہیں۔

شہداء کے خاندان آپ سے بڑی محبت کرتے ہیں، آپ نے اپنے اخلاص اور ہمدردی سے ان کیلئے روشنی اور امید کا باب کھول کر انقلاب اور اس کے بانی کی راہ پر چلتے رہنے کے جذبے کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ آپ کے کمالات میں سے ایک یہ ہے کہ آپ بغیر اطلاع دیئے ہوئے شہداء کے گھروں پر (احوال پرسی) کیلئے حاضر ہوتے ہیں تا کہ وہ زیادہ تکلفات میں نہ پڑیں۔

◆ شجاعت:

شجاعت اور مردانگی آپ کی روشن خصوصیات میں سے ہے۔ طاغوت کے سیاہ دور میں آپ کا دلاورانہ جہاد اور قید ہو جانے یا شہر بدر کئے جانے کے باوجود اپنے جہاد کو جاری رکھنا، مقابلے کے میدان میں مسلسل حاضر رہنا اور پوری جسارت کے ساتھ صریح لہجہ میں دشمنوں کی مذمت کرنا بعنوان مثال آپ کی وہ بے مثال تقریر جو آپ نے اقوام متحدہ کے جلسے میں کی، جو تمام ممالک

کے لئے باعثِ حیرت اور دنیا کی بڑی طاقتوں کو وحشت زدہ کرنے کا سبب بنی۔

اسی طرح آپ کا ظالموں اور ستمگروں سے نہ ڈرنا اور اس حال میں آپ کا ایران کے نیک اور صالح لوگوں کے سامنے خضوع وخشوع کرنا، یہ سب آپ کی خصوصیات میں سے ہے۔

رہبر معظم انقلاب اسلامی فقہاء و علماء کی نگاہ میں

1۔علم و فقاہت

◆ آیۃ اللہ العظمیٰ فاضل لنکرانیؒ:

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ فاضل لنکرانی (رہ) رہبر معظم کے علمی مقام کے بارے میں لکھتے ہیں :" میں جو کہ مجلس خبرگان رہبری کا باقاعدہ عضو بھی ہوں اور آیۃ اللہ خامنہ ای (کی صلاحیتوں) سے بھی آشنا ہوں ۔میری ان کے بارے میں رائے یہ ہے کہ وہ مرتبہ اجتہاد پر فائز صاحب نظر شخصیت ہیں بیس سال پہلے جب مشہد مقدس مسجد گوہر شاد میں ان سے ملاقات ہوئی تو اس وقت ان کا شمار مشہد کے (حوزہ علمیہ) کے مدرسین میں سے ہوتا تھا میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا پڑھاتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: مکاسب (فقہ کے موضوع پر اہم کتاب) مکاسب (حوزہ علمیہ میں پڑھائی جانے والی) مہم ترین اور مشکل ترین علمی کتابوں میں سے ہے۔میری نظر میں آپ ایک فقیہہ اور مجتہد ہیں (کتاب امام حاضر مدیر ناظر،ص:125)"

◆ آیۃ اللہ مشکینیؒ:

مجلس خبرگان میں موجود اکثر فقہا، علماء اور مجتہدین کی تائید و تصدیق اور بالخصوص حضرت امام خمینیؒ کی کئی مرتبہ کی تائید کہ انہوں نے فرمایا: آپ (رہبر معظم سید علی خامنہ ای) معاشرے کی رہبری کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے فقیہ و مجتہد ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اور آپ قرآن وسنت سے حکم شرعی کے سمجھنے اور اُسے نکالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس میں شک کرنا کہ آیۃ اللہ خامنہ ای مقام اجتہاد پر فائز ہیں سوائے کسی کے ذاتی اغراض و مقاصد کے اور کچھ نہیں۔(خطبہ نماز جمعہ قم المقدسہ)

تمام مسلمانوں پر عقلاً و شرعاً واجب ہے کہ حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای کی بعنوان فقاہت و ولایت امر المسلمین شناخت کریں کیونکہ آپ فقاہت واجتہاد کے ساتھ ساتھ ولایت فقیہ کی دیگر شرائط کے حامل ہیں۔

(مرجعیت از دیدگاہ فقہا و بزرگان، دفتر تبلیغات اسلامی قم المقدسہ)

◆ آیت اللہ جوادی آملی دامت برکاتہ:

آیت اللہ جناب آقائے سید علی خامنہ ای کی عدالت و اجتہاد مورد تائید ہیں۔ اُمت مسلمہ کیلئے ضروری ہے کہ اُن کی رہبریت کو تقویت پہنچانے کیلئے کسی بھی قسم کی قربانی دینے سے گریز نہ کریں۔

" تکون کلمۃ اللہ ھی العلیاء والسلام علی من اتبع الھدیٰ"

(کتاب: مرجعیت از دیدگاہ فقہا و بزرگان، دفتر تبلیغات اسلامی قم المقدسہ)

2۔ عدالت وتقویٰ

◆ آیۃ اللہ شہید دستغیبؒ:

آیۃ اللہ خامنہ ای دامت برکاتہ کے بارے میں فرماتے ہیں: میں نے جس چیز کو اس عظیم شخصیت کے بارے میں سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ عبد خدا ہیں، ہوا پرست نہیں ہیں، مقام و منصب نہیں چاہتے، قدرت کے طالب نہیں ہیں، انقلاب کی کامیابی سے پہلے اور بعد میں آزمائشوں اور امتحانات سے گزر چکے ہیں، جس مقام و منصب پر رہے ہیں وہاں آزمائے جا چکے ہیں۔

اُس وقت جب آپ امام جمعہ تہران تھے، محاذ جنگ پر جاتے ہیں، مورچہ سنبھالتے ہیں اور اسلام کا دفاع کرتے ہیں۔ یہ عظیم شخصیت اپنے لیے کسی مقام و مرتبہ کی قائل نہیں ہے بالکل رہبر کبیر امام خمینیؒ کی طرح جس طرح انہوں نے فرمایا تھا کہ مجھے رہبر کی بجائے خدمتگزار کہا کریں۔ آقائے خامنہ ای بھی اس طرح ہی ہیں۔ مقام و مرتبہ نہیں چاہتے اور مقام و منصب اُن پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ (کتاب: ولایت فقیہ، قانون عزت و اقتدار، ج ۴، ص ۲۹۹)

◆ آیت اللہ سید رضا بہاؤ الدینیؒ:

رہبر معظم انقلاب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: امام خمینیؒ کے بعد اگر کسی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے تو وہ یہ سید (علی خامنہ ای) ہیں، کوئی بھی روح اللہ (امام خمینیؒ) نہیں بن سکتا لیکن آقا سید علی خامنہ ای حقیقتِ ولایت فقیہ ہیں۔ (کتاب: بصیرت، ص ۱۳۱)

◆ آیت اللہ جوادی آملی دامت برکاتہ:

ایک دفعہ میں رہبر معظم کا مہمان تھا۔ آقا مصطفیٰ (رہبر کے فرزند) ہمارے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ دسترخوان لگایا گیا، آیۃ اللہ خامنہ ای نے آقا مصطفیٰ کو دیکھا اور فرمایا آپ گھر چلے جائیں، میں نے آقا کی خدمت میں عرض کیا، اجازت دیں کہ آقا زادہ (آقا مصطفیٰ) بھی ہمارے ساتھ کھانا کھائیں، میں نے اس کو کہا ہے کہ اکٹھا بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ آقا خامنہ ای نے فرمایا: یہ کھانا

 بیت المال سے ہے، آپ بیت المال (دفتر) کے مہمان ہیں، میرے بچوں کیلئے جائز نہیں ہے کہ اس دسترخوان پر بیٹھیں، یہ گھر جائیں اور گھر سے کھانا تناول فرمائیں۔

میں اسی لمحے سمجھ گیا کہ خداوند تعالیٰ نے آقا خامنہ ای کو کیوں اتنی عزت عطا فرمائی ہے۔

◆ آیت اللہ مصباح یزدی دامت برکاتہ:

میں تہ دل سے یہ بات عرض کر رہا ہوں کہ اگر مجھ جیسے افراد دن رات تسبیح ہاتھ میں لے کر بیٹھے رہیں اور اس نعمت کا شکر ادا کرتے رہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہمیں ان جیسا (رہبر معظم انقلاب سید علی خامنہ ای دامت برکاتہ) رہبر عطا کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ ہم اس نعمت کا شکر ادا نہیں کر پائیں گے۔

ہم اس چیز کا ادراک نہیں کر سکتے کہ خداوند تعالیٰ نے ہمیں کتنی بڑی نعمت سے نوازا ہے کہ ان تمام خصوصیات کو (جو ایک رہبر کیلئے ضروری ہیں جیسے علم، تقویٰ اور مدیریت) ایک شخص میں جمع کر دیا ہے۔ آج خداوند تعالیٰ کی مرضی سے (رہبر انقلاب) دین اسلام کے پرچمدار و حامی، تشیع و اسلام کو رواج دینے والی ایسی شخصیت ہیں کہ جو باتقویٰ و بابصیرت ہیں۔

ہم تہ دل سے دعا گو ہیں کہ خداوند تعالیٰ، ان کی عمر بابرکت، عزت اور تائیدات میں اضافہ فرمائے۔ واقعاً ہمارے رہبر عظیم الشان کی زندگی میں معصومؑ کی زندگی کا عکس و جھلک نظر آتی ہے۔ جب بھی، جس طرف ہمیں اشارہ کریں گے ہم اُسی سمت حرکت کریں گے۔ اگر انہوں نے فرمایا آگے بڑھو تو آگے بڑھیں گے اور اگر روک دیا تو رُک جائیں گے اور ولایت فقیہ کا مطلب بھی یہی ہے۔ ورنہ فتویٰ دینا مراجع عظام کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ ذمہ داری ہمیشہ سے تھی اور اب بھی ہے۔ ولایت کا مطلب یہ ہے کہ حاکمیت رکھتا ہو یعنی حاکم ہو، لہٰذا جب فرمائے آگے بڑھو تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم بغیر کسی تامل یا بحث کریں کہ آقا جان آپ کو صحیح سمجھ آئی ہے یا نہیں، (آپ نے حقائق کو درک کر کے حکم دیا ہے یا نہیں) وہ کمانڈر ہیں۔ جس طرح محاذ پر کمانڈر لشکر کو حکم دیتا ہے آگے بڑھو، تو اس کو بڑھنا ہوگا، لشکر کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھے۔

3۔ مدیریت ورہبری

◆ آیۃ اللہ جوادی آملی دامت برکاتہ:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس طرح امام خمینیؒ نے ولایت فقیہ کو زمانہ غیبت میں نمایاں کر کے عملی بنایا اسی طرح رہبر معظم انقلاب حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای (مدظلہ العالی) نے امام راحلؒ کے جانے کے بعد نظام ولایت فقیہ کو کارآمد ثابت کرنے اور اس نظام کو مختلف جوانب سے اجاگر کرنے میں بہت خوبصورتی سے عملی اقدامات کیے اور اس نظام کو اس انداز میں برقرار رکھا

کہ نظام ولایت فقیہ اپنی بہترین صورت میں نمایاں نظر آیا۔

حضرت ولی العصر حجۃ ابن الحسن علیہما السلام سے رہبر معظم انقلاب کیلئے کہ جنہوں نے مقدس اسلامی نظام حکومت کو اور نظام جمہوری اسلامی کو اپنی حکیمانہ اور عقلمدانہ رہبری کے ساتھ صحیح راہ پر استوار رکھا ہے خصوصی عنایات کے طلبگار ہیں ۔

آیت اللہ مصباح یزدی دامت برکاتہ:

ہر عقلمند منصف انسان اس چیز کو قبول کرتا ہے کہ گزشتہ تین دہائیوں میں امام راحلؒ اور حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای دامت برکاتہ نے داخلی وخارجی امور میں ہر جہت سے بہترین مدیریت کی ہے ۔کئی بار اس نظام کو بحران سے نجات دلائی ہے ۔

ضروری ہے کہ ہم اپنے ہوش وحواس کے ساتھ رہبر معظم انقلاب کے فرمودات کو توجہ سے سنیں کیونکہ خداوند متعال نے ان کے وجود میں ایک ایسا نور اور بصیرت عطا فرمائی ہے جو کسی اور کو عطا نہیں ہوئی ۔لہٰذا کفران نعمت ہے کہ اس 40 سالہ سیاسی واجتماعی جدوجہد اور رہبری کے باوجود ہم یہ جرأت کریں کہ اُن کے حسن تدبیر اور مدیریت سیاسی میں شک کریں ۔

◆ آیت اللہ امامی کاشانی دامت برکاتہ:

آیت اللہ خامنہ ای دامت برکاتہ سیاست وحکومت کے تمام امور سے واقف ہیں، آپ ایسی شخصیت میں جو باتقویٰ، محبوب، مخلص، عالم اور فقیہ ہیں ۔

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

آواز حق بلند کرنے پر قید و بند کی صعوبتیں

۱۹۸۱ء میں جب ایران میں آیت اللہ بہشتی اپنے ۲۷ ساتھیوں کے ہمراہ شہید ہوئے تو سب نوجوانوں کے دل شدید غمگین تھے لیکن اس واقعہ کے ٹھیک ایک ماہ بعد جب اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر محمد علی رجائی اور وزیر اعظم باہنر کے اکٹھے شہید ہونے کی اطلاع پاکستان پہنچی تو پاکستان میں ایک عجب اضطراب کا عالم تھا لہٰذا آئی ایس او مرکز کی طرف سے اگلے روز مال روڈ لاہور پر مسجد شہداء کے سامنے تعزیتی جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا گیا۔ ساری رات تیاری ہوتی رہی، تقریباً 12 بجے ایک خاص طریقے سے بینرز اور پلے کارڈ وغیرہ وہاں پہنچائے گئے، سینکڑوں لوگ موقع پر پہنچ گئے جونہی جلوس نکلا تو پولیس نے نہ فقط آگے بڑھنے سے روکا بلکہ شرکاء پر تشدد بھی شروع کر دیا اور کئی ساتھی بھی حراست میں لے لیے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ صرف چند ایک افراد کے علاوہ نوجوانوں، ڈاکٹر محمد علی نقوی سمیت آئی ایس او مرکز اور لاہور ڈویژن کے عہدیدار اور سابقہ مرکزی صدور کی ایک بڑی تعداد کو زندان میں ڈال دیا گیا تھا لیکن یہ نوجوان اس قدر جذبات سے لبریز تھے کہ انہوں نے رات بھر تھانہ سول لائنز کو نعروں کی گونج سے لرزائے رکھا، پولیس کے سوالوں کے جواب میں مخصوص جواب تیار کیے گئے تھے اور جب بھی کوئی پولیس والا کسی سے سوال پوچھتا تو وہی مخصوص جواب دیا جاتا۔ تقریباً 24 گھنٹے حوالات میں رہنے کے بعد انتظامیہ نے مذاکرات کے نتیجے میں تمام ساتھیوں کو رہا کر دیا۔

حسینی تحریک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عنصر

حصہ اول

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىۃِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ وَ الۡقُرۡاٰنِ ؕ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ○ اَلتَّآئِبُوۡنَ الۡعٰبِدُوۡنَ الۡحٰمِدُوۡنَ السَّآئِحُوۡنَ الرّٰکِعُوۡنَ السّٰجِدُوۡنَ الۡاٰمِرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ النَّاہُوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ الۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰہِ ؕ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○

ترجمہ: یقیناً اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لیے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں، یہ توریت و انجیل اور قرآن میں ان کے لیے پکا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنا عہد پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ پس تم نے اللہ کے ساتھ جو سودا کیا ہے اس پر خوشی مناؤ اور یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے۔☆

(یہ لوگ) توبہ کرنے والے، عبادت گزار، ثنا کرنے والے، (راہ خدا میں) سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کی دعوت دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے ہیں اور (اے رسول) مومنین کو خوشخبری سنا دیجیے۔ (توبہ/ ۱۱۱، ۱۱۲)

ہماری گفتگو تحریک حسینی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنصر کے بارے میں ہے اور گفتگو اس بارے میں ہے کہ کیا حسینی تحریک میں اس عنصر کا دخل رہا ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں جن باتوں نے امام حسینؑ کو اس سفر اور تحریک پر مجبور کیا ان

میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی شامل تھا یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ اس تحریک میں اس عنصر کا دخل کس حد تک ہے۔

حسینی تحریک میں بہت سے عوامل کا دخل رہا ہے اور انہیں متعدد عوامل کے دخل کے سبب جو واقعہ تاریخی اور سطحی واقعات کے لحاظ سے زیادہ طویل اور مفصل نہیں ہے، تفسیر کے لحاظ سے اور اس بڑے تاریخی واقعہ کی ماہیت کو درک کرنے کی نظر سے، بہت زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس واقعے کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں اور کبھی کبھی اس عظیم واقعے سے غلط نتائج بھی نکالے گئے ہیں۔ اس داستان کی پیچیدگی کا ایک سبب یہ عناصر ہیں جو اس واقعہ کے وجود میں آنے پر اثر انداز ہوئے۔ ہمیں اس واقعہ میں بہت سے مسائل ملتے ہیں: ایک جگہ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنا اور آپؑ کا بیعت سے انکار کرنا ہے۔ دوسری جگہ اہل کوفہ کا امامؑ کو دعوت دینا اور امامؑ کا ان کی دعوت قبول کرنا ہے۔ ایک اور مقام پر امامؑ بیعت مانگنے اور بیعت سے انکار کرنے کے مسئلے پر بالکل توجہ دیئے بغیر اور اس مسئلے پر بھی بنیادی توجہ دیئے بغیر کہ کوفہ والوں نے ان کی بیعت کرنا چاہی اور ان کو بلایا ہے یا نہیں بلایا، اس وقت کے حالات اور حکومت وقت پر تنقید کرتے ہیں، خرابیاں پیدا ہونے اور پھیلنے کا ذکر کرتے ہیں، اسلام کی حقیقت بدل جانے کا ذکر کرتے ہیں، حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دینے کا ذکر کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ ان حالات کے پیش نظر خاموش نہ بیٹھے۔ اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ امامؑ نہ بیعت کی بات کرتے ہیں اور نہ بلاوے کی، نہ اس بیعت کی بات کرتے ہیں جو یزید ان سے چاہتا ہے اور نہ اس دعوت کا ذکر کرتے ہیں جو اہل کوفہ نے انہیں دی ہے۔ معاملہ ہے کیا؟ کیا یہ مسئلہ بیعت کا مسئلہ تھا؟ کیا یہ مسئلہ دعوت کا مسئلہ تھا؟ کیا یہ مسئلہ اعتراض، نکتہ چینی یا برائیاں پھیلنے کا مسئلہ تھا؟ ان میں سے کون سی بات تھی؟ ہم اس مسئلہ کی کس طرح توجیہ کریں؟ اس کے علاوہ امامؑ کے زمانے یعنی یزید کے دور حکومت اور پہلے کے ادوار میں کون سا واضح فرق تھا؟ خاص طور پر اس دور میں اور امیر شام کے دور میں کیا فرق تھا کہ جب امام حسنؑ نے امیر شام سے صلح کر لی تھی اور امام حسینؑ کے پاس یزید سے صلح کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اور نہ ایسی صلح کو جائز شمار کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے میں ان تمام اسباب کا دخل اور اثر رہا ہے یعنی یہ سب عوامل موجود تھے اور امامؑ نے ان تمام عوامل کے مقابل اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ امامؑ کے کچھ ردعمل اور عمل کی بنیاد یزید کی بیعت سے انکار پر ہے، امامؑ کے کچھ ارادے اور فیصلے کوفہ والوں کے بلاوے کی بنیاد پر قائم ہیں اور کچھ ان برائیوں اور خرابیوں کے خلاف جدوجہد کرنے پر مبنی ہیں اس وقت ہر تین صورتیں پائی جاتی تھیں۔

واقعہ کربلا میں جو اباعبداللہ علیہ السلام کی ذات گرامی کے ردعمل اور ارادوں اور فیصلوں کا مجموعہ ہے ان تمام عناصر کا دخل رہا ہے۔ ہم پہلے بیعت کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہیں کہ اس عمل کا کتنا دخل تھا؟ امامؑ نے بیعت طلبی کے سوال پر کیا ردعمل ظاہر کیا اور صرف بیعت طلبی امامؑ پر کون سا فریضہ عائد کرتی تھی؟

ہم سب جانتے ہیں کہ امیر شام حکومت اور خلافت پر کس طرح سے پہنچا۔ جب امام حسنؑ کے اصحاب نے کافی کمزوری دکھائی تو امام حسنؑ ایک وقتی معاہدہ کر لیتے ہیں لیکن یہ معاہدہ امیر شام کی حکومت اور خلافت کی بنیاد پر نہیں تھا اس بنیاد پر تھا کہ

اگر امیر شام حکومت کرنا چاہے تو ایک محدود مدت تک حکومت کرے اس کے بعد مسلمان اپنے اختیار سے جس کسی کو مناسب اور موزوں سمجھیں خلافت کے لئے منتخب کرلیں ۔ دوسرے الفاظ میں اس شخص کی طرف رجوع کرلیں جو پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے مقرر اور متعین ہوا ہے ۔ امیر شام کے دور تک حکومت اور خلافت کا مسئلہ موروثی نہیں تھا بلکہ یہ ایسا مسئلہ تھا جس کے متعلق صرف دو قسم کے خیالات پائے جاتے تھے ۔ ایک خیال یہ تھا کہ صرف وہی شخص خلافت کا سزاوار تھا جسے پیغمبرؐ خدا نے خدا کے حکم سے منصوب کر دیا اور دوسرا طرزِ فکر یہ تھا کہ لوگوں کو خود اپنا خلیفہ چننے کا حق حاصل ہے ۔

بہرحال یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ پچھلا خلیفہ اپنے بعد کے خلیفہ کا تعین کردے، اپنا جانشین مقرر کرے اور وہ پھر اپنا جانشین مقرر کرے ۔ یعنی پھر خلافت کا مسئلہ نہ پیغمبرؐ کے حکم کے دائرے میں رہے نہ مسلمانوں ہی کو اس کے انتخاب میں کوئی دخل باقی رہے ۔ امام حسنؑ نے صلح نامے میں ایک شرط (جس پر امیر شام نے دوسری شرائط کی طرح صریحاً عمل نہیں کیا بلکہ امام حسنؑ کو زہر دلوا کر شہید کر دیا تا کہ نہ مدعی رہے نہ دعویٰ) یہ رکھوائی تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کوئی حق نہ ہوگا مسلمانوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے، خود تو دنیائے اسلام کے لئے جتنی مصیبت ہے وہ ہے لیکن بعد میں اختیار مسلمانوں کو ہوگا بہرحال امیر شام کو اختیار نہیں ہوگا، لیکن امیر شام کا پختہ ارادہ پہلے ہی دن سے یہ تھا کہ خلافت کو اپنے خاندان سے باہر نہ جانے دے اور مؤرخین کے قول کے مطابق ایسا کام کرے کہ خلافت کو سلطنت کی شکل دیدے لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اس کام کیلئے فی الحال فضا سازگار نہیں ہے ۔ وہ اس بارے میں بہت کچھ سوچتا تھا اور اپنے خاص دوستوں سے بھی مشورہ کرتا رہتا تھا لیکن ظاہر کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا اور یہ سوچ نہیں پاتا تھا کہ یہ بات عمل میں بھی آسکتی ہے ۔

جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے وہ شخص جس نے اسے اس کام کی ہمت بندھائی اور اسے اطمینان دلایا کہ یہ بات قابل عمل ہے مغیرہ بن شعبہ تھا ۔ اسے حکومت کوفہ کا لالچ تھا کیونکہ وہ پہلے کوفہ کا حاکم اور والی رہ چکا تھا اور چونکہ امیر شام نے اسے برخاست کر دیا تھا اس لئے ناراض تھا وہ شام پہنچا ۔ وہ بڑا نقاش اور زیرک، عرب کا دیہاتی تھا، اس نے اس غرض سے کہ دوبارہ کوفہ کی حکومت حاصل ہو جائے اس طرح اسکیم بنائی ۔ ایک دن اس نے یزید بن معاویہ کو دیکھا تو بولا نہ جانے تمہارا باپ تیرے بارے میں کیوں کوتاہی کر رہا ہے، دیر کس بات کی ہے؟ لوگوں کے سامنے تجھے اپنے جانشین کی حیثیت سے پیش کیوں نہیں کرتا؟ اس نے جواب دیا: میرا باپ سوچتا ہے کہ یہ بات ناقابل عمل ہے ۔ اس نے کہا: نہیں قابل عمل ہے تمہیں کس طرف سے خوف ہے؟ تمہارے خیال میں کس جگہ کے لوگ عمل نہیں کریں گے؟ جو کچھ امیر شام کہے گا شام والے اس کی اطاعت کریں گے، ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے، رہے مدینہ والے تو اگر فلاں کو تم وہاں بھیج دو تو وہ یہ کام انجام دے گا ۔ عراق (کوفہ) البتہ سب مقامات سے زیادہ اہم اور خطرناک ہے وہاں کا کام میں انجام دے سکتا ہوں ۔

یزید اپنے والد کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مغیرہ نے یہ بات کہی ہے ۔ امیر شام مغیرہ کو بلاتا ہے ۔ اس نے اپنی چرب زبانی اور پختہ دلیلوں سے امیر شام کو مطمئن کر دیا کہ فضا سازگار ہے اور کوفہ کا کام جو سب جگہوں سے زیادہ سخت اور زیادہ مشکل ہے

وہ میں انجام دے دوں گا۔امیر شام نے اسے دوبارہ حکم دیا کہ کوفہ چلا جائے (البتہ یہ واقعہ حضرت امام حسنؑ کی وفات کے بعد اور امیر شام کے آخر عمر کا ہے)۔کوفہ اور مدینہ والوں نے یہ بات قبول نہیں کی امیر شام مجبور ہوا کہ مدینہ جائے، مدینہ کے رؤسا یعنی ان لوگوں کو جن کی عوام میں عزت تھی مثلاً حضرت امام حسینؑ، عبداللہ ابن زبیر، اور عبداللہ ابن عمر کو بلایا اپنی چرب زبانی سے کوشش کی کہ اسلامی مصلحت کے خیال سے فی الحال اس طرح منظور کرلیں کہ ظاہری حکومت یزید کے ہاتھ میں رہے لیکن کام سب آپ کے اختیار میں ہوتا کہ لوگوں میں کوئی اختلاف نہ ہو، آپ لوگ فی الحال بیعت کرلیجئے عملی طور پر حکومت کی باگ ڈور آپ ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی۔اس نے ان لوگوں کو مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے منظور نہیں کیا، یہ کام بھی اس طریقے سے جیسے امیر شام چاہتا تھا عمل میں نہیں آسکا، پھر چالاکی سے مدینہ کی مسجد میں یہ چاہا کہ لوگوں کے سامنے یوں ظاہر کرے کہ یہ لوگ حاضر ہوگئے تھے اور انہوں نے قبول کرلیا تھا لیکن یہ چالاکی بھی کام نہیں دے سکی۔

امیر شام مرتے وقت اپنے بیٹے یزید کے طور طریقے سے بہت پریشان تھا۔اس نے اسے نصیحت کی کہ بیعت لینے کے لئے عبداللہ ابن زبیر کے ساتھ اس طرح پیش آنا، عبداللہ ابن عمر کے ساتھ اس طرح عمل کرنا، امام حسینؑ سے یوں سلوک کرنا، اس نے خاص طور پر یہ حکم دیا کہ امام حسینؑ سے بہت محبت اور نرمی کا برتاؤ کرنا، اس نے کہا کہ وہ پیغمبر خداؐ کے فرزند ہیں، مسلمانوں میں عظیم مرتبے کے مالک ہیں۔اسے اس مرتبے کا ڈر تھا کہ امام حسینؑ سے سخت رویہ رکھے اور اپنے ہاتھ ان کے خون میں نہ رنگے کیونکہ پھر تو خلافت نہیں کرسکے گا بلکہ خلافت ابوسفیان کے خاندان سے ہی نکل جائے گی، امیر شام ماہر سیاست دان کی طرح حالات کو پہلے سے خوب بھانپ لیتا تھا یعنی خوب سمجھتا تھا اور خوب پہلے سے اندازہ لگا لیتا تھا۔اس کے برعکس یزید اول تو جوان تھا دوسرے ایسا شخص تھا جو شروع ہی سے ریاست اور شہزادگی کی حالت میں پلا بڑھا تھا، کھیل تماشوں سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا، سیاست کو واقعاً نہیں سمجھتا تھا، اسے جوانی و ریاست اور دولت وشہوت کا غرور تھا۔اس نے وہ کام کیا جس نے سب سے زیادہ نقصان ابوسفیان کے خاندان کو پہنچایا اور اس معاملے میں سب سے زیادہ اسی خاندان کی شکست ہوئی، ان لوگوں کا کوئی روحانی مقصد تو تھا نہیں۔یہ سلطنت اور حکومت کے سوا دوسری چیز سے غرض نہیں رکھتے تھے اور اسے بھی ہاتھ سے گنوادیا۔امام حسینؑ شہید تو ہوئے لیکن اپنے روحانی ہدف تک پہنچ گئے جبکہ ابوسفیان کا خاندان کسی طرح اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکا۔

نصف ماہ رجب ۶۰ ہجری کو جب امیر شام مرجاتا ہے تو یزید مدینہ کے حاکم کو، جو بنی امیہ میں سے ہی تھا ایک خط لکھتا ہے جس میں امیر شام کے مرنے کی خبر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ لوگوں سے میرے لئے بیعت لو۔وہ جانتا تھا کہ مدینہ مرکز ہے اور سب کی نگاہیں مدینہ کی طرف لگی ہوئی ہیں، وہ اپنے ایک خصوصی خط میں سختی سے حکم صادر کرتا ہے کہ امام حسینؑ کو بلا کر ان سے بیعت لے اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو ان کا سر قلم کرکے اس کے پاس بھیج دے چنانچہ امام حسینؑ کو جو بات درپیش تھی وہ یزید بن معاویہ کی اسی بیعت کا تقاضا تھا جس میں دیگر برائیاں ایسی تھیں جو امیر شام کے معاملے میں بھی موجود نہیں تھیں۔ایک یہ کہ یزید کی بیعت امام حسینؑ کی طرف سے موروثی خلافت کی توثیق ہوجاتی یعنی خلافت کا مسئلہ انفرادی مسئلہ نہ رہتا بلکہ خلافت، موروثی ہوجاتی۔

دوسرا موضوع خود یزید کی شخصیت تھی جو اس زمانے کے طور طریقے کو ہر دوسرے دور کے حالات سے الگ امتیاز دے رہا تھا۔ دیگر اسلامی حکمران یہ جانتے تھے کہ اگر وہ اپنا ملک اور حکومت باقی رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں زیادہ سے زیادہ اسلامی مصلحتوں کا خیال رکھنا چاہیے، اسلامی مظاہر کی زیادہ حفاظت کرنا چاہیے، وہ سمجھتے تھے کہ اگر اسلام نہ رہا تو وہ بھی نہیں ہوں گے، وہ جانتے تھے کہ ایشیاء افریقہ اور یورپ کی مختلف نسلوں کے کروڑوں افراد ایک حکومت کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے ہیں اور شام یا بغداد کی حکومت کی پیروی کرتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں، قرآن پر عقیدہ رکھتے ہیں اور خلیفہ کو بہر حال اسلامی خلیفہ جانتے ہیں بصورت دیگر جس دن انہیں یہ احساس ہوگیا کہ خلیفہ خود اسلام سے منہ پھیر چکا ہے اور اس کے خلاف عمل کرتا ہے وہ بھی خلیفہ سے بغاوت کر دیں گے۔

آخر کیوں ضروری تھا کہ خراسان، شام، سوریہ اور افریقہ کے ایک حصے کے باشندے بغداد یا شام کے حاکم کی اطاعت کریں؟ اسلام کے سوا اور کوئی سبب نہیں تھا لہٰذا جو عقلمند، سمجھدار اور سیاست دان خلفاء تھے وہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ وہ اسلام کی مصلحتوں کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے پر مجبور ہیں لیکن یزید کو اس کا بھی شعور نہیں تھا، بدزبان انسان تھا، دوسروں کی توہین کیا کرتا تھا، اسے اچھا لگتا تھا کہ مسلمانوں اور اسلام سے بے اعتنائی برتے، اسلامی حدود کو توڑے۔ یہ شخص عام مجالس میں کھلم کھلا شراب پیتا تھا، نشے میں دھت ہو جاتا تھا اور پھر بیہودہ بکواس شروع کر دیتا تھا یہ بندر کو بہت پسند کرتا تھا چونکہ اس کی ماں بدوعورت تھی اور یہ خود بھی صحرا میں پلا بڑھا تھا اس میں بھی بدوی اخلاق پیدا ہو گئے تھے، کتوں اور بندروں سے خصوصی رغبت اور دلچسپی رکھتا تھا۔

مسعودی اپنی کتاب" مروج الذہب" میں لکھتا ہے: یہ بندر کو خوشنما ریشمی کپڑے پہنا تا تھا اور اپنے برابر ملکی اور فوجی افسروں سے بلند جگہ پر بٹھا تا تھا یہی وجہ ہے جو امام حسینؑ نے فرمایا تھا :" عَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ إِذْ قَدْ بُلِيَتِ الْأُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلِ يَزِيدَ " اس میں اور دوسروں میں فرق تھا۔ یہ شخص دراصل اسلام کے خلاف تبلیغ کرتا تھا، ایسے شخص کی بیعت امام حسینؑ سے طلب کر رہے تھے۔ امامؑ نے بیعت سے انکار کیا اور فرمایا :" میں کسی صورت بیعت نہیں کروں گا ادھر وہ لوگ بھی کسی طرح بیعت طلبی سے صرف نظر نہیں کر رہے تھے یہ ایک سبب اور واقعہ تھا۔ ان لوگوں کا یہ سخت مطالبہ کہ ہم تم جیسی شخصیت کو بیعت لئے بغیر نہیں چھوڑیں گے، ایک ایسا شخص جو بیعت نہیں کرتا اور یہ کہتا ہے کہ اس حکومت کی جانب سے مجھ پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا، مجھے اس پر اعتراض ہے۔ وہ لوگ کسی طرح اس کے لئے تیار نہیں تھے کہ امام حسینؑ بیعت نہ کریں اور آزادی کے ساتھ بے روک ٹوک عوام سے ملیں جلیں۔ یہ لوگ اس بیعت نہ کرنے کو اپنی حکومت کے لئے خطرہ سمجھتے تھے، وہ اچھی طرح جان گئے تھے اور بات بھی یہی تھی۔ امام کا بیعت نہ کرنا یعنی معترض ہونا، منظور نہ کرنا، یزید کی اطاعت کو لازم نہ گردانا بلکہ اس کی مخالفت کو واجب جاننا وہ لوگ مصر تھے کہ آپؑ بیعت کیجئے۔ امامؑ فرماتے تھے کہ میں بیعت نہیں کروں گا اب اس تقاضے کے پیش نظر، ان اسباب کو دیکھتے ہوئے امام کا کیا فرض ہے؟ ایک مخالفت کے اقدام کے سوا اور کوئی عمل نہیں ہوسکتا، میں بیعت نہیں کروں گا، دوسری کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ کیا آپ بیعت کرتے ہیں؟ نہیں! اگر بیعت نہیں کرتے تو قتل کر دیے جائیں گے! میں قتل ہونے کو تیار ہوں لیکن بیعت

نہیں کروں گا اس مقام پر امامؑ کا جواب [انکار اور] فقط ایک" نہیں" ہے۔

مدینہ کے حاکم نے امام حسینؑ کو بلوایا، وہ بنی امیہ کا ایک فرد تھا۔ اس وقت امام حسینؑ مسجد نبوی تشریف فرما تھے، عبداللہ ابن زبیر بھی آپ کے پاس تھا۔

حاکم کے گماشتہ نے دونوں کو حاکم کے پاس چلنے کی دعوت دی اور کہا کہ حاکم آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں، ان لوگوں نے کہا: تم جاؤ ہم بعد میں آجائیں گے۔ عبداللہ ابن زبیر بولا: اس موقع پر جو حاکم نے ہم لوگوں کو بلایا ہے آپ کا کیا اندازہ ہے؟ امامؑ نے فرمایا: میرا خیال ہے امیر شام مرگیا ہے اور ہمیں بیعت کیلئے بلایا ہے۔ عبداللہ ابن زبیر نے کہا: آپ نے خوب اندازہ لگایا، میرا بھی خیال یہی ہے، اب کیا کریں گے؟ امامؑ نے فرمایا: میں جارہا ہوں تم کیا کروگے؟ یہ میں بعد میں دیکھوں گا۔ عبداللہ ابن زبیر راتوں رات غیر معروف راستے سے ہوتے ہوئے بھاگ کر مکہ پہنچا اور وہاں پناہ گزیں ہوگیا۔ امامؑ گئے اور بنی ہاشم کے کچھ جوانوں کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ آپؑ نے ان سے فرمایا کہ تم باہر کھڑے رہنا، اگر میری آواز بلند ہو تو تم اندر گھس آنا لیکن جب تک میری آواز بلند نہ ہو تو اندر نہ آنا۔ ناپاک، بدنام زمانہ اموی مروان بن حکم بھی جو کبھی مدینہ کا حاکم رہ چکا تھا وہاں موجود تھا۔ حاکم نے کھلا ہوا خط امامؑ کو سنایا۔ امامؑ نے فرمایا: کیا چاہتے ہو؟ حاکم نے چرب زبانی شروع کی کہ لوگوں نے یزید کی بیعت کرلی ہے، امیر شام کی یہی خواہش تھی اور اسلام کی بھلائی بھی اسی میں ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپؑ بھی بیعت کرلیں، اسلام کی بھلائی کا یہی تقاضا ہے بعد میں آپ جس طرح فرمائیں گے اس پر عمل کیا جائے گا، تمام خرابیاں دور کردی جائیں گی۔ امامؑ نے فرمایا: تم مجھ سے کس لئے بیعت چاہتے ہو؟ لوگوں سے بیعت لینے کے لئے بیعت چاہتے ہو یعنی خدا کے لئے نہیں چاہتے، اس لحاظ سے کہ خواہ خلافت شرعی ہے یا غیر شرعی میں بیعت کرلوں تاکہ شرعی ہوجائے، یونہی ہے؟ تم میری بیعت اس لئے چاہتے ہو کہ دوسرے لوگ بھی بیعت کرلیں۔ اس نے کہا: ہاں! آپؑ نے فرمایا: تو اس خالی کمرے میں جہاں صرف ہم تین شخص ہیں تم کو میری بیعت سے کیا فائدہ ہوگا؟ حاکم نے کہا: آپ درست فرمارہے ہیں، یہ تو پھر بعد میں ہوگی۔ امامؑ نے فرمایا: مجھے جانا چاہیے۔ حاکم نے کہا: بہت بہتر، تشریف لے جائیں۔ مروان بن حکم بولا: کیا کہہ رہے ہو کہ چلے جائیں؟ اگر یہ یہاں سے چلے گئے تو کیا بیعت کریں گے؟ خلیفہ کے حکم کی تعمیل کرو۔ امامؑ نے مروان کا گریبان پکڑ کر اسے اوپر اٹھا کر پھر زمین پر زور سے دے مارا اور فرمایا: تمہاری اتنی حیثیت نہیں کہ تم یہ بات کرو۔

امامؑ باہر تشریف لے گئے اور اس کے بعد تین راتوں تک مدینہ ہی میں رہے۔ راتوں کو پیغمبر اکرمؐ کی قبر پر تشریف لے جاتے تھے اور وہاں دعا مانگتے تھے۔ اے خدا! مجھے وہ راستہ دکھا جس میں تیری رضا ہو۔ تیسری رات کو امامؑ پیغمبر اکرمؐ کی قبر پر جاتے ہیں اور بہت روتے ہیں وہیں آپ کی آنکھ لگ جاتی ہے، خواب میں پیغمبر اکرمؐ کو دیکھتے ہیں۔ یہ خواب آپؑ کے لئے الہام اور وحی کا درجہ رکھتا تھا۔ حضرت امام حسینؑ اس کے دوسرے روز مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے اور راستے سے بچ کر نہیں بلکہ اسی عام راستے سے مکہ کی طرف چل دیئے بعض ساتھیوں نے عرض کیا:

"یاابن رسول اللہ! لَوْ تَنَكَّبْتَ عَنِ الطَّرِيقِ الْأَعْظَمِ" بہتر ہے کہ آپ شاہراہ سے نہ جائیں ممکن ہے کہ حکومت کے کارندے آپ کو واپس کر دیں، روکیں، لڑائی جھگڑا ہو جائے (ایک بہادر اور قوی روح ایسا کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوتی) آپؑ نے فرمایا: میں پسند نہیں کرتا کہ فرار ہونے کی شکل اختیار کروں، میں اسی شاہراہ سے جارہا ہوں جو خدا چاہے گا وہی ہوگا۔

پہلا سبب۔بیعت کا مسئلہ:

بہرحال حسینی تحریک کا پہلا عامل اور پہلا سبب جس میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا "بیعت کا مسئلہ" ہے یزید کی بیعت جو تاریخ کی صحیح شہادت کے مطابق امام حسینؑ سے طلب کی گئی۔ یزید خصوصی خط میں یوں لکھتا ہے:

"خذ الحسين بالبيعة اخذا شديدا" امام حسینؑ کو بیعت کرنے کے لئے گرفتار کرو، سختی کرو اور وہ جب تک بیعت نہ کریں رہا نہ کرو۔امام حسینؑ نے بھی پامردی سے اس مطالبے کی نفی کی اور کسی طرح یزید کی بیعت کے لئے تیار نہیں تھے، ان کا جواب صرف انکار تھا یہاں تک کہ امام حسینؑ کی عمر کے آخری دن میں جب امام حسینؑ کربلا میں تھے عمر بن سعد آیا اور اس نے امام حسینؑ سے مذاکرات کئے۔ بظاہر اس کا انداز یہ تھا کہ وہ امام حسینؑ کو یزید سے صلح پر مجبور کرے لیکن حقیقت میں یہ صلح بیعت کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی امام حسینؑ تیار نہیں ہوئے۔امام حسینؑ کی ان باتوں سے جو آپ نے عاشور کے دن بیان فرمائیں پورے طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ آپؑ اپنے پہلے دن کے ہی قول پر قائم تھے" لَا وَ اللّٰهِ لَا أُعْطِيكُمْ بِيَدِي إِعْطَاءَ الذَّلِيلِ وَ لَا أُقِرُّ لَكُمْ إِقْرَارَ الْعَبِيدِ" نہیں خدا کی قسم میں اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہرگز نہیں دوں گا، میں یزید کی بیعت ہرگز نہیں کروں گا۔ یہاں تک کہ ان حالات میں بھی جو آج ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ قتل کر دیا جاؤں گا اور دیکھ رہا ہوں اپنے عزیزوں کا قتل دوستوں کا قتل، اور اپنے خاندان کی اسیری۔ مگر یزید کی بیعت کرنے کو تیار نہیں ہوں گا۔ یہ سبب کب پیدا ہوا؟ امیر شام کے آخری زمانہ میں اور امیر شام کے مرنے کے بعد جب یزید کو حکومت ملی اس میں سختی اور عجلت بڑھی۔

دوسرا سبب۔مسئلہ دعوت:

دوسرا سبب، دعوت کا مسئلہ تھا۔شاید بعض کتابوں میں آپ نے پڑھا ہوگا، لکھتے ہیں کہ سنہ ۶۰ ہجری میں امیر شام مرگیا تو کوفہ والوں نے امام حسینؑ کو بلایا تاکہ آپؑ کو خلیفہ منتخب کرلیں، امام حسینؑ کوفہ آئیں کوفہ والوں نے غداری اور بے وفائی کی آپؑ کی مدد نہیں کی، امام حسینؑ قتل ہو گئے۔انسان جب یہ تاریخ پڑھتا ہے تو سوچنے لگتا ہے کہ امام حسینؑ رجب کے آخر میں جو یزید کی حکومت کا آغاز تھا بیعت سے انکار کے لئے مدینہ سے نکل گئے اور چونکہ مکہ، خدا کی جانب سے جائے پناہ ہے اور وہاں دوسرے مقامات کے مقابلے میں امن کا زیادہ امکان ہے اس لئے آپ وہاں چلے جاتے ہیں۔(امیر شام کو مرے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے اور شاید ابھی اس کی موت کی خبر کوفہ میں نہیں پہنچی تھی) نہ صرف اس لئے کہ وہ بہتر پناہ گاہ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ لوگوں

کے اکٹھے ہونے کا بہتر مرکز ہے۔

رجب اور شعبان کے مہینوں میں عمرہ کے ایام ہوتے ہیں لوگ چاروں طرف سے مکہ آتے ہیں اور ان کو بہتر طور پر تبلیغ اور معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔ پھر حج کا زمانہ آجاتا ہے جو تبلیغ کے لئے زیادہ موزوں اور مناسب وقت ہوتا ہے، تقریباً دو ماہ کے بعد کوفہ والوں کے خطوط پہنچتے ہیں، کوفہ والوں کے خطوط مدینہ میں نہیں آئے ہیں جب کہ امام حسینؑ نے اپنی تحریک مدینہ سے شروع کر دی ہے۔ کوفیوں کے خطوط مکہ میں امام حسینؑ کے پاس پہنچتے ہیں یعنی اس وقت جب امام حسینؑ بیعت سے انکار کرنے کا عزم مصمم کر چکے تھے اور اسی عزم نے ان کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ پیدا کر دیا تھا (خود امامؑ اور دوسرے سبھی یہ بات جانتے تھے کہ نہ وہ لوگ بیعت لینے کے مطالبے سے دستبردار ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اماؑم بیعت پر آمادہ ہو سکتے ہیں) اس لئے کوفیوں کی دعوت اس تحریک کا اصلی سبب نہیں تھا بلکہ ثانوی سبب تھا البتہ کوفیوں کی دعوت کا زیادہ سے زیادہ اثر یہ مانا جاسکتا ہے کہ اس بلاوے نے لوگوں کے نقطہ نظر اور تاریخ کے فیصلے کے مطابق مستقبل میں اماؑم کے لئے بظاہر ایک مناسب موقع فراہم کر دیا۔

کوفہ ایک بڑا صوبہ اور اسلام کا فوجی مرکز تھا یہ شہر جو خلیفہ ثانی کے زمانے میں بسایا گیا تھا، ایک فوجی چھاؤنی تھا یہ امر اسلامی ممالک کی تقدیر پر بہت گہرا اثر رکھتا تھا۔ اگر کوفی اپنے وعدے پر قائم رہتے تو ممکن تھا کہ امام حسینؑ ظاہری طور پر بھی کامیاب ہو جاتے۔

اس وقت کے کوفہ کا اس وقت کے مدینہ یا مکہ سے موازنہ نہیں ہوسکتا، اس وقت کے خراسان سے بھی موازنہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا مدمقابل فقط شام تھا۔ کوفیوں کی دعوت کا اثر زیادہ سے زیادہ اس تحریک کی شکل میں ہوسکتا تھا کہ امام حسینؑ مکہ سے روانہ ہو جائیں اور اسے مرکز نہ بنائیں (بلاشبہ خود مکہ میں بھی ایسی دشواریاں تھیں کہ اسے مرکز نہیں بنایا جاسکتا تھا) ابن عباس کی بھی یہ تجویز کہ یمن چلے جائیں اور وہاں کے کوہستان میں پناہ لیں، لیکن امام قبول نہیں کرتے، اپنے نانا کے مدینہ کو بھی مرکز نہیں بناتے بلکہ کوفہ چلے آتے ہیں۔ پس کوفیوں کے بلاوے کا دخل ایک ثانوی امر تھا کہ یہ عراق میں تحریک اور قیام کی صورت میں ہوتا ورنہ یہ اصلی سبب نہیں تھا۔

اماؑم جس وقت کوفہ کی سرحد پر پہنچتے ہیں جناب حر کے لشکر کا سامنا ہوتا ہے۔ آپ کوفہ والوں سے فرماتے ہیں: تم نے مجھے بلایا، اب اگر تم چاہتے ہو تو میں لوٹ جاتا ہوں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں لوٹ جاتا ہوں اور یزید کی بیعت کر لیتا ہوں اور ان تمام باتوں سے چشم پوشی اختیار کر لیتا ہوں جو میں نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر، ملک میں فسادات کے پھیلاؤ اور ان حالات میں مسلمانوں کے فرائض کے بارے میں کہی ہیں، بیعت کر کے اپنے گھر میں خاموش بیٹھ جاتا ہوں اور سکوت اختیار کر لیتا ہوں۔ نہیں! میں اس حکومت کو صالح نہیں سمجھتا اور اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری پر بھی قائم ہوں۔ تم اہل کوفہ نے مجھے دعوت دی، تم نے کہا اے حسینؑ! آپ کے پیش نظر ہدف کے حصول میں ہم آپ کی مدد کریں گے، اگر تم بیعت نہیں کرتے تو نہ کرو، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے نقطہ نظر سے تمہیں اس حکومت پر اعتراض ہے اور اس کے خلاف تم نے قیام کیا ہے تو ہم تمہارا ساتھ دیں گے،

ہی لوگوں کی تلاش میں آیا ہوں جنہوں نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے ۔ اب تم کہتے ہو کہ اہل کوفہ اپنے وعدے پر عمل نہیں کر رہے ہیں تو بہت اچھا، ہم بھی کوفہ نہیں جاتے ۔ ہم اس جگہ واپس جاتے ہیں جو ہمارا اصلی مرکز ہے، ہم مدینہ یا مکہ چلے جاتے ہیں ۔ دیکھیں خدا کیا چاہتا ہے؟ بہر حال ہم بیعت نہیں کریں گے اگر چہ بیعت نہ کرنے پر ہم قتل ہی کیوں نہ ہو جائیں چنانچہ اس سبب یعنی کوفیوں کے بلاوے کا زیادہ سے زیادہ دخل اتنا تھا کہ انہوں نے امامؑ کو مکہ سے باہر نکالا اور وہ کوفہ کی طرف چل پڑے ۔

یہ تو میں نہیں کہنا چاہتا کہ واقعی یہ لوگ اگر نہ بلاتے تو امامؑ قطعی طور پر مدینہ یا مکہ ہی رہتے ،نہیں! تاریخ بتاتی ہے کہ امامؑ اس سے گریز کرتے کیونکہ کوفہ کے مقابلے میں مکہ کے بھی ظاہری حالات کچھ بہتر نہیں تھے تاریخ میں بہت سے قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ بیعت نہ کرنے کی صورت میں امامؑ کو حج کے زمانے ہی میں قتل کر ڈالیں ۔ صرف طریحی کا بیان ہی نہیں ہے بلکہ اوروں نے بھی بیان کیا ہے کہ امامؑ کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ اگر وہ حج کے زمانے میں مکہ میں رہ گئے تو ممکن ہے کہ اسی احرام کی حالت میں جب کوئی اصولاً ہتھیار نہیں اٹھاتا بنی امیہ کے مسلح کارندے ان کا خون بہا دیں اور خانہ کعبہ کی بے حرمتی ہو جائے ۔ حج کی توہین ہو اور اسلام کی بے حرمتی ہو، دوہری بے حرمتی ہو، فرزند پیغمبرؐ عبادت کی حالت میں خانہ خدا کی چار دیواری میں قتل بھی کر دیئے جائیں اور ان کا خون رائیگاں بھی جائے ۔ بعد میں وہ یہ مشہور کردیں کہ امام حسینؑ کا فلاں شخص سے معمولی جھگڑا ہوگیا تھا، اس نے حضرت کو قتل کر دیا اور خود روپوش ہوگیا نتیجہ یہ نکلے کہ امامؑ کا خون ضائع ہو جائے ۔ امامؑ نے اپنے ارشادات میں اس موضوع کے متعلق اشارہ بھی کیا ہے ۔ اثنائے سفر میں کسی نے امامؑ سے پوچھا: آپ کیوں نکل کھڑے ہوئے؟ اس کی مراد یہ تھی کہ آپ مدینہ میں محفوظ تھے، وہاں اپنے جد کے حرم یعنی پیغمبرؐ کی قبر کے پہلو میں کوئی شخص آپ پر تعرض نہیں کرسکتا تھا یا آپ مکہ میں ہی رہتے جہاں آپ خدا کے گھر کے قریب تھے، اب جو آپ وہاں سے باہر نکل آئے تو گویا آپ نے خود ہی خطرہ مول لے لیا ہے! آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: تمہیں دھوکا ہوا ہے، میں چاہے کسی غار میں بھی چھپ جاؤں یہ لوگ مجھے نہیں چھوڑیں گے جب تک میرا خون نہ بہا لیں گے، میرے اور ان کے درمیان نہ ختم ہونے والا جھگڑا ہے ۔ وہ مجھ سے ایسی بات کے طالب ہیں جس کے لئے میں کسی طرح آمادہ نہیں ہوں اور میں بھی ایسی بات کا خواہاں ہوں جسے وہ کسی طرح قبول نہیں کریں گے ۔

تیسرا سبب ۔ امر بالمعروف کا مسئلہ:

تیسرا سبب امر بالمعروف ہے ۔ یہ بھی خود امامؑ کے کلام کا واضح اظہار ہے، تاریخ نے لکھا ہے : امامؑ کے بھائی محمد حنفیہ کا اس وقت ہاتھ مفلوج ہو چکا تھا، بیکار ہوگیا تھا ۔ آپ جہاد کے قابل نہیں تھے لہٰذا آپ نے شرکت نہیں کی ۔ امامؑ ایک وصیت نامہ لکھ کر ان کے سپرد فرماتے ہیں: هَذَا مَا أَوْصَى بِهِ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ إِلَى أَخِيهِ مُحَمَّدٍ الْمَعْرُوفِ بِابْنِ الْحَنَفِيَّةِ اس مقام پر امامؑ کے جملے ہیں: حسینؑ خدا کی یکتائی اور پیغمبرؐ کی رسالت پر گواہی دیتا ہے (کیونکہ امامؑ جانتے تھے کہ بعد میں کچھ لوگ یہ کہہ

 دیں گے کہ امام حسینؑ اپنے نانا کے دین سے خارج ہو گئے تھے) یہاں تک کہ آپؑ اپنے قیام کا راز بیان فرماتے ہیں:

"أَنِّي لَمْ أَخْرُجْ أَشِراً وَ لَا بَطِراً وَ لَا مُفْسِداً وَ لَا ظَالِماً وَ إِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْإِصْلَاحِ فِي أُمَّةِ جَدِّي ص أُرِيدُ أَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوفِ وَ أَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ وَ أَسِيرَ بِسِيرَةِ جَدِّي وَ أَبِي عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ عليه السلام" (بحارالانوار، ج ۴۴ ص ۱۹۱)

اب یہاں اہل کوفہ کی دعوت کی کوئی بات ہی نہیں ہے یہاں تک کہ بیعت سے انکار کا بھی ذکر نہیں کرتے یعنی طلب بیعت اور بیعت سے انکار کے علاوہ ایک اور مسئلہ ہے۔ اگر یہ لوگ مجھ سے بیعت نہ بھی چاہیں تب بھی میں خاموش نہیں بیٹھوں گا، دنیا والے جان لیں: "ماخرجت اشرا ولا بطرا حسینؑ بن علیؑ کوئی جاہ طلب نہیں تھے، منصب اور دولت کے طالب نہیں تھے، فسادی اور تخریب کار بھی نہیں تھے، نہ ظالم اور ستمگر تھے، وہ ایک مصلح انسان تھے:

"ولا مفسدا ولا ظالما انما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدی ...."

حسینی تحریک میں امر بہ معروف و نہی از منکر کی اہمیت:

ان تینوں اسباب کی اہمیت ایک جیسی نہیں ہے۔ امام علیہ السلام کی تحریک میں ہر ایک کی معینہ اہمیت ہے البتہ اہل کوفہ کی دعوت کا مسئلہ، اس سبب سے تحریک امام کو جو اہمیت ملتی ہے وہ بہت سادہ اور معمولی سی ہے (امام حسینؑ کے عمل کی سطح پر نہ کہ ہمارے کاموں کی سطح پر) کیونکہ اس سبب سے ایک ولایت اور ایک علاقہ جو اپنے اندر طاقت رکھتا ہے اپنی آمادگی کا اعلان کر دیتا ہے۔ قاعدے کے مطابق زیادہ سے زیادہ پچاس فیصدی کامیابی کا امکان رکھتا تھا، اس سے زیادہ کامیابی کا امکان نہیں رکھتا تھا۔

جب اہل کوفہ متفق ہو گئے اور فرض کیجئے کہ انہوں نے اتفاق بھی کرلیا اور اپنے عہد پر قائم بھی رہ جاتے اور خیانت نہ بھی کرتے تب بھی کوئی یہ گمان نہیں کرسکتا تھا کہ امام علیہ السلام کی کامیابی سو فیصد ہے کیونکہ تمام لوگ کوفہ کے باشندے نہیں تھے۔ اگر ہم شام کے لوگوں کو نظر میں رکھتے ہیں جو بالکل آل سفیان کے وفادار تھے تو کامیابی کے امکان کو پچاس فیصد سے بھی گھٹا دیتا ہے (وجہ یہ ہے کہ یہی شامی تھے جو امیر المومنینؑ کی خلافت کے دور میں جنگ صفین میں کوفہ کے باشندوں کے مدمقابل ہوئے اور اٹھارہ مہینے تک کوفیوں سے لڑتے مرتے اور مقابلہ کرتے رہے تھے) بہر حال زیادہ سے زیادہ تیس یا چالیس فیصد کامیابی کا امکان ہے۔ لوگ اپنی آمادگی ظاہر کرتے ہیں اور امام علیہ السلام ان کی دعوت کا مثبت جواب دیتے ہیں۔ اس کی جس مقررہ حد تک اہمیت ہے وہ وہی معمولی حد ہے یعنی بہت سے عام لوگ ان حالات میں مثبت میں ہی جواب دیں گے لیکن بیعت کے مطالبے اور امامؑ کے انکار کا سبب جو انہی ابتدائی دنوں سے ظاہر ہوگیا تھا حسینی تحریک کو اہل کوفہ کی دعوت کی بہ نسبت زیادہ قدر و قیمت عطا کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ابھی ابتدائی ایام ہیں لوگوں نے حمایت اور مدد کا اعلان نہیں کیا ہے، وفاداری کا اعلان نہیں کیا ہے، ایک جابر اور سخت حکومت ہے جس کی سختی پچھلے بیس سال میں امیر شام کے زمانے میں اپنے عروج کو پہنچی ہے

(ایسی حکومت بیعت طلب کر رہی ہے) ۔امیر شام نے خاص طور پر اپنی حکومت اور سلطنت کی دوسری دہائی میں اس قدر سختی دکھائی کہ سب کی جان نکال لی۔ایک کام یہ کیا کہ اس کی پوری سلطنت یہاں تک کہ مدینہ اور مکہ میں بھی لوگ جمعہ کی نمازوں میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو کھلم کھلا ایک عباداتی عمل کے طور پر برا بھلا کہتے تھے اور اگر کوئی چوں و چرا بھی کرتا تھا تو اس کے سر کی خیر نہیں ہوتی تھی،اس نے اس قدر دہشت زدہ کر دیا تھا کہ کسی شخص کیلئے آخری دنوں میں تو زبان پر حضرت علیؑ کا نام لانا بھی جرم ہوگیا تھا۔ یہ تاریخ کی عبارت ہے ۔اگر لوگ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کہنا چاہتے تھے تو اشاروں اور سرگوشی میں کہتے تھے ۔حد یہ ہوگئی تھی کہ اگر حضرت علی علیہ السلام سے متعلق کوئی ایسی حدیث ہوتی جس حدیث میں حضرت علی علیہ السلام کی چھوٹی سے چھوٹی خوبی کا ذکر ہوتا بھی تو وہ محدث اور راوی جو ایک دوسرے سے روایت کرتے تھے ان خالی کمروں پر جہاں صندوق رکھے ہوتے تھے پردے کھینچ دیتے تھے،دروازے بند کر دیتے تھے ۔ایک دوسرے کو قسمیں دلاتے تھے کہ اس بات کو ظاہر نہ کرنا،میری بات ہر جگہ نقل نہ کرنا،اگر روایت کرنا چاہو تو ایسے آدمی سے کہنا جو سو فیصدی راوی ہو۔تاکہ وہ اس روایت کو پی جائے اور ظاہر نہ کرے۔

ایسے مشکل حالات میں اس شخص کا جانشین خلیفہ ہوا ہے جو اس سے جوان،زیادہ مغرور،زیادہ ظالم و بے رحم اور سیاست سے اتنا زیادہ بے خبر کہ سیاسی مراعات بھی نہیں دیتا۔اس وقت ایسی طاقت کے سامنے "نہ" کہنا کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں ہے ۔(تم بیعت کرو،نہیں میں،بیعت نہیں کرتا،میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دو گے تو بھی میں بیعت نہیں کروں گا)۔ایسے حالات میں دیکھتے ہیں کہ امام علیہ السلام تن تنہا ایک نہایت جابر حکومت کے ناجائز مطالبے کے سامنے ڈٹے کھڑے ہیں اور کوئی ایک مددگار اور حامی بھی نہیں ہے، یہاں تک کہ دس فیصدی کامیابی کا بھی امکان نہیں ہے ۔آپ اس لحاظ سے اپنی رائے اور اپنا عقیدہ بیچنے کو یا محض دکھاوے کو بھی تیار نہیں ہیں کیونکہ بعد میں تاریخ یہ نہیں کہے گی کہ امام حسین علیہ السلام نے جبر وزور کے تحت بیعت کر لی ہے یہی لوگ جو جبر سے بیعت لیتے ہیں پیسے کے زور سے تاریخ بھی لکھوا لیتے ہیں،جیسے کہ انہوں نے لکھوائی ہے۔

امیر شام اور اس کے ساتھ اور رشتہ دار مسلمانوں کے بیت المال کا کچھ حصہ آج کل کی اصطلاح میں اس زمانے کے مذہبی لوگوں اور عالموں کو ملازم رکھنے پر صرف کرتے تھے ۔آزاد،بے قید،بے ایمان اور بے ضمیر راویوں کو پیسے سے خریدتے تھے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں بدل دیتے تھے،پیغمبرؐ کی حدیثوں میں لوگوں کے نام بدل دیتے تھے،حضرت علی علیہ السلام کے دشمنوں کی تعریف میں حدیثیں گھڑتے تھے ۔مؤرخین نے لکھا ہے کہ " ثمرۃ بن جندب " نے آٹھ ہزار مثقال سونا لے کر حضرت علی علیہ السلام کے خلاف ایک حدیث گھڑ ڈالی چنانچہ ان کیلئے تاریخ کا بدل دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔اب اس کے بعد جتنی تاریخ بچ رہی وہ حسینی تحریک جیسے عملیات کی بدولت بچی اور اگر امام حسین علیہ السلام بھی خاموش ہو جاتے تو تاریخ بھی بدل دی گئی ہوتی۔پس یہ پہلو حضرت ابا عبداللہ علیہ السلام کی تحریک کو کوفہ کی دعوت کے مقابلے میں زیادہ اعلیٰ قدر و قیمت عطا کرتا ہے ۔

البتہ تیسرا سبب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے اور حضرت ابا عبداللہ علیہ السلام کامل صراحت کے ساتھ اس سبب کا

حوالہ دیتے ہیں، اس سلسلے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثوں اور اپنے نصب العین کا حوالہ دیتے ہیں اور بار بار نیکی کے حکم اور برائی کی ممانعت کا ذکر کرتے ہیں اور کوفہ والوں کی بیعت اور دعوت کا نام نہیں لیتے۔

یہ سبب دوسرے دو اسباب کی نسبت حسینی تحریک کو بہت زیادہ منزلت بخشتا ہے۔ اسی سبب کی بدولت اس تحریک میں وہ شائستگی پیدا ہوئی جو ہمیشہ قائم رہے گی، ہمیشہ یاد رہے گی، سبق دیتی رہے گی باوجود یہ کہ تمام اسباب سبق آموز ہیں لیکن اس میں سبق آموزی زیادہ ہے کیونکہ اس سبب کا تکیہ نہ اہل کوفہ کی دعوت پر ہے اور نہ بیعت کے مطالبے پر یعنی اگر امام کو بلایا بھی نہ جاتا تب بھی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے قانون کے تحت امام حسین علیہ السلام تحریک ضرور شروع کرتے۔ ان سے بیعت کا مطالبہ نہ بھی ہوتا پھر بھی وہ خاموش نہ بیٹھتے۔ پہلے سبب کے مطابق چونکہ اہل کوفہ نے دعوت دی ہے اور پچاس فیصدی یا اس سے قدرے کم کامیابی کا نقشہ بن گیا ہے۔ اس لئے امام سفر کرتے ہیں یعنی اگر صرف یہی سبب حسینی تحریک کی تشکیل میں کارگر ہوتا ، اگر اہل کوفہ دعوت نہ دیتے تو امام حسین علیہ السلام اپنی جگہ سے نہ ہلتے۔ دوسرے سبب کے مطابق وہ لوگ امام علیہ السلام سے بیعت مانگتے ہیں اور آپؑ فرماتے ہیں کہ میں تمہاری بیعت نہیں کرونگا یعنی اگر صرف یہی سبب ہوتا اگر حکومت وقت امام حسین علیہ السلام سے بیعت نہ مانگتی تو امام حسین علیہ السلام کو بھی ان سے کوئی سروکار نہ ہوتا اور آپؑ فرماتے کہ نہ تمہیں مجھ سے کوئی غرض ہے اور نہ میں تم سے کوئی سروکار رکھتا ہوں۔ تم مجھ سے بیعت نہیں چاہتے بس بات ختم ہے چنانچہ اس سبب کے مطابق اگر وہ لوگ بیعت کا مطالبہ نہ کرتے تو حضرت ابا عبداللہ علیہ السلام بھی سکون، امن اور چین سے رہتے، اپنی جگہ بیٹھے رہتے، کوئی سانحہ یا ہنگامہ برپا نہ ہوتا۔

البتہ تیسرے سبب کے مطابق امام حسین علیہ السلام تنقید اور اعتراض کرنے والے شخص ہیں۔ ایک انقلابی شخصیت ہیں، ایک قیام کرنے والے مرد ہیں، مثبت سوچ رکھنے والے انسان ہیں۔ اب کوئی اور محرکات ضروری نہیں ہیں، ہر جگہ خرابی پھیلی ہوئی ہے، خدا کا حلال، حرام اور خدا کا حرام، حلال ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے بیت المال پر نالائق لوگوں کا قبضہ ہے اور اس کا مال ان طریقوں سے خرچ ہو رہا ہے جن کیلئے خدا کی رضا نہیں ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: جو شخص ایسے حالات و اطوار دیکھے "ثُمَّ لَمْ يُغَيِّرْ بِقَوْلٍ وَ لَا فِعْلٍ" پس اگر اسے اپنے قول وفعل سے تبدیل نہ کرے "كَانَ حَقّاً عَلَى اللهِ أَنْ يُدْخِلَهُ مَدْخَلَه" تو یہ سزاوار ہے (خدا کے قانون سے ثابت ہے) کہ خدا ایسے شخص کو وہاں لے جائے گا جہاں ظالم، جابر، ستمگار اور خدا کا دین بگاڑنے والے جائیں گے اور انہی کے ساتھ اس کا حشر کرے۔ آپ اپنے جد کے قول کا حوالہ دیتے ہیں کہ ایسے حالات میں جو شخص جانتا اور سمجھتا ہے اور اعتراض نہیں کرتا اس کا حشر گنہگاروں کی جماعت کے ساتھ ہوگا۔ صرف یہی حدیث نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری حدیثیں بھی موجود ہیں، ایک حدیث امام رضا علیہ السلام جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے: "إِذَا أُمَّتِي تَوَاكَلَتِ الْأَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّهْيَ عَنِ الْمُنْكَرِ" جب لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک دوسرے پر ٹالنے لگیں یعنی ہر شخص خاموش رہے اور یہ انتظار کرے کہ دوسرا نیکی کا حکم دے گا اور

بدی سے منع کرے گااور یوں نتیجے میں کوئی بھی کھڑا نہ ہو۔ "فَلْيَأْذَنُوا بِوِقَاعٍ مِنَ اللهِ تَعَالَى" تو پھر لوگوں کو عذاب الٰہی کا منتظر اور اس کیلئے تیار رہنا چاہئے۔ (کافی، ج ۵ ص ۵۹)

کیسا عذاب ہوگا؟ کیا آسمان سے پتھر برسیں گے؟ نہیں! قرآن شریف کی آیتوں میں عذاب الٰہی کی یوں تفسیر کی گئی ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ

کہہ دیں اے رسولؐ! (تم خدا کے عذاب سے ڈرو) خدا اس پر قادر ہے کہ تمہارے سروں پر عذاب نازل کرے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے عذاب کو جوش میں لائے یا تمہیں گروہوں میں بانٹ دے یا خود تمہارا نقصان تمہاری طرف لوٹا دے۔ (یعنی تمہیں ایک دوسرے کی جان لینے کے درپے کردے دے)۔ دیکھو کہ ہم کس طرح اپنی آیات کو مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں تا کہ شاید لوگ ان کو سمجھ جائیں۔ (انعام۔ ۶۵)

اہل بیت علیہم السلام اپنی روایتوں میں یہ معانی بیان فرماتے ہیں: سر پر عذاب کا مطلب یہ ہے کہ ہم تم پر اوپر سے عذاب نازل کریں گے، تم اپنے پاؤں تلے سے یعنی زیر زمیں سے عذاب دیکھو گے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تھا جس وقت لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیں تو وہ منتظر رہیں کہ ان کے پیچھے سے عذاب الٰہی آنے والا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک اور حدیث بھی ہے جسے علماء شیعہ نے اپنی معتبر کتابوں جیسے اُصول کافی میں درج کیا ہے اور سنی علماء نے بھی اس کی روایت کی ہے۔ غزالی نے یہ حدیث احیاء العلوم میں نقل کی ہے اور اس کی سند اہل تسنن کی کتب احادیث میں ملتی ہے: "لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْ لَيُسْتَعْمَلَنَّ عَلَيْكُمْ شِرَارُكُمْ فَيَدْعُو خِيَارُكُمْ فَلَا يُسْتَجَابُ لَهُمْ"۔ "(یعنی نیکی کا حکم دیتے رہو اور بدی سے منع کرتے رہو ورنہ خدا تم پر برے لوگوں کو مسلط کردے گا، پھر تمہارے نیک لوگ بھی بلاتے رہیں گے تو انہیں جواب نہیں دیا جائے گا)۔ (کافی، ج ۵ ص ۵۶)

بعض لوگ زیادہ تر یوں مطلب بیان کرتے ہیں کہ جب برے لوگ تم پر مسلط ہوگئے تو تم میں سے نیک لوگ خدا کی درگاہ میں فریاد کریں گے لیکن خدا ان کی دعا کو قبول نہیں کرے گا یعنی جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیتے ہیں ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ خدا انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے۔ وہ چاہے خدا سے جتنی فریاد کریں، اس گناہ کی وجہ سے ان کی دعا قبول نہیں ہوتی لیکن غزالی نے اس آیت کے ایک باریک معنی بیان کئے ہیں حالانکہ وہ ایک درویش صفت انسان ہے اور اجتماعی مسائل میں نہیں پڑتا، پھر بھی یوں کہتا ہے اس جملے "فَيَدْعُو خِيَارُكُمْ فَلَا يُسْتَجَابُ لَهُمْ" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ خدا سے فریاد کرتے ہیں اور خدا ان کی دعا قبول نہیں کرتا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں: جب لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیں گے تو اتنے حقیر اور پست ہو جائیں گے کہ ان کا رعب، دبدبہ، عزت، کرامت ختم ہو جائے گی چنانچہ جس وقت وہ ظالموں کی درگاہ میں جائیں گے تو چاہے جتنی ندا کریں گے ان کی کوئی نہیں سنے گا یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری عزت قائم

رہے اور دوسرے تمہارے سامنے حساب دہ ہوں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک نہ کرو البتہ جس وقت تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عامل نہیں رہو گے تو پہلی خاصیت تو یہ تمہاری کمزوری ہوگی، تم پست اور ذلیل ہو جاؤ گے اور پھر دشمن بھی تمہیں کچھ نہیں سمجھے گا۔

بر در ارباب بی مروت دنیا　　　چند نشینی کہ خواجہ کی بدر آید

(دنیا کے بے مروت اربابوں کے دروازے پر)

(تو کب تک اس انتظار میں بیٹھا رہے گا کہ خواجہ کب باہر آتا ہے)

اس وقت تم ایک غلام کی طرح چاہے جتنی خوشامد کرتے رہو کوئی تمہیں جواب بھی نہیں دے گا۔ یہ معنی بہت لطیف ہے۔ ہمارے اسلام کا یہ قطعی اُصول ہے اور امام حسین علیہ السلام کی پاک ہستی نے اس اُصول کا حوالہ دیا ہے چنانچہ وہ یوں سمجھاتے ہیں: فرض کیجئے کہ اہل کوفہ مجھے دعوت نہ دیتے، فرض کیجئے کہ یزیدی حکومت مجھ سے بیعت نہ مانگتی پھر بھی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اُصول کے مطابق خاموش نہیں بیٹھتا۔ ضروری ہے کہ ہم خود اس اصل کے بارے میں مزید گفتگو کریں، ہمیں بنیادی طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ اس اصل کے بارے میں مزید گفتگو کریں، ہمیں بنیادی طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ اس اصل کو پہچانیں، یہ وہ اصل ہے کہ اگر ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اور آئمہ اطہار علیہم السلام کے فرمودات کی طرف توجہ نہ دیں اور اس فقہ اسلامی کی طرف بھی رُخ نہ کریں جس کی ہر کتاب میں اور اس کے مختلف ابواب میں ابتدائے اسلام سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک باب چلا آتا ہے اور صرف قرآن ہی کو نظر میں رکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اس مقدس آسمانی کتاب میں یہ موضوع کتنا تکرار ہوا ہے اور جن گذشتہ قوموں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل نہیں کیا ہے ان کی حد درجہ بدبختی کا حوالہ دیتا ہے:

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ

تم سے پہلے والی قوموں میں کچھ لوگ (خیر وصلاح والے) کیوں باقی نہیں رہے جو (لوگوں کو) زمین میں فساد پھیلانے سے منع کرتے سوائے ان چند افراد کے جنہیں ہم نے ان میں سے بچا لیا تھا؟ (ہود۔ ۱۱۶)

قدیم نسلوں میں کچھ لوگ صاحب (سرمایہ عقلی، فکری، روحی) کیوں نہیں ہوئے جو فسادوں کے خلاف لڑتے جس سے یہ قومیں ان فسادوں سے تباہ نہ ہوتیں، نابود اور ہلاک نہ ہوتیں؟ دوسری قوم کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ

جن برے کاموں کے وہ مرتکب ہوتے تھے ان سے ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے، ان کا یہ عمل کتنا برا ہے۔ (مائدہ۔ ۷۹)

یہ لوگ مجبور اور مصیبت زدہ ہو گئے ہیں، ہلاک ہو گئے، مٹ گئے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ برائیوں سے منع نہیں کرتے تھے، بگاڑ کے خلاف جدوجہد نہیں کرتے تھے اور بہت سی برائیاں کرتے تھے۔ مسلمانوں سے خطاب فرمایا گیا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

اور تم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نیکی کی دعوت اور بھلائی کا حکم دے اور برائیوں سے روکے اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔ (آل عمران۔ ۱۰۴)

تمہارے درمیان ایک ایسی امت، ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جس کا کام نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا ہو۔ تمہارے درمیان ایک ایسی جماعت ہو یا تم ایسی امت بن جاؤ جس کا کام نیکی کی طرف بلانا (امر بالمعروف) اور برائی سے روکنا (نہی عن المنکر) ہو "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" صرف ایسی ہی امت جس میں نیکی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا ہو، نجات یافتہ، باعزت، بابرکت اور ثابت قدم ہو سکتی ہے اور بھلائی اور نجات پا سکتی ہے۔ سورہ آل عمران میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق بہت سی آیتیں ملتی ہیں۔ میں نے جو آیت پڑھی وہ اس آیت کے بعد آتی ہے: "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا" (آل عمران۔ ۱۰۳)، یہ آیت لوگوں کو اتحاد کی دعوت دیتی اور تفرقے سے روکتی ہے: اے مسلمانو! اپنے درمیان تفرقے اور اختلاف کا وجود نہ ہونے دو، جو اختلاف پیدا ہو گئے ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کرو، اختلافات کو کم کرو، یہ شگاف نہ بڑھنے دو، ان تفرقوں سے جو روز بروز شگاف بڑھتے جا رہے ہیں کسے فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ کیا اسلام کے دشمن کے سوا بھی کسی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ دشمن ہم سے کیا چاہتا ہے؟ کیا وہ اس کے سوا بھی کچھ اور چاہتا ہے کہ ہم مذہب اور فرقے کے مختلف ناموں پر سدا ایک دوسرے سے دست و گریباں رہیں، ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے رہیں؟ قرآن کہتا ہے تفرقے سے بچو! پھر فرماتا ہے "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ" گویا یہاں "الخیر" سے مراد وہی اتحاد ہے یعنی تمہارے درمیان ایک جماعت ہونا چاہیے جو مسلمانوں کو برابر اتحاد اور اتفاق کی تلقین کرتی رہے۔ مسلمانوں میں جو تفرقے اور جھگڑے ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کرتی رہے۔ پھر فرماتا ہے: "وَلَا تَكُوْنُوا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا" (آل عمران۔ ۱۰۵)، ان جماعتوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو متفرق اور مختلف ہو گئیں، فرقہ فرقہ اور گروہ گروہ ہو گئیں، ٹکڑیوں اور ٹولیوں میں بٹ گئیں۔ آیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ اتحاد کی تلقین کرنے والی ایک الگ الگ ہونے سے روکنے والی دو آیتوں کے درمیان یہ آیت آتی ہے: "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"

یہ بالکل درست نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کیلئے افہام و تفہیم، وحدت اور اتفاق کو ایک ایسی نیکی سمجھتا ہے جو تمام نیکیوں کی ماں اور سرچشمہ ہے اور اختلاف اور فرقہ کو چاہے وہ کسی نام اور عنوان سے ہو سب سے بڑی برائی، غلاظت اور ناپاکی بتاتا ہے، دوسری آیت فرماتی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(اے مسلمانو! تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کیے گئے ہو تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو)۔(آل عمران:۱۱۰)

یعنی انسانیت کی بھلائی کیلئے تم سے بہتر اُمت آج تک پیدا نہیں ہوئی ہے۔ کیوں؟ کس صفت کے لحاظ سے؟ تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر" اس وجہ سے کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔ اس لئے منطقیوں کے قول کے مطابق ہم اس کی ضد کو یوں سمجھیں: ہم مسلمان قوم انسانیت کیلئے بہترین اُمت نہیں ہیں کیونکہ ہم نیکی کا حکم نہیں دیتے اور بدی سے نہیں روکتے۔ اس کے نتیجے میں ہم عزت اور عظمت کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے، کوئی فخر نہیں کر سکتے، ہمارا اسلام حقیقی اسلام نہیں ہے۔

اگر ہم اس بات کی اہمیت اور عظمت کے موضوع پر قرآن، سنت، حدیث اور ان باتوں کی رو سے جو اس ضمن میں کہی گئی ہیں گفتگو کرنا چاہیں تو بہت سی روایتیں ملتی ہیں جو بتاتی ہیں کہ اسلام نے اس موضوع کو کس قدر اہمیت دی ہے۔

البتہ اس کیلئے ایک تاریخی گفتگو کی ضرورت ہے جس سے یہ واضح ہو سکے کہ اس عظمت و اہمیت کا یہ موضوع وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کس وجہ سے اسلامی دنیا میں روز بروز کمزور اور چھوٹا ہوتا چلا گیا۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ علمی نقطہ نظر سے یعنی کتابوں میں سنیوں سے ہم شیعوں نے زیادہ اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ اگر ہم "کتاب الصلواۃ" سے لے کر "کتاب الدیات" تک شیعی فقہ کی کتابیں سنی فقہ کی کتابوں کے مقابلے میں رکھ دیں تو ہم دیکھیں گے کہ تمام ابواب میں شیعی فقہ مجموعی طور پر زیادہ قطعی، زیادہ شرح، زیادہ مفصل، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ مدلل ہے اور میں اس بات کو ثابت بھی کر سکتا ہوں لیکن بد قسمتی سے ہماری فقہی کتابوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا باب تمام ابواب میں بہت چھوٹا ہو گیا ہے لیکن سنیوں میں عملاً چھوٹا ہو گیا ہے۔

معتزلہ جو سنی متکلمین کا ایک فرقہ ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اُصول دین سمجھتا ہے فروع دین نہیں۔ شیعہ کہتے ہیں کہ اُصول دین پانچ ہیں اور فروع دین دس ہیں اور ان دس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو شمار کرتے ہیں۔ معتزلہ دین کے پانچ اُصولوں کے قائل ہیں جن میں سے ایک امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی ہے لیکن خود انہوں نے اپنی کتابوں میں رفتہ رفتہ اس بحث سے بچتے بچتے اسے بالکل چھوٹا کر دیا۔ تمام مؤرخین کہتے ہیں کہ اس کا سبب وہ ٹکراؤ تھا جو اس موضوع پر گفتگو نے اپنے وقت کی سیاست سے پیدا کر لیا تھا چونکہ یہ گفتگو خلفائے وقت کو عریاں کرتی تھی اور وہ اسے روکتے تھے اس لئے معتزلہ مجبور ہو گئے کہ اسے اپنی کتابوں میں بیان نہ کریں یا کم بیان کریں اگرچہ یہ ان کے مذہبی اُصولوں میں سے ایک اُصول شمار ہوتا تھا۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم شیعوں میں بھی یہ موضوع بہت مختصر رہ گیا ہے۔ جب امر بالمعروف و نہی عن المنکر نماز، روزے کی طرح ہیں تو اسے دفن نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کوئی غلامی کا مسئلہ نہیں ہے جو ہم کہیں کہ آج دنیا میں غلامی نہیں ہے جو ہم اس پر بحث کریں اور یہ معقول بات ہے۔ جس وقت وہ مسئلہ موجود تھا اس وقت اسلام میں غلاموں کے فائدے کیلئے احکام موجود تھے اور ان پر بحث درست تھی۔ جب غلامی ہی نہیں رہی تو اب اس کے بارے میں گفتگو غلط اور بے فائدہ ہے لیکن امر بالمعروف و نہی عن المنکر

ایسا موضوع نہیں ہے جو کبھی ختم ہوسکتا ہو ۔ یہ ہمیشہ موجود رہا ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا اس لئے اسے سب مسئلوں سے اوپر رہنا چاہیے ۔ یہ کس لئے حذف کیا جائے؟ یہ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے تا کہ ہم اسے بھول نہ سکیں ۔

یورپ کے کچھ مستشرقین، اسلام کے خلاف دعویٰ کرتے ہیں یا یہ کہوں کہ اسلام پر الزام لگاتے ہیں اور اپنی بہت سی کتابوں میں اسے بار بار دہراتے ہیں ۔ یہ اسلام کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ قضا و قدر کا دین ہے، یہ ایک ایسا دین ہے جو انسان کے کسی فعال کردار اور ذمہ داری کا قائل نہیں ہے، یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسانی فرائض کو خدا کے سپرد کر دے، تم یوں ہی انتظار کرتے رہو، دیکھو خدا کیا کہتا ہے ۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام انسان کی آزادی اور اختیار کا قائل نہیں ہے، جو کچھ ہے خدا اور اس کا ارادہ ہے، بنیادی طور پر انسان اس سلسلے میں کسی کام کا فاعل نہیں ہے، اسی لئے اس پر کوئی ذمہ داری یا فریضہ بھی عائد نہیں ہوتا، یہ بالکل جھوٹ ہے، اتفاق سے قرآن مجید یہودیوں پر یہی جرم عائد کرتا ہے، جس وقت موسیٰؑ نے ان سے کہا: "يَاقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللهُ لَكُمْ " (مائدہ ۔ ۲۱)، تو انہوں نے موسیٰؑ کو جواب دیا: "فاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلاَإِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ " (مائدہ ۔ ۲۴)، اے موسیٰؑ! ہم تو اپنی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں تم اور تمہارا خدا دونوں جاؤ، جنگ کرو اور دشمن کو ہماری سرزمین سے نکال دو، بعد میں ہم بھی پہنچ جائیں گے ۔ بدر کی لڑائی میں جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب سے مشورہ کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا تھا: تمہاری کیا رائے ہے؟ اب قافلہ بھاگ گیا ہے، آیا ہم دشمن کا پیچھا کریں یا مدینہ کو پلٹ جائیں؟ ہر شخص نے اپنا اپنا خیال ظاہر کیا ۔ حضرت ابوذر غفاری یا جناب مقداد کندی میں سے کسی ایک بزرگ نے کہا یا رسول اللہؐ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہیں گے: "فاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلاَإِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ " تم اور تمہارا خدا چلے جاؤ کام انجام دو، ذمہ داری کا تعین کرنا ہمارا کام نہیں ہے ۔ ہم کہتے ہیں کہ آپؐ جو حکم دیں گے وہی ہوگا، اگر آپ حکم دیں کہ دریا میں کود جاؤ تو ہم کود جائیں گے، اگر آپ فرمائیں گے کہ آگ میں کود جاؤ تو ہم کود پڑیں گے ۔ اس کے علاوہ یہ قرآن ہی ہے جو انسانی آزادی اور انسان کی شخصی ذمہ داری اور فریضے کے موضوع پر پکار پکار کر کہہ رہا ہے "إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا " (یقیناً ہم نے اسے راستے کی ہدایت دے دی ہے چاہے وہ شکر گزار ہو جائے یا کفران نعمت کرنے والا ہو جائے) (دھر ۔ ۳) "وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ " (اور ہم نے اسے دونوں راستوں کی ہدایت دے دی ہے) (بلد ۔ ۱۰)، "وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُوْلَئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا " (جو شخص آخرت کا چاہنے والا ہے اس کیلئے ویسی ہی سعی بھی کرتا ہے اور صاحب ایمان بھی ہے تو اس کی سعی یقیناً مقبول قرار دی جائے گی) (بنی اسرائیل ۔ ۱۹) ۔ قرآن کی ایسی بہت سی آیتیں ہیں جن میں "فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ " (یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کا کیا ہوا ہے) (شوریٰ ۔ ۳۰)، آیا ہے ۔ ہم خدا تعالیٰ کو جن برائیوں سے نسبت دیتے ہیں، خدا کا ان سے پاک اور بری ہونا قرآن بار بار بیان کرتا ہے: "وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ "، اگر لوگ مصیبت زدہ اور مجبور ہو گئے تو ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے ۔ (نحل ۔ ۱۱۸)

ان افترا پردازیوں اور جھوٹی باتوں کے بالکل برعکس ایک اور بات یہ ہے کہ اسلام میں ایک ایسا مسئلہ موجود ہے جو

 دوسری قوموں (آج کی دنیا اور قوموں) میں دینی قانون کی حیثیت سے نہیں ملتا۔ (البتہ یہ میں نہیں کہتا کہ قدیم پیغمبروںؑ کے یہاں نہیں تھا) اور وہ یہ ہے: اسلام تنہا ایک فرد کو اپنے لئے اور خدا کے سامنے ذمہ دار، جواب دہ اور مکلف نہیں جانتا ہے بلکہ فرد کو جماعت کے لحاظ سے بھی ذمہ دار اور جواب دہ سمجھتا ہے۔ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" یہی ہے کہ انسان! تنہا بطور ایک شخص یا ایک فرد اپنے پروردگار کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہے بلکہ سماج کے سامنے بھی ذمہ دار ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا دین قضا و قدر کا دین ہے؟ البتہ قضا و قدر اس مفہوم میں جس میں وہ کہتے ہیں یعنی خدا کام پورا کرتا رہے اور انسان اس واقع اور دائرے سے باہر ہو، انسان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، ایسی قضا و قدر جو انسان کی خود مختاری اور ذمہ داری چھین لیتی ہے، قرآن ایسی قضا و قدر کو تسلیم نہیں کرتا۔ کیا آپ اس سلسلے میں اس چھوٹی سی آیت سے بہتر کوئی جملہ پیش کر سکتے ہیں۔ قرآن میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ دو مقامات پر آیا ہے؟: "إِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ" (خداوند اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔) (رعد۔ ۱۱)

یہ آیت ان لوگوں کو جو اس انتظار میں رہتے ہیں کہ خدا ہمیشہ کسی معمولی طریقے پر کاموں کو درست کر دے گا، صاف صاف بتاتی ہے کہ بے فائدہ انتظار نہ کرو۔ "ان" یعنی تحقیق کی رو سے بات یہ ہے، حقیقت اور واقعی یہ ہے کہ وہ لوگوں کے حالات اور اطوار اس وقت تک نہیں سدھارتا "حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ" جب تک کہ وہ لوگ خود ان باتوں کو تبدیل نہیں کرتے جو ان سے متعلق ہیں، جو ان کے اندر ہیں: اخلاق، ذہنیت، صلاحیتیں، غرض نیت اور آخر میں خود ان کی ذات، کیا آپ اس سے بھی واضح اور صاف ذمہ داری دکھا سکتے ہیں؟ کسی جماعت کے پیش نظر ذمہ داری۔ ایک اور آیت میں ایک قدیم بگڑی ہوئی امت کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ذَلِكَ بِأَنَّ اللهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَى قَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ"۔ ایسا اس لیے ہوا کہ اللہ جو نعمت کسی قوم کو عنایت فرماتا ہے اس وقت تک اسے نہیں بدلتا جب تک وہ خود اسے نہیں بدلتے۔ (انفال۔ ۵۳)

ایک لحاظ سے اس آیت میں تاکید نسبتاً زیادہ ہے۔ یہ کہنے کے بعد کہ وہ لوگ یوں بگڑ گئے اور چونکہ انہوں نے اپنی حالت خراب کر لی ہم نے بھی اس کی اچھی حالت کو بری حالت میں تبدیل کر دیا فرماتا ہے: "ذَلِكَ بِأَنَّ اللهَ" یہ اس وجہ سے ہے کہ خدا ایسا نہیں ہے یعنی جب ہم کہتے ہیں: "کان اللہ" یا کہتے ہیں: "ما کان اللہ" تو بات ایک سنت کی ہو رہی ہے کہ خدا ایسا نہیں ہے یعنی خدا کی خدائی کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا نہ ہو (جس وقت انسان کہتا ہے کہ میں ایسا نہیں ہوں، میں ایسا نہیں رہا ہوں تو وہ اپنی شخصیت پر بھروسہ کر کے یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں ایسا شخص ہوں کہ میری شخصیت کا لازمہ یہ ہے کہ میں گذرے زمانے میں ایسا تھا، آج بھی ایسا ہی ہوں): "ذَلِكَ بِأَنَّ اللهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَى قَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ": خدا ایسا نہیں تھا یعنی خدا کی خدائی کا تقاضا ایسا ہے۔ قرآن میں ایک اور آیت ہے جسے "لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا" کی مناسبت سے عرض کروں گا "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا" (بنی اسرائیل۔ ۱۵)، (ہم کسی قوم پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتے جب تک اس کی طرف رسول نہ بھیج لیں) تا کہ اس کے سامنے اتمام حجت نہ ہو جائے۔ ہم کسی قوم پر اس وقت عذاب نازل کرتے ہیں جب وہ لوگ

بات کو سمجھ لیتے ہیں لیکن اپنی سمجھ اور عقل کے باوجود دوسری طرح عمل کرتے ہیں، فرماتا ہے" ماکنا معذبین" ہم ایسے نہیں تھے یعنی ہمارا خدائی کا تقاضا ایسا ہے کہ ہم اس طرح نہیں ہو سکتے، ہمارا خدائی کا تقاضا ہے کہ ہم اس طرح کے ہوں: " ذَلِكَ بِأَنَّ اللهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَى قَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ " خدا ایسا نہیں ہے، کیا ہم اس سے بہتر ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اس سے زیادہ اطمینان دلا سکتے ہیں وہ " انتظارات" جس شکل میں ہم انتظار کر رہے ہیں وہ بیہودہ ہیں؟ یہاں نص قرآن ہے، ہم قرآن کی نص سے ٹکرا نہیں سکتے۔

علامہ اقبالؒ نے اسی آیت سے ایک نکتہ بیان کیا ہے جو بہت ہی اعلیٰ ہے۔ "حَتَّى يُغَيِّرُوا" کی ضمیر سے استفادہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں قرآن فرماتا ہے: " حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ" اور یوں نہیں فرماتا ہے:" حَتَّى يُغَيِّرَ مَا بِأَنفُسِهِمْ"۔ اگر ایسا کہتا تو اس کے معنی یہ ہوتے: خدا آدمیوں کے احوال کو چاہے وہ اچھے ہوں یا برے اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ خود ان سے متعلق یعنی روح، اخلاق اور ان خصوصیات سے متعلق جو ان کے اختیار و عمل میں ہیں احوال اور اوضاع بدل نہیں جاتے۔ نہیں ایسا نہیں فرماتا بلکہ "يُغَيِّرُوا" فرماتا ہے یعنی جب تک وہ خود اپنی ایجاد، اختیار اور سوچ کے ثبات میں پیشرفت نہیں کرتے ان کی وضع اور حالت نہیں بدلتی یعنی اگر کوئی اور قوم آ کر لوگوں کے اطوار و احوال زور زبردستی سے بدلنا چاہے جب تک کہ وہ لوگ خود ارادہ نہیں کر لیتے جب تک کہ وہ لوگ خود سوچ بچار میں ثبات پیدا نہیں کرتے ان کی وضع نہیں بدل سکتی۔ اے لوگو! انتظار نہ کرو کہ باہر سے دوسرے آئیں اور تمہاری وضع درست کریں، جو قوم یہ چاہے کہ باہر کے مشیر اس کیلئے کوئی ارادہ کریں تو کبھی بھی ترقی نہیں کرے گی چونکہ وہ " یغیروا" نہیں ہے اسے" یغیروا" ہونا ہی چاہیے۔ اس کے پاس ایجاد، خیال اور اسکیم ہونی چاہیے، اسے خود اپنے لئے فیصلہ اور انتخاب کرنا چاہیے، جس وقت کوئی قوم ایسے مقام پر پہنچ گئی جہاں اس نے اپنے لئے کوئی فیصلہ کیا، خود ہی اپنا راستہ منتخب کیا، خود ہی اپنے کام میں طباعی دکھائی وہ قوم خدا کی رحمت اور تائید کی آس لگا سکتی ہے اور ان چیزوں کا انتظار کر سکتی ہے جن کے قرآن نام گنواتا ہے، خدا کے فیوض، خدا کی امداد اور خدا کی تائید کی توقع کر سکتی ہے۔ اگر بیکار انتظار کرنا درست ہوتا اور انسان اپنی انسانی شخصیت پر ہی بھروسہ کرتا تو امام حسین علیہ السلام ہر شخص سے زیادہ اس بات کے لائق تھے کہ اس وقت تک انتظار کرتے رہتے جب تک خدا اپنی رحمت ان پر اور ان کی امت پر نازل نہ کرتا۔ پھر انہوں نے انتظار کیوں نہیں کیا؟ امام حسین علیہ السلام چاہتے تھے "إِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ" ہو۔ آپؑ چاہتے تھے کہ اپنی طباعی سے کام لیں۔ سماجی حالات میں تبدیلی لائیں اسی تعبیر سے جسے خود آپؑ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے سنا تھا: "فَلَمْ يُغَيِّرْ عَلَيهِ بِفِعْلٍ وَلَا قَوْلٍ كَانَ حَقًّا عَلَى اللهِ أَنْ يُدْخِلَهُ مُدْخَلَه" کیسے تبدیل کریں؟ کیا ارادہ کریں؟۔

سیدھے سادے کاموں سے ہم بھی واقف ہیں، انجام دے سکتے ہیں، سادہ مسائل کی سطح پر کام تو سبھی خوب کر لیتے ہیں مثلاً اسلام نے کہا کہ حاجی کی زیارت کو جاؤ (خوب ہم جاتے ہیں، چائے پیتے ہیں، مٹھائی کھاتے ہیں، کھڑے ہوتے ہیں، آ جاتے ہیں) یا تشییع جنازہ میں شریک ہو جاؤ، فاتحہ کی مجالس میں شرکت کرو، یہ اسلام کے آسان کام ہیں، ہر شخص یہ آسان کام کر سکتا ہے۔

اسلام ہمیشہ ایسے کاموں سے نہیں چلتا، ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ اس وقت امام حسین علیہ السلام کی طرح کھڑا ہونا اور حرکت کرنا چاہیے، امام حسین علیہ السلام کی طرح قیام کرنا چاہیے جو نہ صرف اس دن کے اسلامی معاشرے کو جھنجھوڑ ڈالے بلکہ اس کی لہر پانچ سال کے بعد ایک رنگ میں اپنا اثر دکھائے، دس سال بعد دوسرے رنگ میں اثر ڈالے، تیس سال بعد ایک اور شکل میں ساٹھ سال کے بعد کسی اور شکل میں سو سال، پانچ سو سال کے بعد اور شکلوں میں اور ہزار سال کے بعد بھی تحریکوں میں روح پھونکے، اس کو کہتے ہیں:

"یُغَیِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ"

(از کتاب: حماسہ حسینی (شہید مرتضیٰ مطہریؒ)

حسینی تحریک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عنصر

حصہ دوم

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی شرائط

معلوم ہوا کہ تحریک حسینی میں کل تین عوامل کارفرما ہیں: ایک بیعت سے انکار، دوسرے اہل کوفہ کی دعوت قبول کرنا اور تیسرے جو دونوں سے زیادہ مستحکم ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ان تینوں میں سے ہر ایک نے اپنے طور پر امامؑ کیلئے ایک ذمہ داری معین کر دی کہ جس کے عوض خاص ردعمل دکھایا جائے۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اس تحریک کی قدر ومنزلت ان تینوں عوامل کے مطابق مختلف اور جدا جدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہم صرف اہل کوفہ کی دعوت کے عامل کو نظر میں رکھیں تو اس تحریک کی ایک مقررہ حد تک اہمیت ہوگی۔ اگر بیعت سے انکار کے عامل کو نظر میں رکھیں تو اس کی اہمیت اور قدر ومنزلت بہت زیادہ عظیم ہوگی۔ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عامل کو نظر میں رکھیں تو اس کی اہمیت سو فیصد بڑھ جائے گی۔ وجہ یہ ہے کہ دعوت کے عامل سے کامیابی کا امکان تقریباً پچاس فیصدی یا اس سے بھی کمتر ہے لیکن بیعت سے انکار کے عامل سے اتنا بھی امکان نہیں ہے بلکہ وہ تو سو فیصد خطرناک مقابلہ ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور بیعت کے عامل میں بھی اتنا ہی عظیم فرق ملتا ہے۔ بیعت کے عامل میں مطالبہ دشمن کی طرف سے ہے یعنی ایک غیر شرعی اور ناجائز مطالبہ ہے اس لئے امامؑ اس مطالبہ کے جواب میں ”نہ“ کہتے ہیں۔ منع کر دیتے ہیں، قبول نہیں کرتے، اگر ہم صرف اسی عامل کو نظر میں رکھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ لوگ امامؑ سے یہ مطالبہ نہ کرتے تو امامؑ ان کے مقابلے میں نہ کھڑے ہوتے چونکہ انہوں نے یہ مطالبہ کر دیا اس لئے امامؑ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو یہ مطالبہ قبول نہیں کرتا ان لوگوں کے مقابلے میں ڈٹ گئے لیکن جب ہم تیسرے عامل امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو نظر میں رکھتے ہیں نہ تو

کوفہ کی دعوت اور نہ بیعت کا تقاضا بلکہ خود امامؑ ان کے مقابلے میں قیام کرتے ہیں اور یہاں بیعت کا مطالبہ بھی پیچھے جا پڑتا ہے بلکہ غور کریں تو امامؑ از خود ان لوگوں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔ دراصل حالات کا بگاڑ، برائیوں کا پھیلاؤ، منکرات وممنوعات کا عام ہونا، خود امامؑ کے الفاظ میں حرام کا حلال ہونا اور آخر میں معاشرے کو بگاڑنے والے ناگفتہ بہ حالات امامؑ کو ان کے مدمقابل کھڑا کر دیتے ہیں اور آپ کو قیام پر مجبور کرتے ہیں۔ امامؑ کے قیام کی اہمیت اس تیسرے عامل سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ عامل ایک دوسری ہی شکل اختیار کر لیتا ہے، دوسرا ہی حساب کھول دیتا ہے اور اس بات کا نہایت اچھا اور اعلیٰ عامل حالات کا یہی پہلو ہے جس نے اس تحریک کو ایسی شائستگی عطا کر دی ہے کہ یہ ہمیشہ تاریخ کی پیشانی پر چمکتی رہے ابد تک زندہ رہے اور دنیا میں ایک دائمی عامل اور بے مثال تحریک بن کر رہے البتہ مزید خصوصیات کے ساتھ کہ جو بیان کی جائیں گی۔

یہ عامل اس تحریک کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے اور اس دلیل کی رو سے ہمیں چاہئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اسلام کے نقطۂ نظر سے پہنچاننے کی کوشش کریں کہ یہ کیا اصل ہے؟ یہ کیا چیز ہے؟ جو اس قدر بنیادی اور طاقتور ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام جیسے بہادر شخص کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اسلام کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دیں، اپنا خون بہائیں، اپنے رشتہ داروں کا خون بہائیں اور اپنی جان ایسی مصیبت میں ڈال دیں جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی تب ہم تقریباً چودہ سو سال بعد امامؑ کے سامنے کھڑے ہو کر یوں گواہی دیتے ہیں:

”أَشْهَدُ أَنَّكَ قَدْ أَقَمْتَ الصَّلَاةَ وَ آتَيْتَ الزَّكَاةَ وَ أَمَرْتَ بِالْمَعْرُوفِ وَ نَهَيْتَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ جَاهَدْتَ فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهِ حَتَّى أَتَاكَ الْيَقِين“۔ اس گواہی کے مفہوم پر ٹھیک ٹھیک غور کیجئے۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؑ نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ اس کے تمام شرائط کے ساتھ ادا کی۔ ”وَ أَمَرْتَ بِالْمَعْرُوفِ وَ نَهَيْتَ عَنِ الْمُنْكَرِ“ آپ نے نیکی کی ہدایت کی اور بدی سے روکا یعنی آپؑ کی پوری تحریک نیکی کا حکم اور بدی کی ممانعت ہے۔ وَ جَاهَدْتَ فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهِ“ آپ نے خدا کی راہ میں جہاد کیا جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔

اب ایک نکتہ یہ ہے کہ ہم زیارت وارثہ میں کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں، ہم کس شخص کیلئے گواہی دیتے ہیں؟ ہم عام طور پر قاضی کے یہاں جا کر گواہی دیا کرتے ہیں۔ جب قاضی کے سامنے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی اور ہم اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: قاضی صاحب! میں گواہی دیتا ہوں کہ فلاں نے فلاں وقت فلاں عنوان کے تحت ان صاحب سے اتنی مقدار کی واپسی کا تقاضا کیا تھا، ہم اس وقت گواہی دیتے ہیں، ہم کس شخص کے سامنے گواہی دیتے ہیں؟ کیا خدا کے سامنے گواہی دیتے ہیں؟ کس کے حق میں؟ امام حسین علیہ السلام کے حق میں؟ معانی و بیان کے علماء ایک نکتہ کا ذکر کرتے ہیں جو بہت اعلیٰ ہے اور وہ یہ ہے کہ: بعض اوقات انسان کسی موقع پر کوئی بات اس لئے نہیں کہتا کہ سننے والا سمجھ جائے، اسے وہ بات سمجھائے بلکہ سننے والے کو یہ سمجھانے کیلئے کہتا ہے کہ میں اسے یوں سمجھ رہا ہوں۔ یہ بات بہت عام سی ہے، کبھی کبھی آپ کسی کے سامنے کسی بات کی گواہی دیتے ہیں، اس لئے نہیں کہ وہ سمجھ جائے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ خود یہ بات سمجھتا ہے بلکہ آپ اپنی گواہی سے اسے یہ سمجھانا چاہتے ہیں، اس کے

سامنے اقرار کرتے ہیں تا کہ وہ جان لے کہ آپ یہ بات جانتے اور سمجھتے ہیں۔

اس مقام پر گواہی کے معنی اقرار کے ہیں، میں گواہی دیتا ہوں یعنی میں بھی ہر سمجھدار اور حقیقت جاننے والے آدمی کی طرح اس بات کا اعتراف کرتا ہوں اور یہ بات مانتا ہوں کہ اے اباعبداللہ علیہ السلام! آپ کی تحریک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تحریک تھی یعنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپؑ نے صرف اہل کوفہ کی دعوت پر قیام نہیں کیا، آپؑ تو ان کی دعوت سے پہلے ہی قیام کر چکے تھے، کوفیوں نے آپ کو بعد میں دعوت دی، میں گواہی دیتا ہوں، مانتا ہوں کہ آپ کی تحریک صرف یہ نہیں تھی کہ میں بیعت نہیں کرتا یعنی آپ کی تحریک صرف بیعت سے انکار کی تحریک نہیں تھی۔ آپ کی تحریک میں تو دوسری ہی بات شامل تھی، آپ نے اسلام کی ایک اصل کو جاری کر دیا اور وہ اصل امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نے حسینی تحریک کے مقام اور قدر کو بہت بلند کر دیا ہے۔ اس ایک خصوصیت بلکہ اور بھی دوسری خصوصیات کے علاوہ، میں ایک ایسی خصوصیت بیان کرتا ہوں جو پیغمبروں، اللہ کے ولیوں اور مومنوں کی تمام تحریکوں کو دوسرے انسانی رہبروں کی تحریک سے ممتاز کرتی ہے۔ امتیاز بخشتی ہے۔ وہ کیا ہے؟ انسان کے عمل کا ایک جسم ہوتا ہے اور ایک روح ہوتی ہے، ممکن ہے کہ میں اور آپ کوئی کام یکساں طور پر انجام دیں لیکن کس نقطہ نظر سے یکساں؟ اس نقطہ نظر سے کہ میرے کام کا جسم اور آپ کے کام کا جسم ایک جیسا ہے۔ فرض کیجئے ہم دونوں آدمی نماز پڑھتے ہیں، ہم دونوں فلاں نیک کام میں پیسہ خرچ کرتے ہیں، میں سو روپے دیتا ہوں آپ بھی سو روپے دیتے ہیں، میں چار رکعت نماز پڑھتا ہوں آپ بھی چار رکعت نماز پڑھتے ہیں۔ ان کاموں کی ادائیگی میں ایک دوسرے کے مابین کوئی فرق نہیں ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ آپ جس خلوص نیت، خضوع اور خشوع، جس اخلاص و محبت، جس عشق اور جس روحانی جذبے سے سرشار ہوں اس سے میں نہ ہوں۔ یہ بات آپ کے کام کی قدر و قیمت کو میرے کام سے ہزار گنا بڑھا دیتی ہے۔ خدا کی راہ میں تو بہت سے لوگوں نے جہاد کیا لیکن "ضربة علی یوم الخندق افضل من عبادة الثقلین" کس لئے ہے؟ علی علیہ السلام کا ایک وار اتنی اہمیت حاصل کر جاتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ علیؑ وہاں پہنچ گئے تھے جہاں اہل عرفان کے قول کے مطابق "فنافی اللہ" ہو گئے تھے یعنی ان کے وجود میں انانیت اور خودی جیسی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔ اس حال میں جب دشمن آپ کے منہ پر تھوک دیتا ہے تو آپؑ اس کا سر کاٹنے سے رک جاتے ہیں کہ کہیں اس کے اس فعل سے پیدا ہونے والا غصہ آپؑ کے عمل پر اثر انداز نہ ہو جائے، آپؑ کے عمل کی روح کو متاثر نہ کر دے، وہ چاہتے ہیں کہ اس مقام پر اس کا وجود باقی نہ رہے، ان کی روح میں صرف خدا کا وجود ہو۔ آپ یہ پہلو صرف انبیاء اور اولیاء کے مکتب میں دیکھیں گے۔ انبیاء علیہم السلام کے مکتب کے علاوہ کسی اور مکتب میں ایسی بات نہیں پائیں گے۔

" التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ "

اس آیت میں دوسرے چند لفظوں کے بعد " التَّائِبُونَ " کا لفظ آتا ہے یعنی خدا کی طرف پلٹنے والے۔ عرفاء کہتے ہیں کہ سلوک کی پہلی منزل توبہ ہے کیسی توبہ یعنی واپسی، جو شخص کسی دوسری راہ پر چلتا ہے وہ ایک بار حق کی راہ پر واپس آتا ہے، خدا کی طرف پلٹتا

ہے "التَّائِبُونَ الْعابِدُونَ " توبہ کے بعد یہ لوگ خدا کے عبادت گزار ہوجاتے ہیں، خدا کی عبادت کرتے ہیں، غیر خدا کو نہیں پوجتے ،خدا ان کے وجود پر حکومت کرتا ہے، خدا کے علاوہ ان کا کوئی حاکم نہیں ہوتا، یہ صرف خدا کا حکم مانتے ہیں، غیر خدا کا حکم نہیں مانتے، خدا کی اطاعت کرتے ہیں غیر خدا کی پیروی نہیں کرتے "الْحامِدُونَ " یہ حمد کرتے ہیں لیکن خدا کے سوا کسی دوسری ہستی کی تعریف نہیں کرتے، دوسری ہستی کو مطلق اور اس لائق نہیں سمجھتے کہ اس کی مدح کریں، اسے سراہیں، اس کے گن گائیں، یہ صرف خدا کی تعریف کرنے اور اسی کے گن گانے والے ہیں، "السَّائِحُونَ " سیاحت کرنے والے ہیں ۔سیاحت کے بارے میں تفسیروں میں مختلف بیانات ملتے ہیں، بعضوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد روزہ رکھنا ہے یعنی روحانی سیاحت جو روزے میں ہوتی ہے لیکن بہت سے محققین کی طرح علامہ محمد حسین طباطبائیؒ بھی تفسیر المیزان میں اسے نہیں مانتے ۔ایک گمان یہ ہے کہ وہ لوگ جو زمین کی سیر کرتے ہیں کیونکہ قرآن میں انسان کو زمین کی سیر کی دعوت دی گئی ہے، زمین کی کیسی سیر؟ دنیا کا مطالعہ، وہ سیر و سیاحت نہیں جس کا مقصد صرف تفریح اور من بہلاوا ہو! اسلام انسان کی زندگی کو اس سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے، وہ صرف تماشائی کی حیثیت سے دنیا کی سیر کرتا پھرے البتہ اسلام ایسی سیاحت کی سفارش کرتا ہے جس میں انسان سوچے، غور کرے، سبق حاصل کرے: "قل سیروا فی الارض " یہ سبق اور سوچ و بچار ہے ۔ السَّائِحُونَ وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے، وہ انسانی معاشروں کے حالات کا مطالعہ کرنے والے، وہ آفرینش کائنات کے قوانین کا مطالعہ کرنے والے، وہ جو اپنے ذہنوں میں کثیر تعداد میں روشن خیالات رکھتے ہیں ۔اس کے بعد یہ آیت عبادت کے دو مظاہر بیان کرتی ہے "الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ " وہ لوگ جو رکوع اور سجدے کی حالت میں اپنے خدا کی تسبیح پڑھتے ہیں، رکوع میں کہتے ہیں: "سبحان ربی العظیم و بحمدہ" سجدوں میں کہتے ہیں " سبحان ربی الاعلیٰ و بحمدہ" یہ " سبحان ربی العظیم و بحمدہ" اور" سبحان ربی الاعلی و بحمدہ" کہنے والے "الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ " ہیں ۔ یہ ایسی روح، ایسے خیالات، ایسے روحانی سامان، ایسی روحانی پونجی کے ساتھ معاشرے کی اصلاح کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔وہ لوگ جو پہلے خود نیک بن چکے ہیں بعد میں چاہتے ہیں کہ دوسروں کی اصلاح کریں، دوسروں کو نیک بنائیں ۔امر معروف اور ناہی منکر یعنی مصلح ،اصلاح کرنے والے سدھارنے والے ۔کیا غیر صالح مصلح ہوسکتا ہے؟ وہ لوگ جنہوں نے پہلے اپنی اصلاح کی ہے اپنے آپ کو ادب سکھایا اور تربیت دی ہے مصلح یعنی سدھارنے والے، اصلاح کرنے والے ہوسکتے ہیں ۔

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں: "مَنْ نَصَبَ نَفْسَهُ لِلنَّاسِ إِمَاماً فَعَلَيْهِ أَنْ يَبْدَأَ بِتَعْلِيمِ نَفْسِهِ قَبْلَ تَعْلِيمِ غَيْرِهِ وَ لْيَكُنْ تَأْدِيبُهُ بِسِيرَتِهِ قَبْلَ تَأْدِيبِهِ بِلِسَانِهِ وَ مُعَلِّمُ نَفْسِهِ وَ مُؤَدِّبُهَا أَحَقُّ بِالْإِجْلَالِ مِنْ مُعَلِّمِ النَّاسِ وَ مُؤَدِّبِهِمْ " (وسایل الشیعہ ،ج۱۶،ص ۱۵۰) یعنی جو شخص اپنے آپ کو لوگوں کی رہنمائی کیلئے پیش کرتا ہے، لوگوں کا معلم اور مربی بنا کر پیش کرتا ہے، واعظ اور خطیب بنا کر پیش کرتا ہے، لوگوں کا ہادی اور رہبر بنا کر پیش کرتا ہے، اسے چاہئے کہ وہ سب سے پہلے اپنے آپ سے شروع کرے، پہلے اس نے آپ کو تعلیم دی ۔ یہ سمجھ لے کہ خود اسکے اندر ایک جاہل موجود ہے، پہلے اس جاہل کو

تلقین کرے جوخود اس کے اندر موجود ہے اور جس کا نام نفس امارہ ہے۔ یاد رکھئے کہ خود اس کے اندر ایک غیر تربیت یافتہ ہستی ہے پہلے اس کی تربیت اور تادیب کرے، پہلے اپنے نفس کو نصیحت کرے، ملامت کرے، اپنے نفس سے حساب لے، جب وہ اپنی درستی اور تہذیب کر کے نیک بن جائے تب اس بات کا دعویٰ کرسکتا ہے کہ میں لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کرسکتا ہوں، لوگوں کو وعظ کرسکتا ہوں، لوگوں کو تعلیم دے سکتا ہوں، لوگوں کی تربیت اور تادیب کرسکتا ہوں، معاشرے کا مصلح بن سکتا ہوں۔ آپؑ نے فرمایا: "فَالْحَقُّ أَوْسَعُ الْأَشْيَاءِ فِي التَّوَاصُفِ وَ أَضْيَقُهَا فِي التَّنَاصُفُ" کیا جملہ ہے یہ! لوگ اسے دل پر نقش کرلیں۔ فرمایا ہے حق اور عدالت کا میدان، بات کہتے، گفتگو کرتے، تقریر کرتے اور زبان سے کام لیتے وقت بہت وسیع اور کشادہ ہوتا ہے یعنی باتیں کرنے کیلئے حق کے میدان سے زیادہ وسیع کوئی میدان نہیں ہے، اگر انسان چاہے کہ حق کے متعلق ہر موضوع سے زیادہ لچھے دار تقریر کرے، فن لسانی سے کام لے، گفتگو کرے تو نہایت آزادی اور سہولت سے کرسکتا ہے لیکن جب عمل کا موقع آتا ہے تو پھر حق کے میدان سے زیادہ تنگ اور کوئی میدان نہیں ہے، اس وقت انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنا دشوار ہے، حق کے بارے میں باتیں بتانا جتنا آسان تھا عمل کا موقع آنے پر ایک قدم اُٹھانا بھی اتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں قرآن بھی "التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ" کہنے کے بعد "الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ" کہتا ہے۔ یہ لوگ ہیں جو نیکی پھیلانے کی راہ پر چلتے ہیں بدی، اور بگاڑ کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں جو یہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ "وبشر المومنین" یہاں مومنوں کو خوش خبری سنادو کہ اگر وہ" تائب "(توبہ کرنے والے) اور ساجد" (سجدہ کرنے والے) ہو گئے اور اس کے بعد نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے والے بن گئے تو وہ کامیاب ہو جائیں گے اور اگر سب کچھ ہونے کے بعد بھی وہ نیکی کا حکم دیتے اور بدی سے روکتے بھی تھے لیکن خود ان کا دامن صاف نہیں تھا، اگر دوسروں سے توبہ کرانے والوں نے خود توبہ کم کی تب بھی وہ کچھ حاصل نہیں کرسکیں گے۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا: "لَعَنَ اللهُ الْآمِرِينَ بِالْمَعْرُوفِ التَّارِكِينَ لَهُ وَ النَّاهِينَ عَنِ الْمُنْكَرِ الْعَامِلِينَ بِهِ" خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جو دوسروں کو نیکی کی تلقین تو کرتے ہیں لیکن خود اس نیک کام کے خلاف کرتے ہیں اور ان لوگوں پر جو دوسروں کو برائیوں سے روکتے ہیں لیکن خود انہیں برائیوں پر عمل کرتے ہیں (وسائل الشیعہ، ج۱۶ص ۱۵۱)

یعنی جو نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے خود "التَّائِبُونَ" نہیں ہیں "السَّاجِدُونَ" نہیں ہیں "الْحامِدُونَ" نہیں ہیں "السَّائِحُونَ" نہیں ہیں "الرَّاكِعُونَ" نہیں ہیں، جنہوں نے ابھی یہ مراحل اور منزلیں طے نہیں کی ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ آمر معروف اور ناہی منکر بن جائیں خدا ایسے لوگوں پر لعنت کرے۔

عارفوں کی اپنی ایک اصطلاح ہے: وہ دعوی کرتے ہیں کہ سالک چار مختلف سیریں کرتے ہیں:

۱ ـــــ سیر من الخلق الی الحق: یعنی دنیا اور فطرت کی طرف سے خدا کی طرف سیر۔

۲ ـــــ سیر بالحق فی الحق: خود خدا کی ذات کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں۔

۳ ـــــــ سیرمن الحق الی الخلق: خدا کی طرف سیر یعنی لوگوں کی ہدایت و رہبری کے لئے آنا۔

۴ ـــــــ سیر بالحق فی الخلق: دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں جو شخص ایسی لیاقت رکھتا ہے کہ دوسروں کی مدد کر سکے، دوسروں کا ہادی اور رہنما ہو سکے، نیکی کا حکم دے سکے اور بدی سے روک سکے کیونکہ وہ خود اس منزل تک پہنچا ہے اور بعد میں اسے یہ حکم ملا ہے کہ وہ لوگوں کو اس مقام تک لے جائے جہاں وہ خود فائز ہوا ہے۔

معلوم ہوا کہ حسینی تحریک کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے یہ عظمت اور یہ قدر و قیمت حاصل ہوئی ہے۔ تو اس اصل کو پہچان لینا چاہیے کہ یہ اصل کتنی اہمیت رکھتا ہے جو امام حسینؑ اپنے آپ کو اس راہ میں قربان کر دیتے ہیں اور وہ کتنا شائستہ ہے جو اس کی خاطر امام حسینؑ کی طرح قربان ہو جائے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہ بے مثل اصل ہے جو اسلام کی بقا کا ضامن ہے۔ اصطلاح فلسفہ میں علت مبقیہ ہے یعنی باقی رکھنے والا عامل ہے، واقعی اگر یہ اصل نہ ہو تو اسلام بھی نہ رہے۔ یہ مسلمانوں کی حالت کی برابر جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے۔ آیا کوئی کارخانہ، ماہر انجینئروں کی مسلسل جانچ پڑتال کے بغیر جو یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ اس کی کیا حالت ہے باقی رہ سکتا ہے۔ کیا یہ اصولی طور پر ممکن ہے کہ کوئی کارخانہ بدستور اپنے حال پر قائم رہے، ہم اس کے متعلق بالکل ہی نہ سوچیں اور پھر بھی وہ اپنی وضع پر چلتا رہے؟ ہرگز نہیں! یہی حال معاشرہ کا ہے۔ ایک اسلامی معاشرہ کا یہی طور ہے بلکہ سو درجے بلند و بالا۔ آپ کون سا انسان ایسا پیش کر سکتے ہیں جو معالجہ کا محتاج نہ ہو؟! یا تو انسان خود ہی اپنے جسم کا معالج ہو جو اس کا علاج کریں۔ آنکھ کا ماہر، کان، حلق، ناک کا ماہر، مزاج کا ماہر، اعصاب کا ماہر۔ انسان ہمیشہ طرح طرح کے معالجوں پر نظر ڈالتا رہتا ہے تا کہ وہ اس کے جسم کا معائنہ کریں اور یہ دیکھیں کہ اس کی کیا حالت ہے۔ تو کیا پھر معاشرہ غور و فکر اور دیکھ بھال کا محتاج نہیں ہوتا؟ کیا معاشرہ جانچ پڑتال نہیں چاہتا؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ ہرگز نہیں! امام حسینؑ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر یعنی اس بنیادی اصل کی خاطر جو اسلامی معاشرہ کی بقا کا ضامن ہے شہید ہوئے۔ یہ اصل اگر نہ ہو تو انسجام معاشرہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے، بکھر جاتا ہے، اس کا انجام جماعت کے ڈھانچے کا ٹوٹ جانا، نابودی اور بربادی ہے۔ ہاں! یہ اصل اتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن کی بہت سی آیات موجود ہیں۔ قرآن کریم کچھ قدیم معاشروں کا ذکر کرتا اور کہتا ہے کہ یہ بکھر گئے، ہلاک ہو گئے، تباہ و برباد ہو گئے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا موجب ان معاشروں میں اصلاح کی توانائی اور قوت نہ ہونا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قوت نہ تھی بلکہ ان لوگوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا احساس بھی مردہ ہو چکا تھا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کون کون سی شرائط ہیں اور ہم کس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر سکتے ہیں؟ سب سے پہلے تو یہ بات ہے کہ "معروف" اور "منکر" کے کیا معنی ہیں؟ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کسے کہتے ہیں؟ اسلام نے یہ نہیں چاہا کہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے موضوع کو مقررہ اشیاء جیسے عبادات، معاملات، اخلاقیات، گھریلو احاطے وغیرہ میں محدود کرے اس لئے ایک عام لفظ استعمال کیا ہے "معروف" یعنی ہر موقع پر (نیکی اور بھلائی کے ہر کام میں) امر بالمعروف

لازم ہے۔اس کی ضد ہر برا کام ہے،اس نے شرک یا فسق یا غیبت یا جھوٹ یا عیب جوئی یا تفرقہ اندازی یا سود یا ریا اور منافقت نہیں کہا بلکہ منکر کہا یعنی ہر چیز جو بری اور خراب ہے۔"امر" یعنی حکم "نہی" یعنی ممانعت،روک ٹوک۔لیکن یہ حکم کیا ہے؟ کیا اس حکم سے لفظی حکم مراد ہے؟ کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف زبانی معاملہ ہے؟ کیا صرف زبان سے ہی نیکی کا حکم دینا چاہئے اور زبان سے ہی بدی کی ممانعت کرنا چاہیے؟ نہیں!امر بالمروف اور نہی عن المنکر کا تعلق دل اور ضمیر سے ہے،زبان سے ہے،ہاتھ اور عمل سے بھی ہے۔آپ کو چاہیے کہ اپنے پورے وجود کے ساتھ آمر معروف اور ناہی عن المنکر ہوں۔حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے لوگوں نے پوچھا کہ قرآن نے روئے زمین کے بعض جانداروں کے لئے کہا کہ وہ مردہ ہیں۔اس کا کیا مطلب ہے؟"میت الاحیاء" زندوں میں مردہ کون ہے اور کیسے ہے؟ آپ نے جواب دیا:انسانوں کے کئی طبقے ہیں۔بعض لوگ جب منکرات دیکھتے ہیں تو ان کے دل پر اثر ہوتا ہے،ان کی ہڈیوں کا گودا تک جلنے لگتا ہے،ان کی زبان کھل جاتی ہے،وہ تنقید کرنے لگتے ہیں،کہہ اٹھتے ہیں کہ اس منکر سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے اسے انجام دیتے ہیں۔آپ نے فرمایا:یہ تمام زندوں کا ایک زندہ ہے۔بعض دوسرے ایسے ہوتے ہیں کہ جس وقت منکرات کو دیکھتے ہیں ان کے دل سلگ اٹھتے ہیں،زبان سے کہنے لگتے ہیں،چیخنے چلانے لگتے ہیں،فریاد اور احتجاج کرتے ہیں،نصیحت کرتے ہیں،،وعظ و پند کرتے ہیں۔لیکن جب عمل کی باری آتی ہے تو وہ میدان میں نہیں آتے۔آپؑ نے فرمایا:اس میں بھی زندگی کی دو تین خصلتیں ملتی ہیں لیکن زندگی کی ایک خصلت نہیں ملتی۔

تیسری قسم:اس شخص کے دل میں آگ لگ جاتی ہے لیکن صرف جوش میں آتا ہے،صرف ناخوش ہوتا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک منزل یہ بھی ہے۔کہ آپ اپنے بیٹوں کے اسلامی نام رکھئے(یہ امر بالمعروف ہے) اور غیر اسلامی ناموں کی مخالفت کیجئے(یہ نہی عن المنکر ہے)اپنے اداروں کے نام اسلامی رکھئے،آپ مدرسہ کی بنیاد رکھتے ہیں،شفاخانہ بناتے ہیں،ان میں یہ بات مشترک رکھئے۔اسلامی نام زندہ رکھئے۔اسلام کی زبان زندہ رکھئے،عربی زبان ایک قوم کی زبان نہیں ہے،اسلام کی زبان ہے،عربی زبان عرب کی زبان نہیں ہے اسلام کی زبان ہے۔اگر قرآن نہ ہوتا تو دنیا میں اس زبان کا بھی مطلق وجود نہ ہوتا۔ہمارا اہم فریضہ یہ ہے کہ ہم اس زبان کی حفاظت کریں۔جو ثقافت اور جو تہذیب زندہ رہنا چاہتی ہے اس کی زبان کو زندہ رہنا چاہیے،اگر اس کی زبان مرگئی تو سمجھئے کہ وہ خود بھی مرگئی۔اس کھلم کھلا لڑائی پر جو آپ عربی زبان کے خلاف دیکھتے ہیں آپ کو چونکنا اور سمجھنا چاہئے،شعور رکھئے،عقل رکھئے۔خدا کی قسم یہ اسلام سے جنگ ہے،یہ حروف تہجی (الف،ب) سے لڑائی نہیں ہے۔خدا کی قسم ہم پر عربی زبان کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اسلام کی اس زبان کی حفاظت کریں،اسے بچائیں۔آپ کی کسی نے مزاحمت کی ہے؟ کلاسیں بنائیں اور جو عربی جانتے ہیں انہیں بلائیے۔آپ خود،آپ کے اہل خانہ اس میں شرکت کریں،آپ کو بہت فائدہ ہوگا کیونکہ یہ بھی دنیا کی ایک زندہ زبان ہے۔

یہ جو انگریزی زبان والوں نے اپنی زبان کی اشاعت کی اور اسے اس حد تک ہم پر تھوپا اور مسلط کیا کہ وہ ہمارے گھروں کے اندر بھی نفوذ کرگئی ہے آخر کس لئے؟ کیا ان کے دل ہمارے حال پر کڑھتے تھے؟ یہ صرف اس لئے ہوا کہ وہ اپنی عادات ہم پر

 تھوپیں اپنے افکار کو ہم پر مسلط کریں، اپنی ثقافت کو ہم پر مسلط کریں اپنے رواج کو ہماری روح میں ڈالیں تا کہ ہماری روح کو حقیر و ناچیز بنا دیں۔

ہم مسلمان کتنے غافل تھے اور کتنے غافل ہیں؟ نہ صرف ہم بلکہ دنیائے اسلام میں جس جگہ انسان پہنچتا ہے۔ یہ دیکھتا ہے کہ صدیوں سے سو رہے ہیں۔خوش قسمتی سے رفتہ رفتہ مسلمان جاگنے لگے ہیں۔کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مکہ یا مدینہ میں جب دو مختلف ملکوں کے دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں تو ایکدوسرے کی زبان نہیں سمجھ پاتے مجبوراً انگریزی زبان سے کام لیتے ہیں۔ یہ تین سو چار سو سال کی اسکیمیں ہیں۔کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہم ان اسکیموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں؟ ''كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ'' یہ عظیم فریضہ (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) دو رکن اور بنیادی شرطیں رکھتا ہے ایک رکن اور شرط رشد، آگاہی اور بصیرت ہے۔میں نے ابھی جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت کے بارے کہا تو لازمی طور پر ہم سب نے یہ سوچا کہ اچھا اب اس محفل سے جا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا ہے لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا ہے اور کس طرح کیا جاتا ہے؟ ابھی تک تو ہمارا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لوگوں کے لباس کے بٹن اور جوتے کے بندوں کے متعلق رہا،لوگوں کے سر کے بالوں اور لباس کی سلائی کے آس پاس رہا ہے! ہم معروف کو کیا پہچانیں کہ کیا ہے؟ منکر کو کیا جانیں کہ کیا ہے؟ ہم کبھی معروف کو منکر اور کبھی منکر کو معروف بنا دیتے ہیں۔بہتر یہی ہے کہ ہم جاہل لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کریں۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام سے کیسے منکرات نہیں ہوئے؟ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیلئے آگاہی اور بصیرت چاہیے، دانائی و بینائی کار آزمودہ چاہیے، حقائق شناسی ،نفسیات اور جامعہ شناسی چاہیے، تا کہ انسان سمجھ لے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کس طرح کرے؟ یعنی نیکی کی راہ کو پہچانے اور جانے کہ نیکی کہاں ہے؟ منکر کو جڑ سے اکھاڑ دے کہ اس کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اسی لئے تو آئمہ دینؑ نے فرمایا: بہتر ہے کہ جاہل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے کیوں؟ ''لانه مايفسده اكثر مما يصلحه'' وجہ یہ ہے کہ جس وقت جاہل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بہتر کرنا چاہتا ہے تجربہ کار نہ ہونے کی وجہ سے بدتر کر بیٹھتا ہے، اس ضمن میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔شاید آپ کہیں ہم جاہل ہیں اس لئے ہم پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب نہیں رہا! آپ کو جواب دیا جا چکا ہے قرآن فرماتا ہے:

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ

کہ ہلاک ہونے والا واضح دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور زندہ رہنے والا واضح دلیل کے ساتھ زندہ رہے (انفال: ۴۲)

اور ایک اور مقام پر فرمایا:

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ

تا کہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کسی حجت کی گنجائش نہ رہے (نساء: ۱۶۵)

معصومینؑ میں سے کسی سے سوال کیا گیا: بعض لوگ جاہل ہوتے ہیں، قیامت میں ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ آپ نے

فرمایا:اس دن ایک عالم کو لائیں گے جس نے عمل نہیں کیا ہوگا،اس سے پوچھیں گے تو نے عمل کیوں نہیں کیا؟ جواب نہیں بن پڑیگا تو وہ اپنے شرمناک اور خوفناک مقدر سے دوچار ہوگا۔ایک آدمی کو لائیں گے اور پوچھیں گے تو نے عمل کیوں نہیں کیا؟ وہ کہے گا میں نہیں سمجھ سکا،میں نہیں جان پایا!وہ کہیں گے:"ہلاّ تعلمت" میں نہیں جانتا۔میں نہیں سمجھتا بھی کوئی عذر ہوا؟ خدا نے عقل کس لئے پیدا کی ہے؟اس لئے کہ تو سمجھے،جستجو کرے،تحقیق کرے۔تجھے تو ان لوگوں میں سے ہونا چاہیے کہ جو نہ صرف اپنے ہی زمانے کے حالات سمجھیں بلکہ آئندہ کے حالات بھی سمجھیں امیرالمومنینؑ نے فرمایا:"ولا تتخوف قارعةً حتی تَحُلُّ بنا" ہمارے لوگ نادان رہے ہیں۔وہ ان بلاؤں کو جو ان پر نازل ہوتی ہیں اس وقت تک نہیں پہچان پاتے جب تک کہ وہ ان کے سامنے نہ آجائیں،ان میں پیش بینی نہیں ہے۔پیش بینی کیوں نہیں ہے؟انہیں پہلے سے دیکھ اور سمجھ لینا چاہیے۔انہیں نہ صرف اپنے زمانے کے حالات اور طور طریقوں سے آگاہ ہونا چاہیے بلکہ معاشرے کو اس حد تک پہچان لینا چاہیے کہ جو مصیبتیں مستقبل میں پیش آنے والی ہوں ان کی تشخیص کرلیں کہ پچاس سال بعد ایسا ہوگا۔جیسا کہ قرآن مجید ابراہیمؑ کے بارے میں فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ

ہم نے ابراہیم کو پہلے سے ہی عقل کامل عطا کردی تھی۔(انبیاء۔۵۱)

امام حسینؑ کی تحریک کو جو چیز زیادہ اہمیت بخشتی ہے وہ روشن بینی ہے۔روشن بینی کا کیا مطلب ہے؟یعنی امام حسینؑ نے اس روز کچی اینٹ میں وہ چیزیں دیکھ لیں جو دوسرے لوگ آئینے میں بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔(کچی اینٹ میں دیکھنا ایک ضرب المثل ہے)ہم آج بیٹھے ہوئے اس زمانے کے حالات کی تشریح کررہے ہیں لیکن جو لوگ اس زمانے میں موجود تھے وہ اس طرح نہیں سمجھ پائے جس طرح امام حسینؑ سمجھ رہے تھے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مراحل

پہلا مرحلہ:قطع تعلق و دوری اختیار کرنا

نہی عن المنکر کا پہلا درجہ اور مرتبہ ہجر اور اعراض ہے یعنی ترک اور بے اعتنائی جس وقت آپ کسی ایک فرد یا افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ منکرات کے مرتکب ہورہے ہیں،برے کام کررہے ہیں تو ان سے مخالفت کے طور پر ان کی شخصیت سے نہیں بلکہ ان کے برے کام کی مخالفت کے طور پر اور اس غرض سے کہ آپ اسے یا انہیں برے کام سے روکیں ان سے بے اعتنائی برتتے ہیں،ان سے دوری اختیار کرتے ہیں یعنی ان سے قطع تعلق کرلیتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک شخص آپ کا رفیق اور دوست ہے، آپ کے اس کے ساتھ بہت گہرے تعلقات ہیں، ایک دوسرے کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہیں، آپ کے باہمی تعلقات دوستانہ ہیں۔ ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے ہیں، گرم جوشی سے ملتے ہیں سفر میں ساتھ ساتھ جاتے ہیں ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے ہیں۔ ایک وقت آپ کو یہ خبر ملتی ہے کہ آپ کا یہی ساتھی اور دلی دوست فلاں برا کام کر بیٹھا ہے، فلاں برا کام کرتا ہے، فلاں گناہ کا مرتکب ہوا ہے، فلاں قطعی اور مسلم گناہ کو انجام دیتا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک درجہ درحقیقت ایک قسم کی تنبیہ جو کئی موارد میں کی جا سکتی ہے یہ ہے کہ آپ اسے اپنی سرد مہری دکھائیے لاتعلقی کا اظہار کریں اور گذشتہ کے دوستانہ سلوک کو چھوڑ دیں، یہ خود ایک قسم کی تنبیہ ہے بلاشبہ انسان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معاملے میں منطق سے بھی کام لینا چاہیے، اس کا عمل منطق کے لحاظ سے درست ہونا چاہیے یہ ایسے موقع پر ہے کہ اگر آپ اس شخص سے تعلق ختم کر لیتے ہیں۔ جس سے آپ دلی دوستی رکھتے تھے، اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں تو آپ کا یہ عمل اس کے لئے تنبیہ ہوگا اور تنبیہ ہی سمجھا جائے گا یعنی ایک قسم کی جھڑکی اور ذہنی سزا شمار ہوگا اور آپ کا یہ عمل اسے برے کام سے روکنے میں ضرور اثر انداز ہوگا ورنہ ایسے موقعے بھی ہوتے ہیں کہ کوئی شخص، آپ کا بیٹا، آپ کا دوست، کوئی جوان کسی بری عادت میں مبتلا ہو گیا ہے اور آپ کے اس سے تعلقات پہلے سے معمول کے مطابق چلے آرہے ہیں۔ اب جو آپ اس تعلق کو ختم کر لیتے ہیں تو وہ اس کا خیر مقدم کرتا ہے تاکہ وہ بھی آپ سے قطع تعلق کرے اور زیادہ آزادی سے منکرات اور برے افعال کے پیچھے دوڑنے لگے۔ اس موقع پر آپ کا اس سے قطع تعلق نہ صرف تنبیہی اثر نہیں رکھے گا بلکہ اس کے شوق اور رغبت میں اضافہ بھی کر دے گا یعنی آپ اسے اس کے عمل میں آزاد چھوڑ دیں گے اور عملی طور پر اسے اس کے کام کا شوق اور رغبت دلائیں گے۔ ایسے موقعوں پر آپ کا یہ عمل درست نہیں ہوگا۔

پس علماء جو یہ کہتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک درجہ بے اعتنائی اور قطع تعلق ہے تو اس غرض سے کہ آپ کے عمل کا کچھ اثر ہو اور اثر بھی دوسرے کو متنبہ کرنا ہے۔ ایک اور قسم کا بھی اعراض اور ہجر ہوتا ہے جو نہی عن المنکر نہیں ہے بلکہ اس کی صورت دوسری ہے آپ کسی خاندان سے ملتے جلتے رہتے ہیں، اس سے دوستی کا اور کبھی کبھی رشتہ داری کا بھی تعلق رکھتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ خاندان بگڑ گیا ہے تو اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو بچانے کی خاطر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی بری عادت آپ کے خاندان میں سرایت کر جائے آپ اس خاندان سے قطع تعلق کر لیتے ہیں کیونکہ بیمار کے ساتھ رہنے سے بیماری لگ جاتی ہے۔ اور لوگ مخفی طور پر ایک دوسرے پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ اس غرض سے کہ ان کی بری عادت اپنے خانوادہ پر اثر انداز نہ ہو ان سے رابطہ منقطع کر لیتے ہیں لیکن اس موقع کی بات دوسرے موقعوں سے جدا ہے۔ پس ایسے موقعوں پر جنہیں انسان خود ہی بہتر طور پہچان سکتا ہے، ان موقعوں پر جب انسان بری عادت میں پھنس گیا ہے اور آپ اس سے اپنی دوستی جاری رکھتے ہیں تو اسے برائی کی مزید رغبت ہوتی ہے اور اگر آپ اس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں تو اس کے ذہن پر چوٹ پڑتی ہے اور اسے تنبیہ ہو جاتی ہے، آپ پر بالکل واجب ہے کہ اس شخص سے ترک تعلق کر دیں اور اس سے سرد مہری برتیں، یہ ایک درجہ ہے۔

دوسرا مرحلہ: زبان سے روکنا

علماء اور دانشمندوں کے بیان کے مطابق نہی عن المنکر کا دوسرا درجہ، زبان کا مرحلہ ہے۔ پند و نصیحت کا مرحلہ ہے یعنی اکثر ایسا بھی بیمار ہوتا ہے جو منکر سے دو چار ہے اور برا کام کرتا ہے۔ اس کا سبب اس کی جہالت اور نادانی ہے۔ وہ ایک تبلیغ کا شکار ہے، اسے مربی کی ضرورت ہے، ہادی رہنما اور معلم کی ضرورت ہے ایک سمجھانے والے کی ضرورت ہے، ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس سے ملے جلے اس سے کمال مہربانی کرے تا کہ وہ واقف ہو اور پلٹ جائے۔ یہ مرحلہ بھی نہی عن المنکر کا ایک درجہ ہے اس کے سامنے کھول کھول کر بیان کرے تا کہ وہ واقف ہو اور پلٹ جائے۔ یہ مرحلہ بھی نہی عن المنکر کا ایک درجہ ہے اس لحاظ سے کہ ایسے معاملوں میں جن میں کوئی شخص ہم سے میل جول رکھتا ہے لیکن وہ ایک برے کام میں پھنسا ہوا ہے اور ہم واضح دلیل اور منطق سے اس کو اس عمل کے ترک کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں تو ہم پر واجب ہے کہ ہم اسی منطق کی مدد سے اس شخص سے تعلق قائم رکھیں۔

تیسرا مرحلہ: عمل کا مرحلہ

تیسرا مرحلہ عمل کا مرحلہ ہے، کبھی کبھی ایک شخص اس درجے اور اس حال میں ہوتا ہے کہ نہ ہمارا اعتراض اور لاتعلقی اس پر اثر کرتی ہے اور نہ ہم منطق، بیان اور سمجھانے بجھانے سے اس کو منکر سے روک سکتے ہیں تو اس صورت میں ہمیں عمل کرنا چاہیے اگر ہم عمل کریں تو شاید کچھ کر سکتے ہیں۔ کس طرح عمل کریں؟ عمل کرنے کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں، عمل کرنے کے معنی صرف زور زور سے بولنا نہیں ہیں۔ ڈنڈے برسانا اور زخمی کرنا نہیں ہیں۔ بیشک میں یہ نہیں کہتا کہ عملی تنبیہ کبھی بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں! ایسے بھی مواقع ہوتے ہیں جب عملی تنبیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام ایسا دین ہے جو حد کا قائل ہے، سزا کا حامی ہے یعنی ایک ایسا دین ہے جس کا یہ اعتقاد ہے کہ ایسے مراحل اور مواقع بھی آجاتے ہیں جب مجرم پر عملی تنبیہ کے سوا کوئی دوسری تنبیہ اثر نہیں کرتی اور اسے برے کام سے نہیں روکتی۔

حضرت علیؑ پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں یوں بیان فرماتے ہیں: "طَبِيبٌ دَوَّارٌ بِطِبِّهِ قَدْ أَحْكَمَ مَرَاهِمَهُ وَ أَحْمَى مَوَاسِمَه" (شرح نہج البلاغہ، ج ۷، ص ۱۸۳) وہ ایک طبیب تھے، ایسے طبیب تھے جو بیماروں اور بیماریوں کا علاج کرتے تھے۔ پھر اطباء کے اعمال کو تشبیہ دیتے ہیں کہ اطباء بھی مرہم لگاتے ہیں اور جراحی بھی کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی زخم داغتے بھی ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ پیغمبرؐ دوہرا کام کرتے تھے: طبیب بھی تھے، مرہم لگانے والے بھی اور چیرا لگانے اور زخم داغنے والے بھی۔ مقصد یہ ہے کہ پیغمبرؐ دونوں کام کرتے تھے، پیغمبرؐ کا ایک کام شفقت اور مہربانی تھا۔ پہلے "أَحْكَمَ مَرَاهِمَهُ" کا ذکر فرماتے ہیں یعنی پیغمبرؐ کا پہلا کام ہمیشہ لطف و مہربانی تھا آپ لطف و مہربانی سے علاج کرتے تھے۔ منکرات اور خرابیوں کے خلاف لڑتے تھے اور اگر ایسا مرحلہ آجاتا تھا کہ لطف، مہربانی، احسان اور نیکی کا مزید فائدہ نہیں ہوتا تھا تو انہیں ان کے حال پر نہیں چھوڑتے تھے پھر یہ وقت ہوتا تھا کہ جب آپ

 آپریشن اور جراحی کی نوبت آتی تو زخم کو گہرا داغتے تھے اور قاطع جراحی کرتے تھے۔سعدی بھی ایسا ہی کہتے ہیں لیکن مہربانی کے حق کو مقدم مانے بغیر کہتے ہیں:

درشتی وزمی بہم در بہ است چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

وہ کہتے ہیں کہ سختی بھی ہونی چاہیے اور نرمی بھی،جس طرح جراح جو نشتر بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اقسام

اب امر بالمعروف کیسے ہو؟ یہ کس شکل اور کس صورت سے انجام پاسکتا ہے؟ امر بالمعروف کی بھی بالکل یہی قسمیں ہیں بس اتنا سا فرق ہے کہ امر بالمعروف لفظی ہوتا ہے یا عملی ۔لفظی امر بالمعروف اس طرح ہوتا ہے کہ انسان لوگوں سے حقائق بیان کرے، لوگوں کے سامنے خوبیوں کی تشریح کرے لوگوں کو شوق دلائے اور انہیں سمجھائے،آج نیک کام کون سا ہے؟ عملی امر بالمعروف یہ ہے کہ انسان صرف یہ کہنے پر ہی قناعت نہ کرے،صرف کہنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے آج کے معاشرے کی ایک بیماری یہ ہے کہ ہم کہنے کی اہمیت اور قدر و قیمت کے ضرورت سے زیادہ قائل ہیں ۔اس میں شک نہیں کہ کہنے کی بھی اہمیت ہوتی ہے میں کہنے کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا جب تک نہیں کہا جائے گا بات واضح نہیں کی جاسکے گی،حقائق کی تحریر اور تشریح نہیں ہوسکتی کوئی کام نہیں ہوسکتا۔میں جو یہ کہتا ہوں کہ ہم زیادہ اہمیت کے قائل ہیں،اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہم ہر بات کو صرف گفتگو سے درست کرنا چاہتے ہیں ۔ان لوگوں کی طرح جو ورد سے ہر شے کو درست کرنا چاہتے ہیں،ورد کریں تو زمین آسمان اور آسمان زمین بن جائے،ہم صرف لفظ اور بیان کی قوت سے کام کرنا چاہتے ہیں حالانکہ بات اس طرح نہیں بنتی۔

کہنا،ایک لازمی شرط تو ہے لیکن یہی کافی نہیں ہے،عمل بھی کرنا چاہیے۔لفظی امر بالمعروف اور عملی امر بالمعروف میں سے ہر ایک کی دو دو راہیں ہیں،ایک مستقیم اور دوسرا غیر مستقیم۔آپ جس وقت امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنا چاہتے ہیں براہ راست کرتے ہیں،آپ سیدھے سیدھے بات کہتے ہیں یعنی اگر آپ کسی کو کام کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ کام کردیں لیکن کسی وقت آپ اسے بالواسطہ بھی سمجھاتے ہیں جو زیادہ کارگر اور زیادہ مفید ہوتا ہے یعنی بغیر اس کے کہ کوئی یہ سمجھے کے آپ کی گفتگو کا اصلی مخاطب وہی ہے آپ کسی ایسے شخص کی تعریف کرتے ہیں جس نے فلاں کام کیا ہے اس کام کی توجیہ اور تشریح کرتے ہیں کہتے ہیں فلاں شخص نے فلاں موقع پر ایسا عمل کیا ہے،یہ طریقہ برتا ہے وغیرہ وغیرہ تاکہ وہ جان لے اور سمجھ لے۔اس سے اس پر بہت اثر ہوتا ہے گویا عمل بالواسطہ طور پر بھی زیادہ موثر ہے۔اب میں بالواسطہ طریقے کے متعلق آپ کے سامنے ایک مشہور واقعہ بیان کرتا ہوں دیکھئے یہ طریقہ کتنا موثر اور کارگر ہے:

حضرات حسنینؑ (امام حسنؑ اور امام حسینؑ) جب دونوں بچپنے میں تھے ایک بوڑھے شخص سے ملتے ہیں جو وضو کر رہا تھا انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا وضو صحیح نہیں ہے۔یہ دونوں صاحب زادے اسلامی طرز تبلیغ اور نفسیات کے اصولوں سے واقف تھے۔فوراً

آمادہ ہو گئے کہ ایک طرف تو بوڑھے کو بتا دیں کہ تیرا وضو باطل ہے لیکن دوسری طرف اگر اس سے براہ راست کہتے ہیں کہ جناب آپ کا وضو باطل ہے تو اس کی شخصیت مجروح ہو جائے گی اور وہ ناراض ہو جائے گا۔اس کا پہلا ردعمل یہ ہوتا کہ وہ کہتا نہیں !اسی طرح درست ہے، چاہے جو کچھ بھی کہیں وہ اس پر کان نہیں دھرتا۔اس لئے دونوں ان کے سامنے گئے اور کہنے لگے: ہم دونوں آپ کے سامنے وضو کرنا چاہتے ہیں۔آپ یہ دیکھئے کہ ہم میں سے کون صحیح وضو کرتا ہے (عملاً بوڑھا آدمی بچوں کی بات مان لیتا ہے) وہ کہتا ہے وضو کرو تا کہ میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں۔امام حسنؑ نے ان کے سامنے پورا وضو کیا،ان کے بعد امام حسینؑ نے بھی کیا۔آخر میں بوڑھے کو خیال آیا کہ خود اس کا وضو درست نہیں تھا،وہ بعد میں کہنے لگا آپ دونوں کا وضو درست ہے،میرا ہی وضو غلط تھا۔اس طرح وہ اس شخص سے منوا لیتے ہیں۔اب اگر اس وقت فوراً کہہ دیتے بوڑھے! تجھے شرم نہیں آتی اس سفید داڑھی پر بھی تجھے وضو کرنا نہیں آتا؟ خدا تجھے موت دے۔تو وہ نماز پڑھنا بھی چھوڑ دیتا۔

اگر آپ بالواسطہ طور پر امر بالمعروف کرنا چاہیں تو اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ خود نیک اور پرہیزگار ہوں،خود اہل عمل اور اہل تقویٰ ہوں۔جب آپ خود ایسے ہوں گے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مجسمہ بن جائیں گے۔انسان پر عمل سے زیادہ کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ انبیاء اور اولیاء کی زیادہ پیروی کرتے ہیں اور دانشمندوں اور فلسفیوں کی اتنی پیروی نہیں کرتے۔کیوں؟ اس لئے کہ فلسفی صرف باتیں کرتے ہیں،صرف پڑھاتے ہیں،صرف نظریہ پیش کرتے ہیں لیکن اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں کتاب لکھتے ہیں اور لوگوں کو دے دیتے ہیں اور انبیاء اور اولیاء صرف نظریہ اور خیال ہی نہیں رکھتے عمل بھی کرتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں پہلے اس پر عمل کرتے ہیں،یہ بھی نہیں ہوتا کہ پہلے کہیں پھر عمل کریں بلکہ پہلے عمل کرتے ہیں پھر کہتے ہیں۔جس وقت انسان نے عمل کرنے کے بعد کچھ کہا تو اس کے کہے ہوئے کا اثر کئی گناہ زیادہ ہو جاتا ہے۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں (اور تاریخ بھی گواہی دیتی ہے کہ ایسا ہی ہے): "ما امرتكم بشيء الا وقد سبقتكم بالعمل به ولا نهيتكم عن شيء الا وقد سبقتكم بالنهي عنه" تم نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا کہ میں نے خود عمل کرنے سے پہلے تمہیں کسی بات کا حکم دیا ہو،جب تک میں پہلے خود عمل نہیں کر لیتا تم سے نہیں کہتا اور میں تمہیں کسی بات سے اس وقت تک منع نہیں کرتا جب تک پہلے میں نے اسے ترک نہ کر دیا ہو چونکہ میں خود نہیں کرتا اس لئے تمہیں بھی منع کرتا ہوں۔

"کونوا دعاة للناس بغير السنتكم" لوگوں کو دین کی طرف بلاؤ لیکن زبان سے نہیں غیر زبان سے بلاؤ یعنی اپنے عمل سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو! جس وقت انسان خود عمل کرتا ہے تو اس کا عمل اپنے آپ معاشرہ پر اپنا اثر ڈالنے لگتا ہے۔مشہور فلسفی جان پال سارٹر کا قول ہے،گویا اس کے قول میں کوئی ندرت نہیں ہے لیکن اس کی اس تشریح میں نیا پن ہے جو وہ کرتا ہے،وہ کہتا ہے میں جو کام کرتا ہوں ایک طرح سے میں اپنے معاشرہ کو اس سے وابستہ کر دیتا ہوں اور یہ بات سچ بھی ہے،آپ اچھا یا برا جو کام کرتے ہیں اپنے معاشرہ کو اس کام سے وابستہ کر دیتے ہیں۔لامحالہ آپ کا کام ایک لہر پیدا کر دیتا ہے،معاشرہ کے لئے بھی یعنی ہر کام ایک طرح سے معاشرے کے لئے ایک حکم ہوتا ہے کہ تو بھی ایسا کر! جس وقت میں کوئی کام کرتا ہوں تو میرے عمل کی

زبان یہ ہوتی ہے کہ دوست! تو بھی میری ہی طرح ہو جا! میں خواہ کتنا ہی کہوں کہ میری طرح نہ بنو ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں چاہے جتنا آپ سے کہوں کہ میرے کہے پر عمل کیجئے لیکن میرے کردار یعنی عمل سے تعلق یا سروکار نہ رکھئے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ سے یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ میرے قول پر دھیان دیں اور میرے کردار پر توجہ نہ کریں۔ آپ کے لئے جو ذمہ داری پیدا کرنے والی چیز ہے وہ پہلے نمبر پر میرا عمل ہے دوسرے نمبر پر میرا قول ہے۔

ہر اصلاح کرنے والے کو پہلے نیک ہونا چاہیے تاکہ وہ اصلاح کر سکے، وہ آگے آگے چلے اور دوسروں سے کہے کہ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ ان دو شخصوں میں بہت فرق ہے جن میں سے ایک کھڑا ہوا ہے اور اپنے سپاہی کو حکم دیتا ہے کہ آگے بڑھ میں یہاں کھڑا ہوا ہوں اور دوسرا جو خود آگے آگے چلتا ہے اور کہتا ہے میں چلا، تم بھی میرے پیچھے پیچھے آؤ!

انبیاء اور اولیاء کے مکتب میں ہم ان لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ یہ ہمیشہ کہتے ہیں: "ہم چلے" حضرت علیؑ کہتے ہیں میں پہلے چلتا ہوں بعد میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ میرے پیچھے پیچھے آؤ!

پیغمبر اکرمؐ جس بات کا حکم دیتے تھے اگر پہلے اس میں خود قدم نہ بڑھاتے تو دوسروں کا پیروی کرنا ناممکن تھا، جب وہ نماز اور نماز شب کی بات کرتے تھے تو خود دوسروں سے زیادہ عبادت کرتے تھے "إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ" (آپ کا پروردگار جانتا ہے کہ آپ ایک تہائی رات (تہجد کے لیے) کھڑے رہتے ہیں) (مزمل:۲۰)

اگر خدا کی راہ میں خیرات اور ایثار کیلئے کہتے تھے تو سب سے پہلے ایثار اور انفاق کرنے والے خود ہی تو تھے یعنی سب سے پہلے اپنے آپ سے وصول کرتے تھے اور دوسروں کو دیتے تھے، اگر کہتے تھے جہاد فی سبیل اللہ تو لڑائیوں میں خود آگے چلتے تھے، اپنے عزیزوں کو آگے لے جاتے تھے اور پھر دوسرے لا محالہ محبت کرنے لگتے تھے، عاشق ہو جاتے تھے کہ یہ شخص اپنے مقصد کی راہ میں اپنے سب سے زیادہ پیارے رشتہ داروں کو موت کے منہ میں بھیج دیتا ہے، سب سے پہلے خود ہتھیار لگا کر دشمن کی فوج میں گھس پڑتا ہے، خود دوار سہتا ہے، اپنے دانت تڑوا لیتا ہے، اپنی پیشانی زخمی کروا لیتا ہے۔ اس وقت وہ لوگ ایسے شخص کی ذات میں حقیقت کا نظارہ کرتے تھے۔

پیغمبر اکرمؐ کو حضرت علیؑ سے زیادہ کون پیارا تھا؟ سید الشہداء حضرت حمزہؓ سے زیادہ عزیز کون تھا؟ آپؐ نے جنگ بدر میں سب سے پہلے کن لوگوں کو میدان میں بھیجا؟ حضرت علیؑ کو بھیجا جو آپ کے داماد اور چچیرے بھائی تھے اور چونکہ حضرت علیؑ بچپن سے پیغمبرؐ کے گھر میں پلے بڑھے تھے اور پیغمبرؐ کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لئے حضرت علیؑ حقیقت میں پیغمبرؐ کے بیٹے کی جگہ تھے۔ آپؐ نے اپنے چچا حضرت حمزہؓ کو بھیجا جن کی آپ بہت عزت کرتے تھے، اپنے چچیرے بھائی جناب ابوعبیدہ بن حارث کو بھیجا جو آپ کو بہت عزیز تھے۔

امام حسینؑ نے کتنے خطاب کئے اور کتنا عمل کیا ان کے خطبات کتنے کم اور ان کے اعمال کتنے زیادہ تھے۔ جب عمل کا وقت ہوتا ہے تو گفتگو کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔ امام حسینؑ اپنی تقریر میں فریاد کرتے ہیں:

(اللھوف علیٰ قتلی الطفوف ،ص ۱۶۱) جوشخص اپنا خون دل ہماری خاطر بہانا چاہتا ہے اور جس نے خدا کی ملاقات کا ارادہ کرلیا ہے ایسا شخص ہمارے ساتھ سفر کرسکتا ہے (وہ واپس چلا جائے جو ملک کی ہوس میں آیا ہے) جو جان دینے پر آمادہ نہیں ہے وہ ہمارے ساتھ نہ آئے۔ ہمارا قافلہ جانبازوں (جان دینے والوں) کا قافلہ ہے ان جان قربان کرنے والوں میں سب سے محترم ہستی امام حسینؑ کی ہے۔ اگر امام حسینؑ اپنے عزیزوں کو مدینہ میں چھوڑ دیتے تو کیا کوئی ان پر اعتراض کرسکتا تھا؟ ہرگز نہیں! لیکن وہ اپنے عزیزوں کو کربلا کے منظر میں نہ لاتے اور خود اکیلے شہید ہوجاتے تو کیا جو منزلت انہیں آج حاصل ہوئی وہ حاصل ہوجاتی؟ ہرگز نہیں! امام حسینؑ نے ایسا کام کیا کہ خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا یعنی اپنے عمل کو انتہائی بلندی پر پہنچا دیا یعنی کوئی چیز نہیں چھوڑی جو خدا کی خاطر نہ لٹادی ہو۔ ان کے رشتہ دار بھی ایسے لوگ نہیں تھے، جنہیں امام حسینؑ زبردستی لائے ہوں، وہ ان کا ساعقیدہ، ان کا سا ایمان اور انہیں کی سی سوچ رکھتے تھے۔ بنیادی طور پر امام حسینؑ ایسے شخص نہیں تھے جن کے وجود میں یا جن کے ساتھیوں میں ذرا سی بھی کمزوری ہوتی، اس لئے انہوں نے راہ میں دو تین بار چھان پھٹک کی۔ پہلے دن جب مکہ سے سفر کرتے ہیں اعلان کردیتے ہیں کہ جو جانباز نہ ہو وہ نہ آئے لیکن بعض لوگ ابھی تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید امام حسینؑ کے جانے کی کوفہ والوں کو خبر ہوجائے اور وہاں آپ کا خیر مقدم ہوجائے، پذیرائی ہوجائے ہم پیچھے نہیں رہتے، امامؑ کے ساتھ ہی چلتے ہیں، ساتھ آتے ہیں راستے میں کچھ عرب صحرانشین بھی امام حسینؑ کے ساتھ ہوجاتے ہیں۔

امامؑ راستے میں تقریر کرتے ہیں۔ اے لوگو! جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہم کوئی مقام حاصل کررہے ہیں، کسی مقام و منصب تک پہنچ رہے ہیں، ایسا نہیں ہے وہ واپس چلا جائے چنانچہ کچھ لوگ واپس بھی چلے گئے، آپ نے آخری چھان پھٹک عاشور کی شب کی لیکن عاشور کی رات کو امام حسینؑ کے اصحاب میں سے کوئی شخص بھی نہیں گیا بلکہ انہوں نے یہ ثابت کردیا کہ ہم میں کوئی کھوٹ یا کمزوری رکھنے والا شخص موجود نہیں ہے۔

اگر عاشور کے دن امام حسینؑ کا کوئی ایک صحابی یہاں تک کہ بچہ بھی کمزوری دکھا دیتا، دشمن کے لشکر میں جو زیادہ قوی اور طاقتور تھا جاملتا اور اپنے آپ کو خطرے سے بچا کر دشمنوں کی پناہ میں چلا جاتا تو امام حسینؑ اور ان کے مکتب کا ایک نقص ہوتا بلکہ اس کے برعکس خود دشمن امام حسینؑ کی طرف آگئے۔ یہ اپنے ان دشمنوں کو اپنی طرف لے آئے جو محفوظ تھے اور انہیں خطرے کی جگہ اور مرکز میں لا بٹھایا یعنی وہ لوگ خود ہی آگئے لیکن ان میں سے ایک بھی خطرے کے اس مقام سے اس محفوظ مقام کی طرف نہیں گیا۔ اگر امام حسینؑ نے پہلے سے وہ چھان پھٹک اور خطرے کا اعلان نہ کیا ہوتا تو ایسے بہت سے حادثے پیش آجاتے، آپ کسی وقت دیکھتے کہ آدھی جماعت چلی گئی اور پھر وہ نعوذ باللہ امام حسینؑ کے خلاف پروپیگنڈا کرتی کیونکہ جو کوئی چلا جاتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ میرا ایمان کمزور ہے یا میں ڈرتا تھا بلکہ اپنے عمل کی کوئی نہ کوئی توجیہ تلاش کرلیتا ہے، جھوٹ بولتا ہے اور پھر دعویٰ کرنے لگتا ہے کہ ہماری تشخیص کے مطابق راہ حق یہی ہے، خدا کی خوشنودی اس میں ہے، ہم یہی کام کررہے تھے، ہم نے تحقیق کرلی تھی کہ حق

اسی طرف ہے، وہ مجبوراًا پنے حق میں منطق اور دلیل تیار کرتا ہےلیکن ایسا نہیں ہوااور یہ بھی ایک بہت بڑاافتخار امام حسینؑ اور حسینی مکتب کا ہے کہ حریف کے ایک بزرگ ترین سردار کو اپنی طرف لے آئے ایسا شخص جو بنیادی طور پر امیر کے منصب کے لئے نامزد تھا جناب حر بن یزید ریاحی وہ کوئی چھوٹے موٹے آدمی نہیں تھے اگر حساب لگاتے تو عمر ابن سعد کے بعد اس لشکر کی دوسری شخصیت کون سی ہے؟ جناب حر بن یزید ریاحی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، یہ ایک بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے۔اس کے علاوہ پہلے شخص تھے جو ایک ہزار سواروں کے ساتھ اس کام پر تعینات کئے گئے تھے۔لیکن امام حسینؑ کی قوت جاذبہ، ایمان، عمل اور عملی امر بالمعروف نے جناب حر بن یزید کو جس نے پہلے امامؑ کے سامنے تلوار کھینچی تھی اطاعت پر مجبور کر دیا۔انہوں نے توبہ کی التائبون کا جزو بن گئے۔

(از کتاب: حماسہ حسینی (شہید مرتضیٰ مطہریؒ)

حزب اللہ لبنان

ابتدائیہ:

فرانس سے آزادی پانے کے بعد 1943ء میں لبنان ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا۔اس زمانے میں مارونی (ایک عیسائی فرقہ) اور اہل سنت مسلمان دو بڑے گروہ تھے جو اس ملک کی سیاست میں اہم رول ادا کرتے تھے۔1960ء کی دہائی تک دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں شیعہ مسلمان کسی مرکزی قیادت سے محروم تھے۔خاص طور پر شیعہ جوانوں کی سیاسی اور مذہبی تحریکوں میں شمولیت بہت نچلی سطح پر تھی۔ایسی حالت میں جب 1959ء میں آیت اللہ العظمیٰ سید عبد الحسین شرف الدین کی وفات کے بعد سید موسیٰ صدر منظر عام پر آئے تو لبنان کے شیعہ مسلمانوں کے حالات ایک نئے دور میں داخل ہو گئے۔امام موسیٰ صدر کا مقصد لبنان کی حالت کو بہتر بنانا،عوام کو اسرائیل کے خلاف متحد کرنا اور اس کے مقابلے کیلئے آمادہ کرنا تھا۔اسرائیل کے خلاف ان کی کہی ہوئی بات "اسرائیل شرِ مطلق ہے" اسرائیل کے خلاف ان کے موقف کی صحیح ترجمانی تھی۔

1971ء کی دہائی میں امام موسیٰ صدر کی توجہ جنوبی لبنان کی طرف مبذول ہوگئی۔انہوں نے اس وقت کی حکومت پر زور دیا کہ جنوبی لبنان کی ابتر حالت کو بہتر بنایا جائے اور خود اپنے دن رات اس پر صرف کیے۔فلاح و بہبود کے علاوہ آپ نے جنوب کے لوگوں کی عزت و ناموس اور جانوں کے دفاع کیلئے بہت کام کیا۔اس لیے 1975ء میں انہوں نے ایک نیم فوجی گروہ بنام "افواج المقاومۃ اللبنانیہ" (امل) تشکیل دیا۔

امام موسیٰ صدر 25 اگست 1978ء کو لیبیا کے دورے پر گئے اور ان کا پروگرام یہ تھا کہ کچھ دن لیبیا میں قیام کے بعد وہ اٹلی روانہ ہونگے لیکن وہ اٹلی نہیں پہنچے بلکہ اغوا کر لیے گئے۔لیبیا کا کہنا ہے کہ اس نے امام موسیٰ صدر کو اٹلی کے جہاز پر سوار کیا ہے لیکن اٹلی کی حکومت کا کہنا ہے کہ وہ اٹلی داخل ہی نہیں ہوئے۔معمر قذافی کی خیانت یا پھر اسرائیل کی کارروائی کی بنا پر مسلمانوں

نے اپنا عظیم رہبر کھو دیا اور وقتی طور پر لبنان میں رہبریت کا فقدان پیدا ہو گیا۔

1982ء اور اسرائیل کا لبنان پر وحشیانہ حملہ:

6 جون 1982ء کو اسرائیلی فوج نے لبنان پر ایک بہت وسیع حملہ کیا۔ یہ حملہ، بری، بحری اور ہوائی تھا۔ اسرائیلی فوج تیز رفتاری اور بغیر کسی مزاحمت کے دروازہ بیروت تک بڑھتی چلی گئی۔ اسرائیل کے اس حملے کا مقصد اسرائیلی ترجمان کے مطابق لبنان میں موجود فلسطینی جنگجوؤں کو لبنان سے نکالنا تھا لیکن درحقیقت اسرائیل کا اصل مقصد لبنان میں ایسے عیسائی صدر کو کرسی پر بٹھانا تھا کہ جو اسرائیل کا حامی ہو اور شام کی فوجی اور سیاسی بالادستی کا قلع قمع کرے۔ اس حملہ کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ لبنان وہ دوسرا ملک ہے جو اسرائیل کے ساتھ صلح کی قرارداد پر دستخط کرے۔ لبنان میں موجود فلسطینی فورس PLO موومنٹ کی عدم مداخلت کی وجہ سے اسلام پسند تنظیمیں بھی جنوبی لبنان میں بے بس ہو گئیں اور اسرائیل کے خلاف کارروائی نہ کر سکیں۔

لبنانی سیاست میں ایران کا کردار:

1983ء کو تہران میں عالم اسلام کی آزادی کی تحریکوں کے عنوان سے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں دنیا بھر کے مندوبین کے ساتھ ساتھ لبنان سے علامہ سید محمد حسین فضل اللہ، شیخ راغب حرب اور شیخ صبحی طفیلی نے بھی شرکت کی۔ ابھی یہ کانفرنس جاری ہی تھی کہ اسرائیل نے لبنان پر اپنے حملے شروع کر دیئے اور ان حملوں نے کانفرنس کو بری طرح متاثر بھی کیا۔ لبنانی وفد کی درخواست اور شام کے ساتھ ایک معاہدے کی نتیجے میں انقلاب اسلامی کی محافظ فوج (سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی) کا ایک دستہ بنام محمد رسول اللہؐ دمشق جا پہنچا۔ ان کی دمشق آمد سے اہل دمشق اور اطراف کے چھوٹے بڑے شہروں کے مسلمانوں میں بیت المقدس اور لبنانی بھائیوں کی محبت جاگ اُٹھی اور وہ اسرائیل سے شام کی براہ راست جنگ کیلئے حکومت شام پر دباؤ ڈالنے لگے۔

انقلاب اسلامی کی محافظ فوج کا پہلا یونٹ اپنے 800 جوانوں کے ساتھ شام، لبنان کے سرحدی شہر "زبدانی" سے کوچ کر کے لبنان کے شہر بعلبک میں مقیم ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک دوسرا یونٹ اپنے 700 جوانوں کے ساتھ اس پہلے یونٹ سے جا ملا اور پھر یہ افراد بعلبک کے علاوہ ہرمل اور دوسرے بڑے شہروں اور دیہاتوں میں تقسیم ہو گئے۔ بقاع شہر میں فوج کے ان دستوں میں عام سپاہیوں کے ساتھ ساتھ علمائے کرام اور مبلغین بھی تھے جو لوگوں کو جنگی اسرار و رموز سے آگاہی کے ساتھ ساتھ دینی تعلیمات سے بھی آشنا کرتے تھے۔

ایرانی افواج کی آمد سے پہلے لبنانی عوام کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ ایرانی دستوں نے بعلبک میں جس پہلے دستے کی ٹریننگ شروع کی وہ کل 180 افراد تھے، ان میں حزب اللہ کے شہید قائد جناب علامہ سید عباس موسوی بھی تھے، یہ تمام ٹریننگ انتہائی خفیہ طور پر دی گئی تھی۔

ایرانی افواج کی آمد کے 6 ماہ بعد ہی ان علاقوں میں کالی چادروں والی خواتین میں اضافہ ہونے لگا۔امام خمینیؒ کی مختلف تصاویر شہروں اور دیہاتوں کے گلی کوچوں میں لبنانی شہداء کے رہبر کے طور پر نمایاں نظر آنے لگیں اور یہاں تک کہ انقلاب اسلامی ایران کے حق میں نعرے در و دیوار پر بکثرت نظر آنے لگے اور سب سے اہم نعرہ "اسرائیل مردہ باد" تھا۔

لبنان کمیٹی:

بعلبک میں اسلام کے حامی گروہ ایک دوسرے کے قدرے نزدیک آگئے تھے کیونکہ جو چیز ان میں مشترک تھی وہ نظریہ ولایت فقیہ اور امام خمینیؒ کی پیروی اور اسرائیل کے ساتھ جنگ تھی۔ان تمام گروہوں کے درمیان مذاکرات میں نو افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔اس کمیٹی کی بنیاد بھی ولایت فقیہ کی پابندی اور اسرائیل سے جنگ تھی۔یہ کمیٹی بغیر کسی نام کے اور بغیر کسی اعلان کے اپنے کاموں کو انجام دیتی تھی۔

لبنان میں حزب اللہ:

لبنان کمیٹی کی اسرائیل کے خلاف کوششوں کو تیز تر کرنے کے ساتھ ساتھ لبنان میں رائج نعروں میں حزب اللہ کا نام بخوبی سنا جانے لگا اور بالآخر مئی 1984ء میں کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اپنی اس کمیٹی کو حزب اللہ انقلاب اسلامی کا نام دیا جائے اور اپنے بیانات بھی اسی نام سے جاری کئے جائیں۔حزب اللہ نے اسرائیلی قبضے کے خلاف مزاحمت چھوٹے چھوٹے دیہاتوں سے شروع کی۔ اس مرتبہ حزب اللہ کا سب سے اہم کارنامہ اسرائیلی فوج کا شہر صور کا ہیڈ کوارٹر اڑانا تھا۔ایک نوجوان احمد قصیر ایک گاڑی جس میں کئی سو کلو گرام دھماکہ خیز مادہ نصب کیا گیا تھا لے کر اس ہیڈ کوارٹر میں جا گھسا اور یوں پوری فوجی چھاؤنی خاک کا ڈھیر ہوگئی،اس آپریشن میں 76 اسرائیلی افسران اور فوجی مارے گئے۔

حزب اللہ کی طرف سے دشمن پر براہ راست حملے،اس کے مراکز پر عارضی طور پر قبضہ،اس کے فوجیوں کو ہلاک کرنا اور پھر ان مراکز کو تہس نہس کرکے وہاں سے کوچ کر جانا یہ سب اس بات کا باعث بنا کہ اسرائیلی فوج کا ناقابل شکست ہونے کا جو افسانہ لبنانی نوجوانوں کے ذہنوں میں راسخ ہوگیا تھا وہ پارہ پارہ ہوگیا اور خود اسرائیلی فوج کیلئے بھی یہ براہ راست حملے ذہنی اور جسمانی طور پر زیادہ تکلیف دہ اور وحشت ناک تھے۔

مارچ 1991ء میں علامہ سید عباس موسوی کو حزب اللہ کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا لیکن وہ اس انتخاب کے چند ماہ بعد ہی 17 فروری 1992ء کو جب شہید راغب حرب کی برسی کی تعزیت سے واپس آرہے تھے،اسرائیلی ہیلی کوپٹروں کے حملے میں اپنی اہلیہ اور بچے کے ساتھ شہید ہو گئے۔سید عباس موسوی کی شہادت کے بعد حجۃ الاسلام سید حسن نصر اللہ کو اس کا سیکرٹری جنرل منتخب کر لیا گیا۔

حزب اللہ کے رہبروں کا قتل اور ان کا اغواء:

امریکہ اور اسرائیل حزب اللہ کی ابتداء ہی سے اس کے رہبروں کو قتل کرنے یا اغوا کرنے کی کوششوں میں مصروف عمل تھے تا کہ حزب اللہ کی کارروائیوں کو روکا جاسکے۔ چنانچہ حزب اللہ کے بہت سے رہنماؤں کو شہید کیا گیا جن میں شیخ راغب حرب، سید عباس موسوی، محمد سعد اور خلیل جرادی وغیرہ شامل تھے۔ جولائی 1989ء میں جنوبی لبنان کے ایک اہم عالم دین عبد الکریم عبید جو اپنے علاقے میں حزب اللہ کے عہدیدار بھی تھے کو راتوں رات ان کے گھر سے اغوا کرلیا گیا، اس کے علاوہ مصطفی دیرانی اور دوسرے رہنماؤں کے ساتھ بھی یہی کیا گیا لیکن اس کے باوجود یہ تنظیم ان تمام مشکلات سے بخوبی عہدہ برآ ہوئی۔

حزب اللہ کے عروج کا زمانہ:

1996ء سے 1998ء تک حزب اللہ کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس میں حزب اللہ نے سیاسی اور لبنان کی اندرونی سطح پر بے شمار معرکے سر کیئے اور پھر مزاحمت اسلامی لبنان کے تمام گروہوں اور فرقوں کیلئے ایک نمونے کے طور پہچانی جانے لگی۔ سولہ روزہ جنگ (1996ء) میں آخر کار حزب اللہ کی کامیابی کے چند ماہ بعد دو اسرائیلی ہیلی کاپٹر جو 73 کمانڈوز کو لے کر لبنان میں داخل ہوئے تھے ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ ہو گئے اور تمام افراد مارے گئے۔ چند روز بعد ایک بار پھر اسرائیل کے کمانڈوز لبنان میں داخل ہوئے لیکن ایک بارودی سرنگ سے ٹکرا کر بارہ کمانڈوز ہلاک ہوئے تو اسرائیل کے حکومتی اہلکاروں کے درمیان آپس میں اختلاف ہوا جو زیادہ تر لبنان سے اسرائیلی فوج کے انخلاء کا مطالبہ کر رہے تھے۔

حزب اللہ کے فلاحی ادارے:

حزب اللہ کی اسرائیل کے خلاف کی جانے والی کارروائیوں کے علاوہ اجتماعی، اقتصادی اور ثقافتی میدانوں میں بھی ناقابل بیان خدمات ہیں۔ یہ خدمات انقلاب اسلامی ایران کے پاسداروں کے لبنان آنے کے بعد شروع ہوئی تھیں۔ ان فوجی دستوں نے ایرانی امداد سے یہاں مختلف مراکز مثلاً ہسپتال، کلینک، اسکول اور شاپنگ سنٹرز وغیرہ قائم کیے جو حزب اللہ کی تشکیل کے بعد حزب اللہ کے حوالے کر دیئے گئے۔ پھر حزب اللہ جیسے جیسے مضبوط ہوتی گئی اس نے اسی طرز کے دوسرے مراکز قائم کرنے شروع کر دیئے مثلاً شہداء کے اہل خانہ کی فلاح و بہبود کیلئے ایک مرکز شہید فاؤنڈیشن قائم کیا گیا۔ مفلس اور نادار لوگوں کیلئے ایک کمیٹی، امداد کمیٹی کے نام سے شروع کی گئی، ایک اور تعمیراتی ادارہ جہاد کے نام سے قائم ہوا، جنگ میں مجروح ہونے والوں کیلئے جانباز فاؤنڈیشن شروع کی گئی اور اس طرح کے کئی دوسرے ادارے قائم کیے گئے۔

ایک اور اہم میدان جس میں حزب اللہ کی خدمات بہت واضح ہیں وہ اسکولوں اور پولی ٹیکنیک کالجوں کی تعمیر اور ان کا معیار ہے۔ اس کے علاوہ اسرائیلی حملوں میں تباہ شدہ مکانوں، شاہراہوں اور دوسری عمارتوں کی تعمیر میں بھی حزب اللہ کی خدمات

کا کوئی مقابلہ نہیں۔حزب اللہ اسرائیلی سرحدوں کے نزدیک کے شہروں اور دیہاتوں تک میں تعمیراتی کاموں کا بیڑہ اُٹھائے ہوئے ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ان لوگوں کو بے یارومددگار چھوڑ دیا گیا تو یہ وہ علاقے خالی کر کے پرامن علاقوں میں جانے کو ترجیح دیں گے اور اسرائیل کیلئے دوبارہ قابض ہونے کا اچھا بہانہ ہوگا۔اس کے علاوہ زخمیوں کو ابتدائی طبی امداد پہنچانا اوران کا ہرممکن خیال رکھنا بھی حزب اللہ کے ان کاموں میں سے ہے جس کو ہمیشہ اولیت دی جاتی ہے۔

نفسیاتی جنگ میں کامیابی:

مزاحمت اسلامی کا اپنا ایک طاقتور میڈیا ہے۔اس کی انٹرنیٹ میں دوسائٹس ہیں۔ایک نور ریڈیو اسٹیشن اور ایک المنار ٹیلی ویژن اسٹیشن ہے۔ہفتہ وار رسالے العہد، البلاد وغیرہ ہیں۔اس کے علاوہ حزب اللہ کا ایک ریڈیو اسٹیشن صوت المستضعفین کے نام سے بقاع میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔اس وجہ سے یہ کئی بار اسرائیلی فوج کے حملوں کا نشانہ بن چکا ہے۔مزاحمت اسلامی جب بھی کوئی جہادی کارروائی کرتی ہے ایک مجاہد اس کی فلم بنا رہا ہوتا ہے، کارروائی کی فلم اور تفصیلات فوراً المنار ٹی وی کو دے دی جاتی ہیں جو اپنی خبروں میں اس کو دکھاتے رہتے ہیں۔اس کے علاوہ انٹرنیٹ کی سائٹ بھی یہ تصاویر دنیا بھر میں ارسال کرتے رہتے ہیں۔جو اسرائیلی فوج اور عوام کو نفسیاتی طور پر مفلوج کر دینے کے مترادف ہوتا ہے اور یوں جانی اور مالی نقصانات کے ساتھ ساتھ نفسیاتی طور پر بھی اسرائیل کو شدید اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حزب اللہ کی تاریخی کامیابی:

آخر کار مزاحمت اسلامی کی کارروائیوں سے پریشان ہو کر اسرائیل کابینہ نے 6 مارچ 2000ء کو ایک قرارداد پاس کی جس میں اسرائیلی فوج کی لبنان سے مکمل انخلاء کو فوری طور پر انجام دیئے جانے کو کہا گیا جبکہ ایہود بارک (اسرائیلی وزیراعظم) نے بیان دیا کہ اس کی فوجیں جولائی تک لبنان کو خالی کر دیں گی لیکن اسرائیلی فوجوں نے مقررہ تاریخ سے پہلے ہی بتدریج پسپائی شروع کر دی تا کہ یکدم انخلاء کرنے کی وجہ سے ان کی عزت پر حرف نہ آئے پھر ایک رات بدھ کے دن 25 مئی 2000ء کو اسرائیلی فوجیں لبنان چھوڑ کر فرار ہوگئیں، اس اچانک فرار سے اسرائیلی فوج کو نہایت ذلت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے فرار کی اصل وجہ حزب اللہ کا خوف تھا کہ ایسا نہ ہو کہ پسپائی کے وقت بھی حزب اللہ کوئی کارروائی کرے اور جاتے جاتے ان کو جانی اور مالی نقصان پہنچے۔یوں حزب اللہ کی 18 سالہ جدوجہد اور شہیدوں کا خون رنگ لایا اور خدا پر توکل سے اس قوم نے اس سرزمین کو آزاد کرالیا اور دنیا میں عزت وشرف حاصل کیا۔

رہبر معظم سید علی خامنہ ای نے سید حسن نصر اللہ کو اس تاریخی کامیابی پر مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا" قوموں کی تاریخ میں اٹھارہ سالہ جدوجہد کوئی بڑا عرصہ نہیں لیکن آپ کی اس کامیابی نے یہ ثابت کیا کہ آپ اس سے کہیں بڑا کام بھی انجام دے سکتے ہیں۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ اگر آپ ایک نئی اور منظم اسٹریٹجی کے ساتھ میدان عمل میں اتریں تو اسرائیل کے ناپاک وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتے ہیں اور انشاء اللہ آپ کو اس میں گذشتہ عرصے کی نسبت کم عرصہ لگے گا"۔

حزب اللہ کی کامیابی کے انتفاضہ فلسطین پر اثرات:

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ حزب اللہ کی فتح نے فلسطینی عوام اور خاص طور پر ان کی تحریک انتفاضہ پر جو انمٹ نقوش چھوڑے ہیں وہ آج اس تحریک کے زور پکڑ جانے کی صورت میں دنیا بھر کے سامنے ہیں۔ آج انتفاضہ کی تحریک پوری قوت سے اسرائیل کے مقابلے میں کھڑی ہے۔ فلسطینی عورتیں، بوڑھے، بچے اور جوان اپنی جانوں کی پرواہ کیئے بغیر اپنی مقدس سرزمین کی آزادی کیلئے کوشاں ہیں۔ انہوں نے حزب اللہ کی کارروائیوں اور لبنانی عوام کی اس تحریک کی پشت پناہی سے یہ بات سیکھ لی ہے کہ اگر ایک قوم اپنی تقدیر کا فیصلہ اپنے ہاتھوں میں لے لے تو اس کو اپنی جانوں اور عزت و ناموس سے بالاتر ہو کر عمل کرنا ہوگا لیکن پھر نتیجے میں جو عزت اور شرف اس قوم کیلئے مخصوص ہو جائے گا وہ رہتی دنیا تک ہر قوم کیلئے ایک نمونہ کی حیثیت رکھے گا۔

قابل توجہ بات حزب اللہ کے قائد سید حسن نصر اللہ کا بیان ہے جو فلسطینی عوام کی تحریک انتفاضہ کے دوبارہ نئے عزم کے ساتھ شروع ہونے پر دیا گیا۔ انہوں نے فرمایا "اے فلسطینی جوانو! تم بیت المقدس کی آزادی کیلئے ہر ممکن کوشش جاری رکھو، اسلحے سے ممکن ہو تو اسلحے سے اور اگر نہ ہو سکے تو انہی پتھروں سے کہ جن سے تم اب تک دشمن کو اپنے اوپر غالب آنے سے روکے ہوئے ہو۔ حزب اللہ کا اصل مقصد اسرائیل کو لبنان ہی سے نہیں بلکہ فلسطین سے باہر نکالنا ہے اور ہم جلد ہی اپنی مقدس سرزمین کو دشمنوں سے آزاد کروالیں گے"۔

حزب اللہ کی 33 روزہ جنگ، دنیائے عرب میں بے مثال کامیابی:

33 روزہ جنگ میں صیہونی حکومت اور امریکہ کے مدمقابل حزب اللہ کو جو فتح نصیب ہوئی اس کی عالم اسلام اور دنیائے عرب کے ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ جنگ جولائی 2006ء میں شروع ہوئی اور 33 روز تک جاری رہی اس جنگ میں عوام نے اسلامی مقاومت کی بھرپور حمایت کی اور تمام اسلامی مقاومت کے گروپوں نے باہمی تعاون اور ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔ اور جوانوں کی شجاعت اور استقامت کی بنا پر ہونی والی فتح سے یہ ثابت ہوگیا کہ ایمان اور عقیدہ کا ہتھیار باقی ہتھیاروں سے زیادہ مؤثر ہے۔ اس جنگ میں اسرائیل نے وحشیانہ انداز میں بحری، بری اور ہوائی حملات کیے کہ جس پر عرب اور یورپی دنیا نے چپ سادھے رکھی۔ اسرائیل کے پانچ روزہ سول علاقوں میں حملات کے جواب میں حزب اللہ نے حیفاء کی بندرگاہ کے علاوہ شمالی اسرائیل میں یہودی بستیوں پہ حملہ کیا جس میں اسرائیل کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا ان حملات کے بعد الیہود اولمرٹ (اسرائیلی وزیراعظم) نے ایک ہنگامی میٹنگ بلائی جس میں اس نے کہا کہ اسرائیلیوں کو ایک لمبی جنگ کے لئے تیار ہونا ہوگا۔ اور صیہونی

حکومت کے وزیر خارجہ نے حزب اللہ کی شکست ناپذیری کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ فوجی راہ حل حزب اللہ لبنان کو فلج نہیں کر سکتا۔

آیت اللہ مصباح یزدی 33 روزہ جنگ کے بعد لبنان تشریف لے گئے واپسی پر اپنے سفر کا حال سناتے ہوئے انہوں نے حزب اللہ کے سیکرٹری جنرل حجۃ الا اسلام والمسلمین علامہ سید حسن نصر اللہ سے ایک واقعہ نقل کیا، آپ فرماتے ہیں کہ: "حزب اللہ کا ایک کمانڈر مورچے میں سویا ہوا تھا کہ اس نے خواب میں حضرت زینب (س) کو دیکھا تو اس نے بی بی سے عرض کی کہ بی بی ہم بڑی مشکل میں ہیں ہمارے لئے دعا کیجئے بی بی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ میری مادر گرامی حضرت زہرا (س) کے پاس جائیے کہ آپ کی مشکل ان کی دعا سے حل ہوگی۔" وہ کمانڈر خواب میں حضرت زہرا (س) کی خدمت میں پہنچا اور بی بی سے کہا کہ بی بی ہمارے لئے دعا کیجئے کہ ہم لوگ بہت سختی اور دباؤ میں ہیں اور شکست ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ بی بی نے جواب دیا کہ میں آپ کے لئے دعا کروں گی۔ اس کمانڈر نے دوبارہ خواہش کی کہ بی بی ہمارے لئے کچھ کیجئے۔ یہ کمانڈر کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ بی بی نے ایک رومال نکالا اور اس کو گھمایا اسی اثنا میں میں ایک زوردار دھماکے کی آواز سے خواب سے اٹھ کھڑا ہوا اور جب میں اپنے مورچے سے باہر آیا تو میں نے ایک ہیلی کاپٹر کو گرا ہوا پایا میں ہیلی کاپٹر کو تباہ کرنے والے سپاہی کی طرف گیا اور اس سے پوچھا کہ تم نے کیسے اس ہیلی کاپٹر کو گرایا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے صرف ہیلی کاپٹر کی آواز پر اس جانب فائر کیا اور یہ ہیلی کاپٹر گر گیا اور تباہ ہو گیا۔ ایک اور جگہ ذکر ہوا ہے کہ یہ ہیلی کاپٹر ایک خفیہ حملے کا حصہ تھا اور اس ہیلی کاپٹر کے تباہ ہونے کے بعد اسرائیل نے اپنا حملہ روکنے کا اعلان کر دیا کہ شاید حزب اللہ کو اس کے منصوبے کا علم ہو گیا ہے اور اس طرح حزب اللہ کو فتح نصیب ہوئی۔

نتیجہ بحث:

حزب اللہ کا ظہور، اس کے مختلف ادوار اور اس کے نشیب و فراز میں دوسری قوموں کیلئے بہت سے درس پنہاں ہیں۔ یہ لبنان کی بے شمار تحریکوں میں سے وہ واحد تحریک ہے کہ جو اسرائیل کے لبنان پر ناجائز اور لبنانی اور فلسطینی عوام پر ڈھائے جانے والے مظالم کے جواب میں وجود میں آئی ہے۔ حزب اللہ، لبنان کی خانہ جنگی کے بعد بنی، اسی لیے لبنان کی خانہ جنگی میں اس کی شرکت نہ ہونے کے برابر رہی اور جب کبھی حزب اللہ نے ایسی کسی جنگ میں شرکت کی بھی ہے تو وہ دفاع کی حد تک، لہٰذا اس تنظیم کا ماضی صاف اور تابناک ہے۔

اس تحریک کی اسرائیل کے خلاف استقامت اور دشمن کو ہر ممکن جواب دینے کی حکمت عملی نے اس کو لبنان کے دوسرے معاملات سے خواہ وہ سیاسی ہوں یا فوجی، دور رکھا اور خود یہ حکمت عملی روشن نتائج کی حامل ہے۔

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

دوستی اور دشمنی کا معیار

سیرت آئمہ طاہرین علیہم السلام کی پیروی ڈاکٹر محمد علی نقویؒ کا شعار تھا۔ایک مرتبہ ایک شیعہ مذہبی نوجوان نے کسی بات پر آپ سے لڑائی کی، یہاں تک کہ اس نے آپ کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی جو بہت سے دیکھنے والوں کو ناگوار گزری مگر آپ نے اپنے احباب کو اس پر ہاتھ ڈالنے سے روکا اور فرمایا کہ خدا اسے ہدایت کرے، کچھ عرصہ بعد آپ کو اطلاع ملی کہ وہ نوجوان بستر علالت پر ہے۔آپ خبر ملتے ہی سیدھا اس کے گھر گئے،اس کی عیادت کی اور ہر ممکنہ تعاون کا یقین دلایا۔کسی دوست نے آپ کے رویہ پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا،یہ نوجوان اگر میری ذات کا مخالف ہے تو کیا غم، " میرے خدا، رسولؐ اور آئمہ طاہرینؑ کا مخالف تو نہیں ہے "،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا معیار دوستی یا دشمنی خدا، رسولؐ اور آئمہؑ کی ذات تھی۔

دین اور سیاست میں ربط

سیکولرزم:

دین اور سیاست کے ربط کے عنوان سے بہت بحثیں ہوئی ہیں ۔مغربی دنیا، ہمارے ملک اور دوسرے اسلامی مما لک میں بھی اس سلسلہ میں مختلف نظریات پیش کیئے گئے ہیں ۔اگر ان نظریات کو جمع کر کے ان کے نتائج کو دیکھا جائے تو ان نظریات کو دو نظریوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے ۔ایک نظریہ دین و سیاست کی جدائی ہے اور دوسرا نظریہ دین عین سیاست اور سیاست عین دینداری ہے ۔البتہ ان نظریوں کے علاوہ درمیانی نظریہ بھی پایا جاتا ہے ۔اس درس میں ہمارا مقصد یہ نہیں کہ تمام نظریات پر نقد و بحث کریں بلکہ مقصد یہ ہے کہ نظریہ دین و سیاست کی جدائی کو مختصر طور پر ذکر کرنے کے بعد نقد و بحث کر کے دین و سیاست کے درمیان رابطہ کو بیان کریں ۔نظریہ دین و سیاست کی جدائی کو" سیکولرزم" کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے البتہ سیکولرزم کے متعدد معانی بیان ہوئے ہیں لیکن اس درس میں سیکولرزم کو دین و سیاست کی جدائی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے ۔

دین و سیاست کی جدائی (سیکولرزم) کا معنی یہ ہے کہ دین اور سیاست ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں اور ان میں سے کوئی ایک حق نہیں رکھتا ہے کہ دوسرے کے امور میں مداخلت کرے، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ دین اور سیاست ایک دوسرے کے امور میں مداخلت کرنے کا حق نہیں رکھتے ہیں، جو لوگ علمی اصطلاحات سے واقف ہیں ان کیلئے واضح ہے کہ پہلا مقولہ جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ اس بات کو بیان کرتا ہے کہ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے اور دوسرا مقولہ یہ بیان کر رہا ہے کہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے ۔

نظریہ (سیکولرزم) کے مطابق دین اور سیاست دو ایسے متوازی خطوط ہیں جن کا راستہ ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے اور یہ بے نہایت راستے کبھی بھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے ہیں، آئندہ دی گئی وضاحت سے سیکولرزم کا نظریہ اور بھی واضح و روشن ہو جائے گا۔

سیکولرزم کی یہ کہانی قرون وسطیٰ سے یورپ میں شروع ہوئی، اس کی حقیقت معلوم کرنے کیلئے اس زمانے کے حالات کی تحقیق کرنا ضروری ہے ۔جس وقت کلیسا یورپ کے لوگوں کی زندگی کے تمام شعبوں پر مسلط تھا، اس زمانے میں کلیسا مغربی روم اور مشرقی روم میں تقسیم ہوتا تھا، مشرقی کلیسا کا مرکز اس زمانے میں قسطنطنیہ تھا جو آج کے زمانے میں ترکیہ ہے لیکن کلیسائے کیتھولک مغربی روم کا مرکز آج کے زمانے کا اٹلی تھا اور وہاں پر پادریوں کی حکومت تھی، وہ بے پناہ طاقت رکھتے تھے، حتیٰ کہ متعدد مما لک کے بادشاہ، یہاں تک کہ اسپین کے بادشاہ بھی ان کے حکم کے مقابل سر تسلیم خم کرتے تھے ۔

پادریوں اور کلیسا کے اختیار میں تجارت، بڑے صنعتی کام نیز وقف اور زراعت کی زمینیں بھی تھیں جس کی وجہ سے وہ اقتصادی اور فوجی لحاظ سے بڑی طاقت شمار ہوتے تھے اور عملاً یہ حالت ہوگئی تھی کہ وہ اپنی حاکمیت اور اقتدار کو پورے یورپ پر تحمیل کررہے تھے اور بہت اطمینان کے ساتھ دوسرے مما لک کے بادشاہوں اور حکام کے مقابلہ میں صف آرائی کرتے اور ان سے جنگ کرتے تھے البتہ ان کی اس قدرت میں اتار چڑھاؤ پایا جاتا تھا اور کبھی کبھی ایک بادشاہ یا حاکم کی بغاوت کی وجہ سے ان کی قوت کمزور پڑ جاتی تھی لیکن بہر حال پادریوں کی حکومت ان تمام مما لک پر تھی کہ جہاں عیسائی رہتے تھے اور سلاطین کو ان کے تابع رہنا پڑتا تھا اور جہاں تک ممکن تھا اس پر عمل کرنے پر مجبور کرتے تھے ۔ یہ حاکمیت اور تسلط تمام جوانب پر تھی ،فردی پہلوؤں، احکام اور دینی و مذہبی مراسم کے ساتھ ساتھ اجتماعی، سیاسی یہاں تک کہ مختلف علوم پر بھی ان کا تسلط تھا جن میں ریاضی، ادبیات اور نجوم وغیرہ سب شامل ہیں ۔اس دور میں عقائد کی تفتیش و تحقیق کی عدالت نے جو کام انجام دیئے ان میں گالیلہ کی پھانسی بھی شامل ہے ۔خاص و عام کو معلوم ہے کہ اس کو صرف اس نظریہ کے جرم میں سزا دی گئی تھی کہ وہ قائل تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، جو ان کے عقیدے کے خلاف تھا لہٰذا اس کو پھانسی کی سزا دی گئی ۔ جب کلیسا اور مسیحیت دینی علوم کے لحاظ سے مضبوط نہ رہی اور علمی میدان میں وہ سائنسدانوں اور فلاسفہ کے محتاج ہو گئے اور علمی لحاظ سے مضبوط نہ رہنے کی وجہ سے طویل و عریض حکومت ضعیف ہونے لگی لہٰذا تدریجاً اس میں فساد پیدا ہونے لگا اور یہ سبب بنا کہ کلیسا اور پادریوں کے خلاف لوگ اُٹھ کھڑے ہوں، خود کلیسا میں سے کچھ لوگ جیسے مارٹن لوتھر کہ جس نے مسیحیت میں پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد ڈالی، کلیسا کے تعلیمی نظام میں اصلاحات کا نعرہ بلند کرکے آگے بڑھا اور اسی کے ذیل میں اس نے سیاسی وفرہنگی اصلاحات کا کام بھی شروع کردیا جس کے نتیجے میں پادریوں کے خلاف ایک بڑی جماعت کھڑی ہوگئی اور آخرکار وہ لوگ جدیدیت پر مجبور ہو گئے ۔اس جدیدیت کا ایک نتیجہ جس کو عیسائی علماء اور مذہبی پیشواؤں نے بھی قبول کیا، یہ تھا کہ کلیسائے کیتھولک کا سماجی اور سیاسی امور میں مداخلت کرنا صحیح نہیں ہے لہٰذا یہ کہا جانے لگا کہ کلیسائے کیتھولک نے مسیحیت کو اس کے اصل راستہ سے منحرف کردیا ہے، اس لئے کہ اصل مسیحیت وہ دین ہے کہ جس کو سیاست اور حکومت سے کوئی ربط نہیں لہٰذا خدا سے انسان کے رابطہ کو کلیسا کی چار دیواری تک محدود کردیا جائے ۔انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان چند صدیوں میں یورپ میں جو مصیبتیں اور پریشانیاں اور عقب ماندگی وجود میں آئی ہیں اس کا سبب کلیسا اور

اس کی تعالیم ہیں لہٰذا ان کو میدان سے دور کر دیا جائے۔

کلیسا کی تعلیمات کا محور خدا کی عبادت، آسمان اور ملکوت تھا۔ لہٰذا انہوں نے ان تعلیمات کے خلاف (جو ان کی نظر میں معاشرے میں مصیبت اور معاشرہ کو ترقی سے روکنے والے تھے) دوسرے نعرے بلند کیے کہ جو اس طرح سے تھے کہ ہم خدا کے بدلے انسان، آسمان کے بجائے زمین اور ملکوت کے عوض دنیاوی زندگی کو قرار دیں گے۔ اس طرح سے خدا، آسمان اور ملکوت کی جگہ پر آسمان، زمین اور دنیاوی زندگی کو قرار دے دیا گیا اور دین کو دنیاوی زندگی کے مسائل سے بالکل الگ کر دیا گیا اور یہ کہنے لگے کہ دنیاوی زندگی کے مسائل کو زمین پر حل کر لینا چاہیے نہ یہ کہ خدا، ملکوت اور آسمان کی طرف رجوع کریں۔ اس طرز تفکر کا نام سیکولرزم رکھا گیا، یعنی جو کچھ ہے وہ اسی دنیا میں ہے۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر یہ کہا جانے لگا کہ اگر خدا اور دین ہے اور کوئی اس کا معتقد ہے تو وہ خود اس کا خدا جانتا ہے اور معاشرے کے کاموں سے اس کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ دین کی جگہ فقط کلیسا اور عبادت گاہ ہے، اس جگہ جتنا چاہو عبادت، توبہ اور گریہ کرو لیکن جس وقت کلیسا سے باہر آجاؤ اور معاشرے میں داخل ہو کر زندگی کے امور انجام دینے لگو اس وقت دین کا کوئی کام انجام نہ دو، دین کی کچھ خاص حدود ہیں اور یہ حدود سیاست کی حدود سے الگ ہیں۔

سیاست، امور معاشرہ کی تدبیر کا نام ہے اور دین انسان اور خدا کے درمیان ذاتی رابطہ کا نام ہے۔ اس طریقہ سے یورپ اور عیسائیت میں دین اور سیاست کے درمیان کا رابطہ بالکل ختم ہو گیا اور دین و سیاست کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی گئی۔ ایک طرف انفرادی مسائل اور دوسری طرف سماجی مسائل کو قرار دے دیا گیا البتہ تدریجاً انہوں نے اس سے بھی آگے قدم بڑھا دیا اور کہنے لگے درحقیقت دین شعر و شاعری کی طرح ذوق اور سلیقے سے تعلق رکھنے والا مسئلہ ہے، جس طرح ایک شاعر کہتا ہے:

اے میرے چاند، اے میرے سورج، اے بادصبا میرا یہ پیغام میرے محبوب تک پہنچا دے، یہ سب چیزیں ذوقی ہیں اور عالم واقع میں نہ بادصبا کسی کا پیغام کسی تک پہنچاتی ہے اور نہ چاند و سورج، اس کی آواز کو سنتے ہیں، بلکہ یہ سب اس کے احساسات کی دین ہیں، اسی طرح جس وقت کوئی شخص کونے میں بیٹھ کر گریہ و زاری کے ساتھ کہتا ہے: اے میرے خدا، اے میرے پالنے والے، یہ باتیں بھی شاعر کے شعر کی طرح ہیں۔ معلوم نہیں واقعاً خدا ہے یا نہیں، شاعر کہتا ہے، اے چودھویں کے چاند تم کتنے خوبصورت ہو لیکن اس زمانے میں علم نجوم کہتا ہے چاند ایک ٹھنڈا اور بے روح جسم اور ایک چٹیل میدان ہے جس میں کسی طرح کا حسن نہیں ہے، یہ شخص جو کہتا ہے: اے میرے خدا تو کتنا اچھا ہے، وغیرہ یہ سب تخیلاتی احساسات ہیں کہ جو اس کی روح کو آرام دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ چیز جو واقعیت اور حقیقت رکھتی ہے، یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کام کرے، پیسہ کمائے، زندگی گزارے، سیر و تفریح کرے اور حکومت تشکیل دے، قانون بنائے، مجرموں اور فساد برپا کرنے والوں کو سزا دے اور ان کو جیل میں ڈال دے اور جنگ و صلح کرے وغیرہ، اور یہ سب چیزیں دین سے مربوط نہیں ہیں۔

یہ مطالب جو بیان ہوئے حقیقت میں فلسفہ اثباتیت (Positivism) ہے، جو یورپ میں جدیدیت کے بعد پیدا ہوئے، وہ معتقد ہیں کہ جو کچھ ہم دیکھ یا چھو سکیں بس وہی چیزیں حقیقت رکھتی ہیں اور ہمیں چاہیے کہ انہیں کے بارے میں غور و فکر کریں

 اور اسی کے مطابق پروگرام بنائیں لیکن خدا اور عالم ملکوت کو چونکہ ہم نے نہ دیکھا ہے اور نہ ہی تجربہ کیا ہے لہٰذا ان مسائل کو اہمیت نہیں دینا چاہیے کہ جس کا سبب روز بروز سائنسی ترقیات بھی تھیں اور زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف ثقافتوں کے ملنے کی وجہ سے اسلامی ممالک اور مسلمان دانشوروں کے درمیان سیکولرزم رواج پیدا کرتا چلا گیا اور مسلمان مفکرین کے ذہن میں بھی یہ سوال آنے لگا کہ اسلام بھی کہیں عیسائیت کی طرح تو نہیں؟۔

کیونکہ اسلام بھی دین ہے اور دین انسانوں اور خدا کے درمیان رابطہ کا نام ہے۔لہٰذا انسانی معاشرے میں دین کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔

انقلاب اسلامی جو کہ دین اور اسلام کے نام پر وجود میں آیا اور اس نے کامیابی حاصل کی، کے بارے میں بھی اس طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں کہ ان میں بعض لوگ دین کا درد رکھنے اور بعض لوگ مکاری و فریب کاری کی وجہ سے یہ باتیں کہتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ دین وسیاست کو ملانے اور دین کو حکومت کی اساس قرار دینے کی وجہ سے یہ حکومت بھی کیتھولک چرچ کی طرح شکست کھا جائے گی، کیونکہ تجربہ شدہ کو تجربہ کرنا بھی بہت بڑی غلطی ہے۔دین کو حکومتی امور اور علمائے دین کو حکومتی منصب سے الگ ہونا چاہیے تاکہ معاشرے میں موجود مشکلات اور برائیوں کا الزام دین پر نہ لگے اور یہ کام دین وسیاست کی جدائی کے نظریہ کو قبول کئے بغیر میسر نہیں ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ دین محفوظ رہے، قرآن و اسلام کا احترام وعزت اسی طرح باقی رہے تو اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ دین کو سیاست سے جدا کر دیا جائے اور سیاست کو سیاست دانوں کیلئے چھوڑ دیا جائے تاکہ علمائے دین کی قدر ومنزلت باقی رہے اور یہ لوگ سیاسی امور میں دخالت کر کے کام خراب نہ کریں۔

دین کے بارے میں جو تفسیر آپ نے بیان کی ہے اور اس کو سیاست کا حصہ قرار دیا ہے، وہ غلط ہے لہٰذا دین کی نئی تفسیر کی جانی چاہیے اور ایک مسلمان مارٹن لوتھر اور اسلامی پروٹسٹا نزم کی ضرورت ہے ورنہ اسلام صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔

سیکولرزم کے رجحان نے بعض اسلامی ممالک جیسے ترکی میں اتنا رسوخ پیدا کر لیا ہے کہ انہوں نے سیکولر حکومت کو قبول کر لیا ہے اور وہاں پر مسلمان سرکاری ملازم کو دفتر میں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دین اور اسلام کا نام لے سکے یا کوئی مذہبی نشانی اپنے ساتھ رکھ سکے، یہاں تک کہ علماء کو خاص لباس پہننے پر مجرم قرار دیا جاتا ہے، اگر کوئی عالم دین مخصوص لباس پہنے ہوئے پایا جائے، مثلاً عمامہ یا عمامہ کی طرح رومال یا شال اپنے سر پر رکھے ہوئے ہو تو پولیس اسے گرفتار کر لیتی ہے، یہ اس ملک کا حال ہے کہ جو کچھ عرصہ قبل ایک بڑی اسلامی حکومت یعنی حکومت عثمانی کا مرکز تھا اور ایشیاء کا ایک بڑا حصہ اور تقریباً آدھا یورپ اس اسلامی حکومت کے قبضہ قدرت میں تھا۔

سیکولرزم دینی نکتہ نظر سے ہٹ کر

بعض مؤلفین اور دانشوروں نے دین اور سیاست کی جدائی کے نظریہ کو ثابت کرنے کیلئے یہ دلیل پیش کی ہے کہ دین میں داخل ہونے سے پہلے اور دین کو بیرونی نکتہ نظر سے دیکھتے ہوئے ہمارا سوال یہ ہے کہ بشر کو دین کی کیا ضرورت ہے اور کن مسائل

میں دین کی ضرورت ہے؟

اس سوال کے جواب میں انہوں نے دو جہت سے تصور کیا ہے، ایک یہ کہ انسان زندگی کے تمام امور میں دین کا محتاج ہے اور اسے چاہیے کہ تمام مسائل دین سے سیکھے کہ کس طرح کھانا کھائے، کس طرح کپڑا سیئے، کس طرح لباس پہنے، کس طرح گھر بنائے، کس طرح شادی کرے، کس طرح معاشرے کو تشکیل دے وغیرہ۔ مختصر یہ سمجھیں کہ دین انسان کے تمام امور کو حل کر سکتا ہے، اگر اس نظریہ کو قبول کریں اور اسی کو اساس قرار دیں تو اس صورت میں اگر انسان چاہے کہ لباس سیئے تو اسے دیکھنا پڑے گا کہ دین کیا کہتا ہے، اگر کھانا کھانا چاہے تو اسے دیکھنا ہوگا کہ دین کیا کہتا ہے، اگر ڈاکٹر کے پاس جانا ہو تو دیکھے کہ دین کیا کہتا ہے، اس صورت میں اگر حکومت تشکیل دینے کی ضرورت پڑی تو دیکھنا ہوگا کہ دین کیا کہتا ہے لیکن سبھی جانتے ہیں اور واضح ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور کسی دین نے اس طرح کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میں تمام انسانی ضروریات کو پورا کروں گا مثلاً یہ کہ دین کہے کہ میں تمہیں سکھاؤں گا کہ اس بلڈنگ یا چھت کو کیسے بنایا جائے، اگر ایسا ہوتا تو کوئی شخص سائنسی تحقیقات کرنے نہ جاتا اور تمام انسان ان مسائل کو دین سے سیکھ لیتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ دین اور احکام کے ہونے کے باوجود بشر سائنسی تحقیقات اور علوم کو سیکھنے سے بے نیاز نہیں ہے اور دین، کمپیوٹر، ڈش اور ایٹمی علوم وغیرہ کا علم انسانوں کو نہیں سکھاتا لہٰذا یہ کہنا کہ دین انسانوں کے تمام جزئی مسائل کو حل کر سکتا ہے بالکل صحیح نہیں ہے بلکہ ہمیں دین سے اس کی حدود سے باہر توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہر سوال کا جواب دین سے طلب کریں۔

پس جب ہم پہلے سوال کو قبول نہیں کر سکتے تو صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ دین سے ہمیں صرف یہ توقع ہونی چاہیے کہ دین سے آخرت کے امور کے متعلق سوال کیا جائے اور دین کا تعلق انسانوں کی آخرت بنانے اور آباد کرنے سے ہے اور دنیاوی زندگی سے دین کا کوئی ربط نہیں ہے، دنیاوی امور میں دین نے انسان کو اس کے علم و عقل و تدبیر پر چھوڑ دیا ہے اور وہ اصطلاح کہ جو اس مقام میں استعمال کی گئی ہے، یہ ہے کہ ہمیں دین سے صرف تھوڑی سی توقع رکھنی چاہیے لہٰذا دین صرف آخرت سے مربوط ہے جیسے یہ مسائل کہ کس طرح نماز پڑھیں، کس طرح روزہ رکھیں، کس طرح حج کریں، بلکہ ایک جملے میں یوں کہا جائے کہ دین صرف یہ بتاتا ہے کہ آخرت میں ہم دوزخ میں جانے سے کیسے بچیں اور اہل بہشت سے مربوط رہیں، ان کو دین سے اخذ کرنا چاہیے، سیاست دنیاوی امور سے متعلق ہے اور اساساً دین کی حدود سے خارج ہے، سیاست، علم و عمل کی حاکمیت میں سے ہے اور دین کا دائرہ اس سے چھوٹا ہے، اس بنا پر معاشرتی علوم کے علماء اور سیاستدار ہیں کہ جن کو چاہیے کہ سیاسی امور اور معاشرے کو چلانے کیلئے اپنا نظریہ پیش کریں، فقہاء و علماءِ دین کو چاہیے کہ عوام کی آخرت کے امور کو حل کریں اور ان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ حکومت اور سیاست کی مسند پر بیٹھیں لیکن اگر پھر بھی وہ لوگ حکومت کی مسند پر بیٹھنا چاہیں تو یہ کسی تھیوری و منطق کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ واضح ہے کہ یہ نظریہ سیکولرزم اور جدائی دین از سیاست کے نظریہ سے زیادہ ننگ و عار ہے۔

اس بحث میں دین سے مراد اسلام ہے اور دوسرے ادیان ہماری مراد نہیں ہیں لہٰذا اصل سوال یہ ہے کہ دین اسلام کا سیاست سے کیا رابطہ ہے، اس اہم نکتہ کو بیان کرنے کے بعد ضروری ہے کہ دین اور سیاست کے رابطہ کی تحقیق کیلئے سب سے پہلے ان دو مفاہیم کو سمجھ لیا جائے اور مشخص کر دیا جائے کہ دین اور سیاست سے ہماری مراد کیا ہے؟

عرف عام میں سیاست ایک ناپسندیدہ امر ہے کہ جس میں منفی پہلو پائے جاتے ہیں، جس میں دھوکہ دہی، چالاکی اور فریب کاری شامل ہے لیکن اس بات پر توجہ ضروری ہے کہ سیاست سے ہماری مراد ایسی غلط سیاست نہیں ہے، بلکہ سیاست امور مملکت کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے طریقے کو کہتے ہیں یا دقیق انداز میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ معاشرے میں نظم و نسق برقرار رکھنے کے طریقہ کار کہ جس میں معاشرے کے مادی مفادات ملحوظ رہیں کا نام سیاست ہے لہٰذا سیاست معاشرے کے نظم و نسق برقرار کرنے اور معاشرتی امور کی اصلاح کرنے سے مربوط ہوتی ہے۔

اس طرح دین سے ہماری مراد (اسلام) ہے کہ جس میں احکام، عقائد اور دوسرے مسائل شامل ہیں کہ جن کو خداوند عالم نے پیغمبر اکرمؐ و آئمہ اطہارؑ کے ذریعے وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور اپنے بندوں کی ہدایت اور دنیا و آخرت کی سعادت کیلئے معین کیا ہے یا احکام عقل کے قطعی حکم سے کشف ہوئے ہیں۔ چنانچہ دین اور سیاست کا مفہوم واضح ہو چکا ہے، اب اگر یہ جاننا چاہیں کہ کیا اسلام میں سیاسی امور بھی شامل ہیں، یا سیاسی اور معاشرتی مسائل اسلام میں شامل نہیں ہیں؟ تو اس سوال کا جواب معلوم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خود اسلام کی طرف رجوع کیا جائے۔

جیسا کہ ہم اگر عیسائی نہ ہوں لیکن کسی موضوع میں عیسائیت کے نظریہ کو جاننا چاہیں تو بہترین راستہ یہی ہے کہ انجیل مقدس کی طرف رجوع کریں، اس بحث میں بھی یہ جاننے کیلئے کہ اسلام میں سیاست کا مقام کیا ہے، قرآن مجید، معارف اور احکام دین کی طرف رجوع کریں گے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیا اسلام نے سیاست اور معاشرتی امور کے نظم و نسق کے بارے میں بھی کچھ بیان کیا ہے یا صرف انفرادی مسائل کو بیان کیا ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ حقیقی اسلام وہ نہیں ہے جو قرآن مجید نے پیش کیا ہے، حقیقی اسلام وہ نہیں ہے جو پیغمبر اکرمؐ نے پیش کیا ہے، حقیقی اسلام وہ نہیں جو آئمہ اطہارؑ نے بیان کیا ہے بلکہ حقیقی اسلام وہ ہے جو میں کہتا ہوں، تو یہ واضح اور روشن ہے کہ یہ قول، منطقی اور قابل قبول نہیں ہے۔ اگر کوئی حقیقی اسلام کہ جس کو مسلمان قبول کرتے ہیں کے بارے میں تحقیق کرنا چاہے تو حقیقی اسلام وہی ہے جو قرآن مجید اور سنت پیغمبر اکرمؐ میں بیان ہوا ہے، نہ یہ کہ فلاں یورپین یا امریکی مستشرق نے کہا یا میں خود قرآن و سنت کے برخلاف حقیقی اسلام کی تعریف کروں۔

اگر میں کہوں کہ میں اسلام کو قبول کرتا ہوں لیکن اس اسلام کو قبول نہیں کرتا جو قرآن و سنت نے بتایا ہے، جو پیغمبر اکرمؐ نے بتایا ہے تو واضح ہے کہ ایسی بات اسلام سے انکار کرنے کے مترادف ہے لہٰذا اسلام اور سیاست کے درمیان رابطہ کو معلوم کرنے کیلئے ہمیں قرآن مجید اور سنت پیغمبرؐ و آئمہ اطہارؑ کی مدد لینی پڑے گی۔

قرآن مجید کے نظریہ کو جاننے کیلئے اس مقام پر ہم جو معلوم کرنا چاہتے ہیں، اس کیلئے عربی الفاظ سے تھوڑی سی آشنائی بھی کافی ہے اور ضروری نہیں ہے کہ ہم ادبیات عرب یا تفسیر قرآن مجید سے بطور کامل آشنا ہوں، حتیٰ یہ بھی لازم نہیں ہے کہ تفسیر قرآن مجید کا مختصر طور پر مطالعہ کئے ہوئے ہوں بلکہ اس مطلب کو سمجھنے کیلئے صرف عربی لغت سے تھوڑی سی آشنائی بھی کافی ہے۔ جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جس طرح اسلام نے انفرادی عبادت اور اخلاق کے بارے میں مطالب کو بیان کیا ہے اسی طرح معاشرتی زندگی، گھریلو روابط، ازدواج، طلاق، معاملات، تجارت، تربیت اولاد، اولو الامر کی پیروی، قرض، رہن، جنگ و صلح، شہریوں کے حقوق، حقوق جزائی، عالمی حقوق اور اس طرح کے دوسرے مسائل کیلئے قوانین معین کئے ہیں اور انہیں بیان کیا ہے، قرآن مجید کی متعدد آیتیں انہیں امور کو بیان کرتی ہیں اور اس سے کئی گنا زیادہ مطالب پیغمبر اکرمؐ و آئمہ اطہارؑ سے منقول روایات میں موجود ہیں۔

ان تمام مسائل کو دیکھتے ہوئے جو اسلام و قرآن مجید نے بیان کئے ہیں، کیا قبول کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے خود کو سیاست اور معاشرے کے نظم و نسق اور معاشرتی روابط سے جدا کر دیا ہے اور صرف عبادی اور شخصی اخلاق کو بیان کیا ہے اور صرف خدا اور بندہ کے درمیان رابطہ برقرار کرنے پر اکتفا کیا ہے؟

جواب: اسلام نے صرف عبادی اور اخلاقی مسائل کو بیان نہیں کیا ہے بلکہ معاشرتی روابط کو بھی نظر میں رکھا ہے جس کے چند نمونے ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت میں قرض کے لین دین کا ذکر ہے اور اس میں یہ تاکید ہے کہ (اگر کسی کو قرض کے عنوان سے پیسہ دو تو اس کو لکھ لیا کرو اور دو شاہدوں کی موجودگی میں پیسہ دیا کرو، اگر اتفاقاً ایسی جگہ پر معاملہ ہو جہاں قلم و کاغذ نہیں ہے کہ لکھ سکو اور کوئی شاہد بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں رہن لے لیا کرو یعنی جو پیسہ آپ نے دیا ہے اس کے عوض کوئی قیمتی چیز لے لو اور جس وقت وہ تمہارا پیسہ واپس کرے، اس وقت اسے واپس دے دو۔[1]

جس دین نے قرض کے بارے میں یہ احکام بیان کئے ہیں کیا اس دین کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اس نے معاشرے سے مربوط مسائل کو بیان نہیں کیا ہے؟۔

ازدواج اور طلاق بھی معاشرے سے مربوط مسائل میں سے ہے۔ قرآن مجید میں متعدد آیتیں ازدواج کی کیفیت اور احکام کے بارے میں ہیں[2]، اسی طرح طلاق کی کیفیت اور اس کے احکام کا تذکرہ بھی ہے[3]، حق مہر کے لین دین[4]، جن افراد

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۲۸۲

[2] سورہ بقرہ آیت ۲۴۰

[3] سورہ بقرہ آیت ۲۳۰، سورہ احزاب آیت ۴۹

[4] سورہ نساء آیت ۲۰

سے ازدواج جائز یا حرام ہے [1]، ازدواجی زندگی کے روابط [2]، گھریلو جھگڑوں کا حل کیا ہے وغیرہ ان سب مسائل کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔

مثال کے طور پر گھریلو جھگڑوں کے راہ حل کیلئے خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے: اگر اس بات کا خطرہ ہو کہ میاں بیوی کے درمیان شدید نااتفاقی ہو جائے گی تو ایسی صورت میں شوہر کے رشتہ داروں میں سے ایک شخص اور زوجہ کے رشتہ داروں میں سے ایک شخص آپس میں مصالحت کرائیں تو خدا ان کے درمیان اچھا بندوبست کردے گا بیشک خداوند عالم واقف اور خبردار ہے۔ [3]

اسی طرح میراث کا مسئلہ جو سماجی اور معاشرتی مسئلہ ہے، اس کے بارے میں بھی قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے " خداوند عالم تمہاری اولاد کے حق میں تم سے وصیت کرتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور اگر میت کی اولاد میں صرف لڑکیاں ہی ہوں (دو یا دو سے زیادہ) تو ان کا مقررہ حصہ کل ترکہ کی دو تہائی ہے اور صرف ایک لڑکی ہو تو میراث کا آدھا حصہ اس کا حق ہے۔ [4]

معاشرتی و سماجی مسائل میں سے ایک مسئلہ داخلی جنگ یا آپس میں لڑائی جھگڑا ہے اس سلسلہ میں قرآن مجید فرماتا ہے " اگر مومنین میں سے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں میں صلح کرادو، پھر اگر ان میں سے ایک (فریق) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو فرقہ زیادتی کرے تم بھی اس سے جنگ کرو یہاں تک کہ خدا کے حکم کی طرف لوٹ آئے، پھر جب لوٹ آئے تو فریقین میں مساوات کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف سے کام لو، بیشک خداوند عالم انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" [5]

کسب معاش و تجارت بھی سماجی اور معاشرتی روابط میں سے ہے، اسلام اور قرآن مجید نے اس بارے میں بھی سکوت اختیار نہیں کیا ہے اور اس مسئلہ کو بھی علم و عقل اور معاشرے کے عرف عام پر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اس بارے میں بھی احکام موجود ہیں، خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے" حالانکہ خدا نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کر دیا ہے۔" [6]

" اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز جمعہ کیلئے اذان دی جائے تو خدا کی یاد (نماز) کی طرف دوڑ پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو"۔ [جمعہ آیت ۱۰]

" اے ایمان والو! اپنے اقرار اور وعدوں کو پورا کرو۔" [مائدہ آیت ۱]

---

۱) سورہ نساء آیت ۲۳

۲) سورہ بقرہ آیت ۲۲۲

۳) سورہ نساء آیت ۳۵

۴) سورہ نساء آیت ۱۱

۵) حجرات آیت ۹

۶) بقرہ آیت ۲۷۵

معاشرے میں جو جرائم ہوتے ہیں ان کے بارے میں بھی قرآن مجید میں متعدد احکام موجود ہیں، کہ ان میں سے ایک چوری کا حکم ہے جو معاشرے میں ایک اہم مسئلہ ہے اور یہ جرم زیادہ مقدار میں واقع ہوتا ہے۔ "اور جو چور خواہ مرد ہو یا عورت، تم ان کے کرتوت کی سزا کے طور پر ان کا داہنا ہاتھ کاٹ ڈالو۔ [مائدہ آیت ۳۸]

اسی طرح عفت کے خلاف فحشا کے ارتکاب کرنے والوں کے بارے میں اگر چہ کوئی شاکی بھی نہ ہو لیکن پھر بھی اگر حاکم شرعی یا اسلامی حکومت کے قاضی کے سامنے ثابت ہو جائے کہ یہ جرم واقع ہوا ہے، قرآن اور اسلام کی نظر میں جرم سمجھا جائے گا اور مجرم کو سزا دی جائے گی، معاشرے میں امن و امان برقرار رکھنے اور عفت و پاکدامنی کے تحفظ کیلئے اسلام میں بہت سی سزائیں رکھی گئی ہیں، قرآن کریم اس بارے میں صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۠ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

"زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور حکم خدا کے نافذ کرنے میں تم کو ان کے بارے میں کسی طرح کا لحاظ نہ ہونے پائے اور اگر تم خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو ان دونوں کو سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت موجود رہنا چاہیے تا کہ ان کی سزا پر گواہ رہیں۔ [سورہ نور۔ آیت ۲]

قرآن مجید میں سماج اور معاشرتی مدیریت اور روابط کے بارے میں دسیوں آیتیں موجود ہیں کہ ان میں سے نمونے کے طور پر مختصر ہم نے بیان کیا ہے اور آیات سے کہیں زیادہ روایات موجود ہیں جو پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومینؑ نے بیان کی ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ سب آیات اور روایات انسان کے خداوند عالم سے انفرادی رابطے اور انسان کے شخصی مسائل کو بیان کر رہی ہیں یا انسانوں کے آپسی روابط اور معاشرے کے نظم و نسق کے بارے میں ہیں؟ اسلام میں جو احکام اور مسائل پائے جاتے ہیں اگر یہی ہیں جو آیات و روایات میں موجود ہیں تو پھر کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسلام کو سیاسی، سماجی اور معاشرتی نظم و نسق سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور اسلام نے انسانوں کے دنیاوی مسائل کے حل کرنے کی ذمہ داری خود انہیں پر چھوڑ دی ہے؟ اور صرف آخرت، جنت و دوزخ کے بارے میں اسلام نے کچھ باتیں بیان کی ہیں؟ انصاف پسند اور اہل منطق انسان کیلئے کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ البتہ ممکن ہے کچھ لوگ دشمنی کی وجہ سے بہت سے حقائق کا انکار کر دیں لیکن پھر بھی وہ صریح اور واضح آیتیں جو قرآن مجید میں ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ انکار نہیں کر سکتے کہ اسلام کا سیاسی امور اور معاشرہ کے نظم و نسق سے کوئی ربط نہیں ہے، کیونکہ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے سورج کا انکار کر دیا جائے جو روزانہ آسمان پر ظاہر ہوتا ہے اور پوری زمین کو گرم اور روشن کرتا ہے۔

دوسرے پہلو سے بھی قرآن مجید میں سیاست سے مربوط آیات کی تحقیق کی جاسکتی ہے۔ وہ اس طرح سے کہ نظریہ ترکیب

حکومت اور نظام سیاسی کی بنیاد پر حکومت تین قوتوں پر مشتمل ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ معروف ہے کہ منتسکیو کے زمانے کے بعد سے حکومت کے عہدے تین قوتوں پر مشتمل ہیں: ۱۔ مقننہ ۲۔ قضائیہ ۳۔ مجریہ

اب اس نظریہ کے مطابق ہم قرآن مجید پر تحقیقی نظر ڈالیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ آیا قرآن مجید نے ان تینوں قوتوں کے بارے میں بیان کیا ہے یا نہیں؟ واضح ہے کہ قرآن مجید میں ان موارد سے مربوط آیات موجود ہیں کہ جن میں ان قوتوں کی ذمہ داریوں کا ذکر ہے لہٰذا یقیناً اسلام سیاست سے مربوط ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کا سیاسی دین ہونا ثابت ہو جائے گا۔

قوہ مقننہ کی ذمہ داری قوانین اور احکام کا وضع کرنا ہے تا کہ معاشرے میں نظم و نسق برقرار رہے اور یہ کہ کن خاص حالات میں عوام کا کیا کردار ہے تا کہ معاشرے میں عدالت اور امنیت اور نظم و نسق برقرار رہے اور لوگوں کے حقوق ضائع نہ ہوں اور معاشرہ فلاح و بہبود اور ترقی کی طرف رواں دواں رہے۔

قوہ مقننہ کے ہمراہ قوہ مجریہ ہے جس کی ذمہ داری ان قوانین کو عملی جامہ پہنانا ہے کہ جو قوانین مقننہ نے وضع کئے ہیں اور جو حکومت کے ممبران، وزیر اعظم یا صدر کی شکل میں ہیں اور آخر کار ان دو قوتوں کے ساتھ تیسری قوت ہے، کہ جس کو عدلیہ کہا جاتا ہے جس کی ذمہ داری قوانین کا وضع کرنا نہیں ہے اور اسی طرح قوانین کو عملی جامہ پہنانا بھی اس کے فرائض میں شامل نہیں ہے لیکن کلی قوانین کو خاص موارد پر تطبیق دینا اور ان موارد، جو عوام کے درمیان، یا عوام اور حکومت کے درمیان اختلافات کا باعث بنتے ہیں کی بحث و تحقیق کرنا اور ان امور میں قضاوت اور فیصلہ کرنے کی ذمہ داری قوہ عدلیہ کی ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیا قرآن مجید نے ان موضوعات کے بارے میں کچھ بیان کیا ہے؟ کیا ان ذمہ داریوں کے بارے میں تذکرہ پایا جاتا ہے اور مسلمانوں کیلئے کوئی ذمہ داری بیان کی ہے؟ یا قرآن مجید نے ان موارد میں سکوت اختیار کیا ہے اور ان موارد کی ذمہ داری خود مسلمانوں کے سپرد کر دی ہے تا کہ وہ جو مصلحت سمجھیں اسی پر عمل کریں؟

قانون سازی کی ذمہ داریوں کے چند نمونے قرآن مجید نے بھی ذکر کئے ہیں۔ قرآن اور اسلام نے ان امور کیلئے خاص اہتمام کیا ہے اور معاشرتی قوانین حقوقی، جزائی، تجارت اور معاملات وغیرہ جیسے امور میں متعدد قوانین وضع کئے ہیں جن میں حکومت سے متعلق مسائل کہ جن میں معاشرے کے امور میں نظم و نسق برقرار کرنا بھی شامل ہے، بیان کئے ہیں اس کے علاوہ قرآن مجید نے پیغمبر اکرمؐ کو ایک خاص حق عطا کیا ہے جو زمان و مکان سے متعلق ہے اور زمان و مکان کے بدلنے سے قوانین میں تبدیلی کی ضرورت پڑتی ہے لہٰذا خود پیغمبر اکرمؐ کو ایسے قوانین وضع کرنے کا حق دیا ہے اور عوام کا ان قوانین پر عمل کرنا واجب ہے۔ خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

"اور نہ کسی ایماندار مرد کو یہ حق ہے اور نہ کسی ایماندار عورت کو کہ جب خدا اور اس کا رسولؐ کسی کام کا حکم دیں،

اس کی مخالفت کریں"[سورہ احزاب ۔آیت ۳۶]

اس آیت کے مطابق اگر خدااور پیغمبر اکرمؐ عوام کو کوئی حکم دیں یا کوئی چیز معین کریں تو کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی مخالفت کرے، خداوند عالم اور پیغمبر اکرمؐ کے حکم اور ارادہ کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اپنے کام میں اختیار حاصل نہیں ہے یعنی پیغمبر اکرمؐ کے نافذ قوانین، خداوند عالم اور اس کے ثابت قوانین ان لوگوں پر کہ جو اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کررہے ہیں، عمل کرنا واجب ہے اور کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جو قوانین وضع کئے ہیں اور عوام کیلئے معین کئے ہیں ان کی مخالفت کرے، یہ آیت جو ذکر ہوئی ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ

"نبی تو خود ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں"۔(سورہ احزاب ۔۶)

اس لحاظ سے حقوق اور اجرائی قوانین کے نفاذ میں بلند ترین مرتبہ اگر کسی کیلئے قائل ہوسکتے ہیں تو وہ دین اسلام میں پیغمبر اکرمؐ کیلئے مخصوص ہے البتہ یہ کہ آیا پیغمبر اکرمؐ کے اہل مراتب کیلئے یہ حق ثابت ہے یا نہیں؟ آئندہ مباحث میں ہم اس بحث کو زیر غور لائیں گے۔گزشتہ بحث سے معلوم ہوگیا کہ قرآن مجید اور اسلام نے قوہ مقننہ کے بارے میں بھی تذکرہ کیا ہے، غیر متغیر معاشرتی قوانین کے علاوہ وہ قوانین بھی ہیں جو کہ متغیر ہیں نیز اس کیلئے بھی پیغمبر اکرمؐ کے حق کو ذکر کیا ہے اور دوسروں کو ان قوانین پر عمل کرنے کو واجب قرار دیا ہے۔دو آیتیں جو ذکر ہوئیں (سورہ احزاب ۔۶،۳۶)۔ان میں قوہ مجریہ کی ذمہ داریوں اور ان قوانین پر عمل کرنے کے بارے میں بھی اظہار نظر کیا ہے لیکن عدلیہ جس کی ذمہ داری اختلاف اور جھگڑوں کو ختم کرنا ہے کہ جو حکومت وسیاست کے دوسرے رخ کو تشکیل دیتا ہے اس کے بارے میں بھی قرآن مجید نے سکوت اختیار نہیں کیا بلکہ اس سلسلہ میں بھی مطالب بیان کئے ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

"پس اے رسولؐ! تمہارے پروردگار کی قسم، یہ لوگ سچے مومن نہیں ہونگے مگر یہ کہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم نہ بنائیں پھر یہی نہیں بلکہ جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں بلکہ خوش خوش اس کو مان لیں۔(سورہ نسا۔آیت ۶۵)

صرف یہی نہیں کہ اسلام میں قضاوت اور عدلیہ کا حکم ہے بلکہ اس کو ایمان کی شرط قرار دیا گیا ہے اور اس کیلئے خداوند عالم نے خاص قسم کھائی ہے کہ جن میں وہ منفی قسمیں بھی ہیں جو قرآن مجید میں موجود ہیں۔خداوند عالم نے قسم کھائی ہے کہ لوگ سچے مومن نہیں ہونگے جب تک کہ وہ اپنے اختلافی مسائل میں تمہیں قاضی قرار نہ دیں اور فیصلہ کرنے کیلئے تمہارے پاس نہ آئیں (نہ کہ دوسروں کے پاس فیصلہ کیلئے جائیں) تمہارے فیصلے کے بعد نہ صرف یہ کہ کوئی اعتراض نہ کریں بلکہ دل سے بھی تمہارے فیصلہ کو اگر چہ ان کے نقصان میں ہو کسی طرح کی کدورت نہ رکھیں اور رضایت قلب اور خوشنودی کے ساتھ تمہارے حکم کو قبول کریں، اس

مسئلہ کی چاشنی اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم قبول کرلیں کہ پیغمبر اکرمؐ علم غیب کے ذریعہ فیصلہ نہیں کرتے تھے بلکہ عام قاضیوں کی طرح کبھی دلائل اور مدارک ضعیف ہونے کی بنیاد پر فیصلہ کرتے تھے شاید اسی بنا پر کسی کا حق اس کو نہ مل سکے، اگرچہ واقعہ میں اس کا حق رہا ہولیکن چونکہ معتبر دلیل پیش نہ کی جاسکی لہٰذا فیصلہ اس کے نقصان میں ہوگیا۔ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں:

" إِنَّمَا أَقْضِي بَيْنَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَ الْأَيْمَان " (وسائل الشیعہ ۔ج ۲۷،ص ۲۳۲)

بیشک میں تمہارے درمیان گواہ اور قسم کے مطابق حکم کرتا ہوں ۔یعنی میں انہیں موجودہ عدالتی قوانین کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہوں کہ جس میں شاہد، اقرار وقسم اور اس کے مثل دلیلیں شامل ہیں ۔

لہٰذا ممکن ہے اس بنیاد پر مثلاً کبھی شاہد عادل آ کرگواہی دے لیکن جس کی وہ گواہی دے رہا ہے خود کو اس کے بارے میں صحیح علم نہ رہا ہو اور وہ یہ سمجھ بھی نہ پایا ہو کہ اس نے غلطی کی ہے یا یہ کہ ان موارد میں گواہ نے جھوٹ بولا ہولیکن چونکہ اس کا فاسق ہوجانا قاضی کیلئے (اس جگہ مراد پیغمبر اکرمؐ ہیں) ظاہری اُصول کے مطابق ثابت نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے برعکس اس کی عدالت ثابت ہوئی ہے لہٰذا اس کی گواہی قبول کی جائے گی اور اس کے مطابق حکم جاری ہوگا۔ یہ آیت بیان کرتی ہے کہ اگرچہ حقیقت اس طرح ہو اور حکم، حقیقت کے خلاف ہولیکن پھر بھی چونکہ عدلیہ کے قوانین کے مطابق پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا ہے لہٰذا ہر مومن پر واجب ہے کہ اس کو قبول کرے، اس کے سامنے سرِ تسلیم جھکائے ورنہ مومن نہیں رہ پائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا قانون گذاری اور قانون کے اجراء میں (قوہ مقننہ اور مجریہ) یا قضاوت اور عدلیہ میں کیا اس سے بڑھ کر اور کچھ ہے جو ان آیات میں ذکر نہ ہوا ہے، آیا ان آیات پر نظر رکھتے ہوئے ممکن ہے ملک کے نظم و نسق اور معاشرے سے مربوط مسائل میں اب بھی دعویٰ کیا جاسکے کہ اسلام کا سیاست سے کوئی ربط نہیں ہے اور اسلام نے معاشرتی اور سماجی امور میں مداخلت نہیں کی ہے ۔

◆ دین کی مداخلت کتنی ہونی چاہیے؟

جیسا کہ ہم نے اشارۃً بیان کیا کہ دین وسیاست کے درمیان رابطہ کے سلسلہ میں بعض نے کہا ہے کہ ہمیں دین میں داخل ہونے سے پہلے اس مسئلہ پر بحث وتحقیق کرنا چاہیے اور قبل اس کے کہ دین اور اس کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں، ہمیں چاہیے کہ یہ دیکھیں کہ ہمیں دین سے کیا اُمیدیں ہونی چاہئیں اور خود انہوں نے جواب دیا ہے کہ ہمیں دین سے صرف یہی اُمید رکھنی چاہیے کہ دین بتائے کہ کیا عمل انجام دیں کہ جنت ملے اور جہنم وقیامت کے عذاب سے بچ جائیں، ایک جملہ میں یوں کہا جائے کہ دین سے ہمیں صرف یہ اُمید ہونی چاہیے کہ آخرت سے مربوط مسائل کو ہمارے لئے بیان کرے لیکن دنیا سے مربوط مسائل کو بیان کرنا دین کی ذمہ داری نہیں ہے اور نہ ہی دنیاوی مسائل دین نے بیان کیے ہیں، ان امور میں بشر کو چاہیے کہ اپنے علم وعقل سے مسائل کو حل کرے ۔

اس نظریہ کے سلسلہ میں یہ کہنا ضروری ہے کہ،حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی اگر چہ دوحصوں یعنی حیات دنیوی اور حیات اخروی پر مشتمل ہے یعنی ایک زمانہ وہ ہے کہ ہم پیدا ہوتے ہیں اور اس عالم میں ہماری دنیاوی زندگی شروع ہوتی ہے اور موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے، دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ہم عالم برزخ میں داخل ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ قیامت آجائے گی (البتہ ممکن ہے ہم عالم جنین یعنی جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے) یا اس سے پہلے کے زمانے کو بھی انسانی وجود کے مراحل میں شمار کریں لیکن بہر حال یہ واضح اور روشن ہے کہ ہماری زندگی کے دو حصے ہیں ایک اس دنیاوی زندگی پر مشتمل ہے یہاں تک کہ موت آجائے اور دوسرا موت کے بعد اور عالم آخرت پر مشتمل ہے لیکن اس مطلب کی طرف توجہ دینا ضروری ہے کہ اس گفتگو کا یہ معنی نہیں ہے کہ دنیاوی زندگی سے دوسرا حصہ آخرت سے مربوط ہو بلکہ اُصولاً انسان دنیا میں جو کچھ بھی عمل انجام دیتا ہے وہ اعمال اس کی آخرت کی زندگی میں ضرور اثر انداز ہوتے ہیں، دنیاوی امور فقط اس دنیا سے مربوط نہیں ہیں ۔امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

" اَلْيَوْمَ عَمَلٌ وَ لَا حِسَابَ وَ إِنَّ غَداً حِسَابٌ وَ لَا عَمَلَ"

" آج عمل کرنے کا زمانہ ہے اور حساب و کتاب نہیں ہے کل حساب و کتاب کا زمانہ ہو گا عمل کرنے کا نہیں" (بحار الانوار: ج ۳۲ ص ۳۵۴)

لہٰذا دین اسی لیے آیا ہے کہ ہمیں زندگی گزارنے کا سلیقہ اور احکام سکھائے نہ یہ کہ دین اس لئے آیا ہے کہ جب ہم اس دنیا سے چلے جائیں، اس وقت ہمیں احکام اور زندگی کا سلیقہ سکھائے ۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس دنیا میں (مثلاً سو سال) ہم جو زندگی گزارتے ہیں کیا اس کے دو حصے ہیں کہ اس کا ایک حصہ دنیا سے اور دوسرا آخرت سے ہو مثلاً ابتدائی پچاس سال دنیا سے مربوط اور بعد کے پچاس سال آخرت سے مربوط ہوں، یا یہ کہ ہر چوبیس گھنٹوں میں دو حصے ہوں مثلاً دن دنیاوی امور سے ہو اور رات آخرت سے مربوط ہو، یا ہر رات دن میں پے در پے ایک گھنٹہ دنیاوی امور کیلئے اور ایک گھنٹہ آخرت کے امور کیلئے ہو یا یہ کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو آخرت سے مربوط نہ ہو اور ہمارا ہر دنیاوی عمل آخرت کی زندگی میں اثر انداز ہے یعنی ہر دنیاوی عمل آخرت کیلئے مفید ہے اور اسی طرح آخرت کیلئے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے اور ہر صورت میں ہماری آخرت پر اثر انداز ہوتا ہے؟ اسلامی نقطہ نظر سے ہمیں آخرت کی زندگی کو اس دنیا میں اپنے اعمال کے ذریعے سنوارنا ہے ۔"الدنیا مزرعة الاخرة"، "دنیا آخرت کی کھیتی ہے" ۔

یہاں پر جو بوئیں گے وہاں پر وہی کاٹیں گے اور ایسا ہر گز نہیں ہے کہ دنیاوی زندگی آخرت کی زندگی سے جدا ہو، جتنے کام بھی اس عالم میں ہم انجام دیتے ہیں، جیسے سانس لینا، آنکھ کھولنا اور بند کرنا، قدم اُٹھانا، بیٹھنا، سونا، اُٹھنا، دیکھنا، لوگوں سے ملنا جلنا، بات کہنا اور سننا، کھانا کھانا، از دواجی زندگی اور گھریلو روابط، افراد سے روابط، حکومت اور عوام کا رابطہ، یہ سب کچھ ہماری آخرت کیلئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری آخرت کیلئے خسارہ اور نقصان کا سبب بنیں ۔

پس ہماری دنیوی زندگی دو مستقل حصوں پر مشتمل نہیں ہے کہ ایک حصہ دنیا کیلئے اور دوسرا حصہ آخرت کیلئے ہو مثلاً کھانا کھانا،

 صحیح ہے کہ یہ دنیاوی زندگی سے مربوط ہے لیکن ممکن ہے یہی جہنم کی آگ کا سبب بن جائے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا

"جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں اور عنقریب وہ واصل جہنم ہونگے" (نساء۔۱۰)

ظاہراً ایسا ہے کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں اور پیٹ بھر رہے ہیں لیکن حقیقت میں وہ جو کھا رہے ہیں وہ ایسی آگ ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہوگی اور وہ اسی آگ میں جلیں گے اور یہی کھانا جو وہ کھا رہے ہیں ان کیلئے عذاب بن جائے گا لیکن اسی کھانا کھانے میں اگر کسی کی نیت یہ ہو کہ اس کے بدن کو تقویت پہنچے تا کہ خدا کی عبادت و اطاعت کر سکے، اس وقت ہی کھانا کھانا عبادت بن جائے گا اور اس شخص کو ثواب ملے گا اور اس کیلئے جنت کا سبب بن جائے گا، بدن کے اعضاء سے انجام پانے والا کوئی فعل نہیں ہے مگر یہ کہ ہر عمل آخرت میں سعادت کا سبب بن سکتا ہے (شرط یہ ہے کہ وہ خدا کیلئے ہو) اور ہر دنیاوی عمل ہماری عاقبت خراب ہونے کا بھی سبب بن سکتا ہے (اگر خدا کے احکام اور رضایت کے خلاف ہو) اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے انجام دینے یا نہ دینے سے کچھ اثر نہ پڑے (اگر فعل ایسے ہوں کہ جو مباح اور حلال کام ہیں جس کے انجام دینے یا نہ دینے میں کوئی رجحان نہ پایا جاتا ہو) بہر حال ایسا ہر گز نہیں ہے کہ ہماری زندگی کے دو مستقل حصے ہوں جس کا ایک حصہ مسجد، عبادت گاہ اور امام بارگاہ سے مخصوص ہو اور وہ آخرت سے مربوط ہو اور بقیہ افعال خود ہم سے مربوط ہوں اور ان کا آخرت سے کوئی ربط نہ ہو، اس کا خدا سے کوئی ربط نہ ہو، یہ وہی غلط فکر ہے جو مغربی دنیا میں چند صدیوں سے رائج ہوگئی ہے اور اس نے ذہنوں کو خراب کر دیا ہے اور رفتہ رفتہ یہی سوچ ہمارے اسلامی ملک اور مسلمانوں کے درمیان رائج ہو رہی ہے اور مسلمان ایسا سمجھنے لگے ہیں کہ دین صرف عبادت گاہ تک محدود ہے اور اس کا اثر بھی آخرت میں ہے اور دوسرے دنیاوی مسائل دین کے دائرہ سے خارج ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں ایسا ہر گز نہیں ہے (البتہ دوسرے مذاہب میں بھی ایسا نہیں تھا لیکن بعد میں جو تحریفیں یا غلط تفسیریں ہوئی ہیں ان کی وجہ سے ایسا سمجھا جانے لگا ہے) لیکن جو اسلام سے سمجھا گیا ہے، یہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں اس لئے پیدا کیا گیا ہے تا کہ آخرت میں اپنے لئے سعادت یا شقاوت کے اسباب مہیا کرے۔ سعادت یا شقاوت اسی دنیا کے عمل پر منحصر ہے اگر خدا کے حکم پر عمل کیا جائے تو ہمیشہ کیلئے سعادت حاصل ہو جائے گی لیکن اگر کوئی شخص خدا کے احکام کی مخالفت کرے تو اس کیلئے ہمیشہ کیلئے شقاوت اور عذاب ہے۔

جو لوگ دین کے بارے میں یہ سوال پیش کرتے ہیں کہ امور دنیا میں دین کا دخل زیادہ ہے یا کم؟ دین سے ہمیں کتنی اُمید ہونی چاہیے، انہوں نے اس سوال کے جواب میں مغالطہ کیا ہے، انہوں نے قبول کیا ہے کہ اس کیلئے صرف دو راستے ہیں، ایک یہ کہ ہم قبول کریں کہ دنیاوی تمام امور میں دین کا دخل ہے یہاں تک کہ دین ہم کو بتائے کہ کس طرح کھانا پکائیں، کس طرح کھانا کھائیں، کس طرح گھر بنائیں، کس طرح جہاز بنائیں، کس طرح کشتی بنائیں وغیرہ۔ روشن ہے کہ یہ بات غلط اور باطل ہے اس لئے کہ دین

جہاز بنانا نہیں سکھاتا۔ یا دوسرا راستہ یہ کہ دین سے بہت کم اُمید رکھی جائے کہ جس میں نماز اور روزہ، خدا اور بندہ کا معاملہ ہے اور یہ آخرت میں شامل ہیں، جو افعال دنیاوی امور سے مربوط ہیں ان میں حکومت اور سیاست کا مسئلہ بھی ہے جبکہ پہلا راستہ یقینا قابل قبول نہیں ہے لہٰذا حکومت وسیاست کا دین سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔

لہٰذا دوسرا راستہ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کا یہاں پر مغالطہ یہ ہے کہ اس مسئلہ کے صرف دو راہ حل ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ تیسرا راہ حل بھی موجود ہے اور یہی تیسرا راستہ درست ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ہم تمام چیزوں کو دین سے سیکھیں، یہاں تک کہ کھانا پکانے، کپڑا پہننے اور گھر بنانے کے طریقوں وغیرہ کو اور ایسا بھی نہیں ہے کہ دین صرف انسان اور خدا کے مابین رابطہ اور خاص حالات اور شرائط کیلئے ہو بلکہ حق بات یہ ہے کہ دنیا کے تمام امور اس وقت اہمیت رکھتے ہیں جب ان کے اثر کا آخرت میں حساب کیا جائے، یہی وہ مقام ہے کہ جہاں پر دین قضاوت کرتا ہے، عام فہم زبان میں یوں کہا جائے کہ دین حلال و حرام کو بیان کرتا ہے لیکن یہ کام کس طرح کیا جائے، یہ دین بیان نہیں کرتا مثلاً کھانا کھانے کے بارے میں کہ جس برتن میں کھا رہے ہیں وہ برتن چینی کا ہو یا کسی اور چیز کا، دین کو اس سے غرض نہیں ہے لیکن دین یہ کہتا ہے کہ بعض کھانے ایسے ہیں جن کا کھانا حرام اور گناہ ہے مثلاً سور کا گوشت کھانا حرام ہے، کتے کا گوشت کھانا حرام ہے، شراب پینا حرام ہے۔ کیونکہ یہ سب انسان کے تکامل میں اثر انداز ہوتے ہیں اور نقصان دہ ہیں لہٰذا اس طرح کی چیزوں کو کھانے پینے سے منع کیا گیا ہے پس کھانا کھانا اگرچہ دنیاوی امور میں ہے لیکن اس منظر سے کہ اس کا اثر ہوتا ہے اور یہ انسان کے کمال نہائی سے مربوط ہے، اس لئے دین نے اس کو بیان کیا ہے اور اس کے بارے میں احکام صادر کئے ہیں یا مثلاً آپ کے گھر کا دروازہ، کھڑکی، آلومینیم کا ہو یا لوہے کا اور اس طرح کی دوسری باتیں، اسلام بیان نہیں کرتا لیکن یہ کہتا ہے کہ غصبی زمین میں گھر نہ بنائیں، گھر ایسا نہ بنائیں کہ دوسروں سے اونچا ہو جس کے نتیجہ میں دوسروں کی ناموس پر نظر پڑے، حرام اور رشوت والے پیسوں سے گھر نہ بنائیں، کپڑا پہننے اور زینت کرنے سے اسلام کو ربط نہیں ہے کہ کس ماڈل کا کس رنگ کا ہو لیکن اسلام یہ بیان کرتا ہے کہ مرد کیلئے ریشمی اور خالص سونے کا لباس حرام ہے، مرد ہو یا عورت سب ایسے کپڑے پہنیں کہ شرم گاہ کو چھپا سکیں، اگر مرد ہو اس کیلئے سونے کی انگوٹھی اور دوسری زینت کی چیزیں حرام ہیں۔ سیر وتفریح کے بارے میں آپ پارک میں جائیں یا ایسے علاقے میں جائیں جو خوش آب و ہوا ہو یا سمندر کے کنارے جائیں، یہ اسلام سے مربوط نہیں ہیں لیکن اسلام یہ کہتا ہے کہ تمہاری تفریح میں حرام نہ ہو، لہو ولعب نہ ہو اس لئے کہ لہو ولعب حرام ہے، پس اسلام ہر اس فعل کو جو انسان کے تکامل یا عدم تکامل کا سبب بنے بیان کرتا ہے، مثبت اور منفی فائدہ اور نقصان کو بیان کرتا ہے، اسلام یہ بھی بیان کرتا ہے کہ کون سا فعل انسان کے کمال تک پہنچنے یا انسان کی پستی کی طرف جانے کا سبب بن سکتا ہے البتہ یہ فائدہ اور نقصان انسان کیلئے کبھی اتنا روشن ہوتا ہے کہ انسان کی عقل بھی اچھی طرح درک کر لیتی ہے، ایسے موارد میں دین کا بیان لازم نہیں ہے، حکم خدا کو عقل کے ذریعہ بھی سمجھا جا سکتا ہے، یہ وہی بحث ہے جو مستقلات عقلیہ کے عنوان سے فقہاء کے درمیان مشہور ہے، فقہا نے بیان کیا ہے کہ بعض مسائل میں مستقل طور پر عقل قضاوت کرتی ہے کہ ایک یتیم بچے سے روٹی کا ٹکڑا چھین کر کھا لینا برا اور ناپسندیدہ

کام ہے،ایسی جگہوں پر لازم نہیں ہے کہ ایک آیت یا روایات موجود ہو بلکہ عقل نے جو درک کیا ہے اس سے کشف ہو جاتا ہے کہ خدا کا ارادہ کیا ہے لیکن اکثر موارد میں عقل اتنی قدرت نہیں رکھتی ہے کہ اس فعل کی اہمیت اور انسان کی سعادت وشقاوت میں اس کے اثرات کو درک کر سکے اور یہ سمجھ سکے کہ یہ کام (اچھا ہے یا برا یا اس کی اہمیت کتنی ہے) واجب ہے یا حرام، مستحب ہے یا مکروہ یا مباح ہے ایسی جگہوں پر ضروری ہے کہ دین مداخلت کرے اور اس کے اثرات کو (یہ کام ہمارے کمال نہائی میں کتنا اثر انداز ہو سکتا ہے) بیان کرے۔ پس دین اور اسلام جیسا کہ نظریہ دین اقلی کے لوگ قائل ہیں (یعنی دین زندگی میں کم سے کم مداخلت کر سکتا ہے) ان کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ دین صرف آخرت کے متعلق بیان نہیں کرتا بلکہ کسب معاش، تجارت، رہن و اجارہ، ازدواج وطلاق، کھانے اور پینے کی چیزوں، کپڑا اور مکان، سیر وتفریح وغیرہ کو بھی بیان کرتا ہے اور اسلام نے ان موارد میں متعدد احکام بیان کئے ہیں، یہاں تک کہ اسلام نے سال اور مہینوں کے بارے میں بھی ہمارے لئے مشخص کر دیا ہے اور ہمیں ہمارے حال پر نہیں چھوڑ دیا ہے۔ فرض کیجئے کوئی اپنے گھر کو ایک سال کیلئے کرایہ پر دے تو سوال ہوگا کہ ایک سال میں کتنے مہینے ہیں؟ کتنے دن ہیں؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ سال میں انیس مہینے ہوتے ہیں، اور ہر مہینہ انیس دن کا ہوتا ہے! (جس کا مجموعاً ۳۶۱ دن ہوں) تو کیا واقعاً قرآن و اسلام میں سال اور مہینہ کا بھی تذکرہ ہوا ہے؟ جواب یہ ہے:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ

"اس میں تو شک ہی نہیں ہے کہ خدا نے جس دن آسمان و زمین کو پیدا کیا اسی دن سے خدا کے نزدیک خدا کی کتاب لوح محفوظ میں مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہیں ان میں سے چار مہینے (ادب وحرمت کے ہیں) یہی دین سیدھی راہ ہے"۔ (سورہ توبہ:۳۶)

قرآن اور اسلام نے آسمان پر چاند کے گھٹنے بڑھنے اور مسلمانوں کیلئے اس کے فائدہ کو بھی بیان کیا ہے:

يَسْـَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ

"اے رسولؐ! تم سے لوگ چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کیوں (گھٹتا بڑھتا ہے) تم کہہ دو کہ اس سے لوگوں کے دنیاوی امور اور حج کے اوقات معلوم ہوتے ہیں"۔ (سورہ بقرہ۔آیت ۱۸۹)

یہ چاند کہ جو مختلف شکلوں میں آسمان پر دکھائی دیتا ہے لوگوں کے عبادی اور حقوقی مسائل کے واضح ہونے کیلئے مفید ہے اور یہ اس لئے ہے تا کہ نماز و روزہ اور حج کیلئے اسی کو معیار قرار دیں اور حقوقی کاموں کیلئے بھی مفید ہے مثلاً کوئی کہے کہ میں آپ کو اتنے پیسے دو مہینے کیلئے قرض دے رہا ہوں، یا اس دکان کو نو مہینے کیلئے کرایہ پر دے رہا ہوں۔

اب عاقل اور منصف مزاج انسان خود فیصلہ کریں کہ وہ دین جس نے نماز، روزہ، حج، طہارت ونجاست کے ساتھ خرید و فروخت، رہن و اجارہ، ازدواج وطلاق، شوہر و بیوی کے روابط، بیٹے کے ماں باپ سے روابط، جنگ وصلح، دوسری ملتوں سے

روابط، یہاں تک کہ کھانے پینے، کپڑا پہننے، زینت کرنے، گھر بنانے، سیر وتفریح کرنے، یہی نہیں بلکہ مہینہ اور سال کو معین کرنے کے بارے میں بھی بیان کیا ہے، دین کی دنیاوی امور میں زیادہ مداخلت ہے یا کم؟ ایسا دین سیاسی ہے یا غیر سیاسی؟ دین نے معاشرتی اور سماج ومعاشرے کے نظم ونسق میں مداخلت کی ہے یا صرف شخصی اور عبادی امور کو بیان کیا ہے، آیا کوئی عقلمند انسان یہ قبول کرسکتا ہے کہ سور کا گوشت کھانا یا شراب پینا انسان کی سعادت یا شقاوت پر اثر انداز ہے لہٰذا صرف ان مسائل کو دین بیان کرتا ہے لیکن حکومت کیسی ہو اور معاشرے کا نظم ونسق کس طرح ہو اس کا آخرت پر کوئی اثر نہیں ہے لہٰذا اسلام ان امور میں مثبت یا منفی نظر نہیں بیان کرتا مثلاً وہ یہ کہتے ہیں کہ یزید کی حکومت اور امیر المومنینؑ کی حکومت میں کوئی فرق نہیں ہے اور اسلام نے اس بارے میں کوئی نظریہ پیش نہیں کیا ہے اور یہ صرف دو روش وطریقے تھے، یزید کو وہ طریقہ پسند تھا اس پر عمل کرتا تھا اور علیؑ کو یہ طریقہ پسند تھا لہٰذا اس پر عمل کرتے تھے۔ یہ سب دین سے مربوط نہیں ہیں، یزید کی حکومت کا طریقہ اور علیؑ کی حکومت کا طریقہ، نہ تو ان کی سعادت وشقاوت اور نہ ہی معاشرے کی سعادت وشقاوت میں اثر انداز ہے، یہ مسئلہ دنیاوی امور سے مربوط ہے، دین کا کام صرف انسانوں کی آخرت، جنت وجہنم کا بیان کرنا ہے یا اسی زمانے میں کیا کوئی کہہ سکتا ہے (کہ وہ حکومتیں جوان بچوں کو جو کسی بھی مذہب کے مطابق گناہگار نہیں ہیں، ان کا سر کاٹ دیتی ہیں یا زندہ دفن کر دیتی ہیں یا ان پر بمباری کرتی ہیں، ان کو نیست ونابود کر دیتی ہیں اور وہ حکومتیں کہ جو مظلوموں، کمزوروں کی خدمت کرتی ہیں) میری نظر میں دونوں حکومتیں مساوی ہیں اور حکومت کے یہ دو طریقے جنت وجہنم کے بارے میں کوئی اثر نہیں رکھتے ہیں، اس کا جواب مشکل نہیں اور تھوڑی سی دقت کافی ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ زمین پر چلنے والے تمام حیوانات سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بہرے، گونگے (کفار) ہیں جو تعقل نہیں کرتے" (سورہ انفال۔ آیت ۲۲)

خلاصہ یہ ہے کہ دین دنیاوی امور کو آخرت کے حساب سے دیکھتے ہوئے احکامات دیتا ہے اور دین وسیاست کی جدائی ممکن نہیں ہے کیونکہ سیاست معاشرتی امور کو چلانے کا نام ہے جس کے بارے میں دین نے باقاعدہ ایک نظام دیا ہے جو قرآن وسنت میں بھی موجود ہے اور رسول اللہؐ اور امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کی حکومت بھی اس پر شاہد ہے۔

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

مردہ باد امریکہ

۱۹۸۶ء کی بات ہے جب تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان کے قائد علامہ سید عارف حسین الحسینیؒ نے ۱۶ مئی کو "یوم مردہ باد امریکہ "منانے کا اعلان کیا۔ڈاکٹر محمد علی نقوی چونکہ علامہؒ صاحب کے دست راست تھے اس لئے انہوں نے اپنے قائد کے فرمان کا احترام کرتے ہوئے لاہور کے مظاہرے کی قیادت کی اور شاہراہ قائد اعظم (مال روڈ) پر واقع ایک معروف کاروباری مرکز "الفلاح بلڈنگ "کے اوپر چڑھ کر (DOWN WITH U.S.A) (مردہ باد امریکہ) کا طویل و عریض بینر لٹکایا۔

آئین پاکستان کا تعارف

مقدمہ

دستور اور آئین کسی بھی قوم کی تمناؤں اور امنگوں کا آئینہ دار اور ترجمان ہوتا ہے اور اس کی سوچ و فکر کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں جہاں عوام کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جاتی ہے۔ وہاں آئین کو قوم کی آزادی کا پروانہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ دستور ملک کے انتظامی ڈھانچے، عدلیہ کے نظام، سیاسی اداروں کی شکل وصورت کی وضاحت کرتا ہے، ملک کے اعلیٰ اداروں کے طریقہ کار اور انتظامیہ کے اختیارات پر روشنی ڈالتا ہے اور قوم کی منزل کی نشاندھی کرتا ہے۔ لہٰذا ملت کے ہر فرد کو آزادانہ اور آئین کے مطابق زندگی گزارنے کیلئے اس سے آشنائی انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہے تاکہ ملک وقوم اپنی ترقی کی منازل کو طے کر سکے۔ لہٰذا ہمیں بھی پاکستانی شہری ہونے کے ناطے آئین پاکستان سے آشنائی ہونی چاہیئے اسی بنا پر اس مقالے میں آئین پاکستان کی اسلامی بنیادوں اور اس کی بعض شقوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

آئین پاکستان کا تاریخی پس منظر اور اس کی اسلامی بنیادیں

برصغیر میں پہلی بار ٹھوس بنیادوں اور مضبوط دلائل کے ساتھ مسلم ریاست کا تصور علامہ اقبال (رہ) نے 1930ء میں اپنے تاریخی خطبہ الہ آباد میں پیش کیا تھا۔ اور 1940ء میں مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے اجلاس میں اس تصور کو اپنا سیاسی مطمع نظر بنایا اور ایک آزاد مسلمان ریاست کا حصول اس کا نصب العین قرار پایا۔ قائداعظم محمد علی جناح (رہ) کی زیر قیادت مسلم لیگ نے سات سال کی مختصر مدت میں اس تصور کو حقیقت بنا دیا اور 14 اگست 1947ء کو پاکستان کے نام سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت معرض وجود میں آ گئی۔

پاکستان کی جدو جہد میں مسلم لیگ نے عوام سے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوری مملکت ہوگی جس کی اساس اسلام کے معاشرتی عدل پر رکھی جائے گی اور مسلمان قانون خداوندی کے تحت اپنی زندگیاں بسر کرسکیں گے اور غیر مسلموں سے بھی مساوی سلوک کیا جائے گا۔

قائداعظم محمد علی جناح (رہ) نے 25 جنوری 1948ء کے کراچی بار ایسوسی ایشن کے اپنے خطاب میں فرمایا:

اسلامی قوانین آج بھی اسی طرح سے زندگی میں قابل اجراء ہیں جس طرح سے 1400 سال قبل تھے۔ اسلام نے ہمیں جمہوریت کی تعلیم دی۔ اسلام نے برابری، عدالت اور سب کے ساتھ مساوی سلوک کی تعلیم دی۔۔۔ہمیں [اسے آیندہ پاکستان کا آئین] بنانے دیجیئے۔ ہم اسے بنا کر رہیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے۔۔۔اس میں تردید نہیں کہ جب ہم اسلام کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو بعض لوگوں کو یہ اچھا نہیں لگتا۔(۱)

اسلام صرف رسم و رواج اور روحانی نظریات پر مشتمل نہیں بلکہ اسلام ہر مسلمان کی روزمرہ زندگی، حتی کہ سیاست اور اقتصاد اور اس جیسے دیگر موضوعات کیلئے بھی ضابطہ حیات ہے۔

علامہ محمد اقبال نے اپنے تاریخی خطبہ الہ آباد 29 دسمبر 1930ء میں فرمایا: اسلام فرد کی زندگی کو دین اور دنیا کے الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹتا۔ وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد ثنویت کا قائل نہیں ہے۔ اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، روح اور مادہ، کلیسا اور ریاست ایک ہی کل کے جزو ہیں، اور ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ اسلام یہ نہیں سکھلاتا کہ انسان آلائشوں سے لبریز اور ناپاک اس دنیا کا کوئی باشندہ ہے، جسے وہ کسی دوسری دنیا کی خاطر ترک کردے جہاں روح رہتی ہے، اسلام کے نزدیک مادہ روح کا وہ روپ ہے جو قیدِ مکان و زمان میں گھرا ہوا ہے۔ یورپ کی عیسائی ریاستوں کی زندگی سے مذہب عیسوی تقریباً خارج ہوگیا ہے۔ میری خواہش ہے (اور مجھے یقین ہے کہ) شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔

اگر ہم پاکستان کے آئین کی تاریخ کا تعاقب کریں تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ پاکستان کا دستور ایک طولانی عرصہ میں بہت پرُ پیچ راستوں کو طے کرنے کے بعد موجودہ صورت میں سامنے آیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا پہلا آئین دوسری دستور ساز اسمبلی نے 23 مارچ 1956ء میں منظور کیا۔ 14 اگست 1947ء سے 23 مارچ 1956ء تک تقریباً ساڑھے آٹھ سال کا عرصہ کسی بھی مملکت کی دستور سازی کے لئے طویل ترین مدتوں میں سے ایک مدت ہے۔

پاکستان کا موجودہ دستور 14 اگست 1973ء کو نافذ ہوا۔ اس بارے میں ڈاکٹر صفدر محمود نے لکھا ہے:

قومی اسمبلی نے پاکستان کے مستقل دستور کا مسودہ تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی 17 اپریل 1972ء کو تشکیل دی، جس کی سوچ بچار کے نتیجے کے طور پر موجودہ مسودہ آئین تیار ہوا۔ مسودہ دستور پہلی مرتبہ 2 فروری 1973ء کو قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ جس پر بحث ہوتی رہی اور اپوزیشن اور حکومت میں افہام و تفہیم کے ذریعے 10 اپریل 1973ء مسودہ دستور پاس ہوگیا۔ 12 اپریل

1973ء کو صدر مملکت نے اس کی منظوری دے دی اور 14 اگست 1973ء کو دستور ملک میں نافذ کر دیا گیا اور صدر مملکت اور وزیر اعظم، گورنر اور صوبائی کابینہ کے ارکان نے نئے آئین کے تحت حلف اٹھا لیا۔ (۲)

یہ آئین پاکستان کے عوام کو 26 سال کے بعد ملا ہے اور عوام کی آرزوں کا آئینہ دار ہے۔ اس لحاظ سے اس آئین کو گذشتہ دساتیر پر فوقیت حاصل ہے کہ اسے عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل دستور ساز اسمبلی نے تشکیل دیا اور متفقہ طور پر پوری قوم نے اسے قبول کیا۔

آئین پاکستان کا ڈھانچہ

پاکستان کا موجودہ آئین ایک تمہید بارہ حصوں اور ایک ضمیمہ (کہ جس میں جداول پیوست ہیں) پر مشتمل ہے۔ اسکا پہلا حصہ ابتدائیہ ہے اور دوسرے حصے میں بنیادی حقوق اور حکمت عملی کے اصولوں کو بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ تیسرا اور چوتھا حصہ وفاق اور صوبوں کے متعلق ہے اور پانچویں حصے میں وفاق اور صوبوں کے مابین تعلقات کو بیان کیا گیا ہے۔ اور چھٹا حصہ مالیات، جائیداد، معاہدات اور مقدمات کے متعلق آرٹیکلز پر مشتمل ہے۔ ساتویں حصے میں نظام عدالت اور آٹھویں حصے میں انتخابات سے متعلق شقوں کو قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی احکام کو حصہ نہم میں بیان کیا گیا ہے جبکہ ہنگامی احکام اور دستور میں ترامیم سے متعلق شقیں حصہ دہم اور یازدہم میں بیان ہوئی ہیں۔ اور آخری حصے میں متفرقات کو بیان کیا گیا ہے۔

آئین کے ڈھانچے کو بیان کرنے کے بعد اب اس کی بعض شقوں کو بیشتر آشنائی کے لئے بیان کیا جا رہا ہے۔

آئین پاکستان کی اسلامی بنیادیں

آئین کی تمہید اور ابتدائیہ جو کہ پورے آئین کا نچوڑ اور اس کے تمام مدنظر اہداف کی عکاسی کرتا ہے، میں اللہ تبارک وتعالی کو تکوینی اور تشریعی لحاظ سے حاکم مطلق اور قدرت کا منبع بیان کیا گیا ہے اور اسی بنا پر تشریعی حوالے سے خدا کے مقررہ کردہ اصول و قوانین جو کہ قرآن وسنت کی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں کو قانون سازی کا ملاک اور معیار قرار دیا گیا ہے اور اس بات کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ قرآن وسنت سے منافی کوئی بھی قانون پاکستان کا قانون بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ آئین پاکستان کی تمہید میں لکھا گیا ہے:

چونکہ اللہ تبارک تعالی ہی پوری کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور پاکستان کے جمہور کو جو اختیار و اقتدار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہوگا، وہ ایک مقدس امانت ہے؛ چونکہ پاکستان کے جمہور کی منشاء ہے کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے، جس میں مملکت اپنے اختیارات و اقتدار کو جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی؛ جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں پر جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پوری طرح

عمل کیا جائے گا؛ جس میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی امور میں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق، جس طرح قرآن پاک اور سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے، ترتیب دے سکیں؛ جس میں قرار واقعی انتظام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی سے اپنے مذاہب پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں؛۔۔۔

لہذا اب ہم جمہور پاکستان؛ قادر مطلق اللہ تبارک وتعالی اور اس کے بندوں کے سامنے اپنی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ؛ پاکستان کی خاطر عوام کی دی ہوئی قربانیوں کے اعتراف کے ساتھ، بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کے اس اعلان سے وفاداری کے ساتھ کہ پاکستان عدل عمرانی کے اسلامی اصولوں پر مبنی ایک جمہوری مملکت ہوگی۔۔۔اسے اپنا دستور تسلیم کرتے ہیں۔

اور اسی طرح ابتدائیہ میں پہلی اور دوسری شق میں اس کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے:

مملکت پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہوگی جس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوگا۔(۳) اور اسلام پاکستان کا مملکتی مذہب ہوگا۔ (۴)

جبکہ اسلامی احکام کے حصہ میں اس کی مزید وضاحت یوں کر دی گئی ہے۔آئین کے آرٹیکل نمبر-227الف میں لکھا ہے:

تمام موجودہ قوانین کو قرآن پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا، جن کا اس حصے میں بطور اسلامی احکام حوالہ دیا گیا ہے، اور ایسا کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو مذکورہ احکام کے منافی ہو۔

اور پاکستان میں مختلف مکاتب فکر کی موجودگی کی بنا پر اسلامی قوانین کو وضع کرنے کی مختلف تفاسیر کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تشریح یوں کر دی گئی ہے:

[کسی مسلم فرقے کے قانون شخصی پر اس شق کا اطلاق کرتے ہوئے، عبارت قرآن وسنت سے مذکورہ فرقے کی کی ہوئی توضیح کے مطابق قرآن اور سنت مراد ہوگی۔](۵)

پاکستان میں اسلامی قوانین کو قرآن وسنت سے ہماہنگ اور اس کے مطابق آئین سازی کے لئے ایک اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کا قیام عمل میں لایا گیا۔آئین کے آرٹیکل نمبر (1) -228 کے مطابق اس کے قیام کے بارے میں لکھا گیا ہے:

یوم آغاز سے نوے دن کی مدت کے اندر اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دی جائے گی جس کا اس حصے میں بطور اسلامی کونسل حوالہ دیا گیا ہے۔

اس اسلامی نظریاتی کونسل کی دیگر تفصیلات کو آئین کے مذکورہ آرٹیکل کے تحت اس طرح واضح کیا گیا ہے۔

(2) اسلامی نظریاتی کونسل کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ [بیس] ایسے ارکان پر مشتمل ہوگی جن کو صدر ان اشخاص میں سے مقرر کرے گا، جنہیں اسلام کے اصولوں اور فلسفے کا جس طرح کہ قرآن پاک اور سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے علم ہو یا پاکستان کے اقتصادی، سیاسی، قانونی اور انتظامی مسائل کا فہم وادراک ہو۔

(3) اسلامی کونسل کے ارکان مقرر کرتے وقت ان امور کا خیال رکھا جائیگا۔۔۔

(الف) جہاں تک قابل عمل ہو کونسل میں مختلف مکاتب فکر کو نمائندگی دی جائے گی۔

(ج) کم از کم چار ارکان ایسے ہوں جن میں سے ہر ایک کم سے کم پندرہ سال کی مدت سے اسلامی تحقیق یا تدریس کے کام سے وابستہ چلا آ رہا ہو۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی ذمہ داریاں

(الف) مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) اور صوبائی اسمبلیوں سے ایسے ذرائع اور وسائل کی سفارش کرنا جن سے پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر لحاظ سے اسلام کے ان اصولوں اور تصورات کے مطابق ڈھالنے کی ترغیب اور امداد ملے جن کا قرآن پاک اور سنت میں تعین کیا گیا ہے۔

(ب) کسی ایوان، کسی صوبائی اسمبلی، صدر یا کسی گورنر کو کسی ایسے سوال کے بارے میں مشورہ دینا جس میں کونسل سے اس بابت رجوع کیا گیا ہو کہ آیا کوئی مجوزہ قانون اسلامی احکام کے منافی ہے یا نہیں۔

(ج) ایسی تدابیر کہ جن سے نافذ العمل قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا نیز ان مراحل کی جن سے گذر کر محولہ تدابیر کا نفاذ عمل میں لانا چاہیئے، سفارش کرنا۔

(د) مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) اور صوبائی اسمبلیوں کی رہنمائی کے لئے اسلام کے ایسے احکام کی ایک موزوں شکل میں تدوین کرنا جنہیں قانونی طور پر نافذ کیا جاسکے۔

(3) جب کوئی ایوان، کوئی صوبائی اسمبلی، صدر یا گورنر، یہ خیال کرے کہ مفاد عامہ کی خاطر اس مجوزہ قانون کا وضع کرنا جس کے بارے میں سوال اٹھایا گیا تھا مشورہ حاصل ہونے تک ملتوی نہ کیا جائے، تو اس صورت میں مذکورہ قانون مشورہ مہیا ہونے سے قبل وضع کیا جاسکے گا: مگر شرط یہ ہے کہ جب کوئی قانون اسلامی کونسل کے پاس مشورے کے لئے بھیجا جائے اور کونسل یہ مشورہ دے کہ قانون اسلامی احکام کے منافی ہے تو ایوان، یا جیسی بھی صورت ہو، صوبائی اسمبلی، صدر یا گورنر اس طرح وضع کردہ قانون پر دوبارہ غور کرے گا۔

اسلامی قوانین کے نفاذ کی حکمت عملی کے اصول

آئین پاکستان میں فکری اور نظری مباحث کے بیان کے بعد اسلامی قوانین کے نفاذ کو عملی جامہ پہنانے کیلئے حکمت عملی کے اصول میں عملی اصولوں کو یوں بیان کیا گیا ہے۔ آئین کے آرٹیکل نمبر (1)-31 میں لکھا ہے:

پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر، اپنی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے مطابق مرتب کرنے کے قابل بنانے کے لئے اور انہیں ایسی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے جن کی مدد سے وہ

 قرآن پاک اور سنت کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھ سکیں۔

اور مذکورہ آرٹیکل کے بند نمبر (2) میں مملکت کے وظائف کو معین کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ:

پاکستان کے مسلمانوں کے بارے میں مملکت مندرجہ ذیل اقدامات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گی۔

(الف) قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دینا، عربی زبان سیکھنے کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس کے لئے سہولت بہم پہنچانا اور قرآن پاک کی صحیح اور من وعن طباعت اور اشاعت کا اہتمام کرنا؛

(ب) اتحاد اور اسلامی اخلاقی معیاروں کی پابندی کو فروغ دینا؛ اور

(ج) زکات، [عشر]، اوقاف اور مساجد کی باقاعدہ تنظیم کا اہتمام کرنا۔

اور اسی طرح مملکت کے مسلم ممالک اور دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات کے بارے میں آرٹیکل نمبر 40۔ میں لکھا گیا ہے کہ

مملکت اس بات کی کوشش کرے گی کہ اسلامی اتحاد کی بنیاد پر مسلم ممالک کے مابین برادرانہ تعلقات کو برقرار رکھا جائے اور مستحکم کیا جائے، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کے مشترک مفادات کی حمایت کی جائے، بین الاقوامی امن اور سلامتی کو فروغ دیا جائے، تمام قوموں کے مابین خیرسگالی اور دوستانہ تعلقات پیدا کئے جائیں اور بین الاقوامی تنازعات کو پرامن طریقوں سے طے کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

شہریوں کے بنیادی حقوق

بنیادی حقوق سے آشنائی بھی آئین کے مطابق آزادانہ زندگی گزارنے کیلئے نہایت ضروری ہے لہٰذا آئین کی چند ضروری شقوں کو بیان کیا جارہا ہے:

آرٹیکل نمبر 10۔ میں ایک بنیادی حق کو یوں بیان کیا گیا ہے:

(1) کسی شخص کو جسے گرفتار کیا گیا ہو مذکورہ گرفتاری کی وجوہ سے، جس قدر جلد ہو سکے، آگاہ کئے بغیر نہ تو نظر بند رکھا جائے گا اور نہ اسے اپنی پسند کے کسی قانون پیشہ شخص سے مشورہ کرنے اور اس کے ذریعہ صفائی کرنے کے حق سے محروم کیا جائے گا۔

(2) ہر اس شخص کو جسے گرفتار کیا گیا ہو اور نظر بند رکھا گیا ہو، مذکورہ گرفتاری سے چوبیس گھنٹہ کے اندر کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا لازم ہوگا ۔۔۔ اور ایسے کسی شخص کو کسی مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر مذکورہ مدت سے زیادہ نظر بند نہیں رکھا جائے گا۔

آرٹیکل نمبر 15 میں آزادانہ نقل وحرکت کے بارے میں کہا گیا ہے:

ہر شہری کو پاکستان میں رہنے اور مفاد عامہ کے پیش نظر قانون کے ذریعہ عائد کردہ کسی معقول پابندی کے تابع، پاکستان میں داخل ہونے اور اس کے ہر حصے میں آزادانہ نقل وحرکت کرنے اور اس کے کسی حصے میں سکونت اختیار کرنے اور آباد ہونے

کا حق ہوگا۔

اور پرامن احتجاج کے بارے میں آرٹیکل نمبر 16 میں لکھا گیا ہے کہ:

امن عامہ کے مفاد میں قانون کے ذریعہ عائد کردہ پابندیوں کے تابع، ہرشہری کو پرامن طور پر اور اسلحہ کے بغیر جمع ہونے کا حق ہوگا۔

ایک اور آرٹیکل میں ہر شہری کو انجمنیں اور یونینیں بنانے کا حق دیا گیا ہے آرٹیکل نمبر (1) 17 یہ ہے:

[پاکستان کی حاکمیت اعلی یا سالمیت، امن عامہ یا اخلاق] کے مفاد میں قانون کے ذریعے عائد کردہ معقول پابندیوں کے تابع، ہرشہری کو انجمنیں یا یونینیں بنانے کا حق ہوگا۔

اور اسی طرح ہرشہری کو تقریر اور اظہار خیال کی آزادی کا حق بھی دیا گیا ہے آئین میں ہے کہ:

اسلام کی عظمت یا پاکستان یا اس کے کسی حصہ کی سالمیت، سلامتی یا دفاع، غیر ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات، امن عامہ، تہذیب یا اخلاق کے مفاد کے پیش نظر یا توہین عدالت، کسی جرم [کے ارتکاب] یا اس کی ترغیب سے متعلق قانون کے ذریعے عائد کردہ مناسب پابندیوں کے تابع، ہرشہری کو تقریر اور اظہار خیال کی آزادی کا حق ہوگا اور پریس کی آزادی ہوگی۔(۶)

آئین میں ہرشہری کو اپنے مذہب کی پیروی اور اس پر عمل اور تبلیغ کا بھی حق دیا گیا ہے آئین کے آرٹیکل نمبر 20۔ میں آیا ہے کہ:

قانون، امن عامہ اور اخلاق کے تابع،۔۔۔(الف) ہرشہری کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق ہوگا؛ اور

(ب) ہر مذہبی گروہ اور اس کے ہر فرقے کو اپنے مذہبی ادارے قائم کرنے، برقرار رکھنے کیلئے ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔

اور اسی ضمن میں آرٹیکل نمبر 21۔ میں بیان ہوا ہے کہ کسی شخص کو کوئی ایسا خاص محصول ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جس کی آمدنی اس کے اپنے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب کی تبلیغ و ترویج پر صرف کی جائے گی۔

تعلیمی اداروں میں تعلیم پانے والے افراد کو مذہبی آزادی کے بارے میں آرٹیکل نمبر 22 میں یہ حق تمام شہریوں کو دیا گیا ہے:

(1) کسی تعلیمی ادارے میں تعلیم پانے والے کسی شخص کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے یا کسی مذہبی تقریب میں حصہ لینے یا مذہبی عبادت میں شرکت کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اگر ایسی تعلیم، تقریب یا عبادت کا تعلق اس کے اپنے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب سے ہو۔

(3) قانون کے تابع (الف) کسی مذہبی فرقے یا گروہ کو کسی تعلیمی ادارے میں جو کلی طور پر اس فرقے یا گروہ کے زیر اہتمام چلایا جاتا ہو، اس فرقے یا گروہ کے طلبا کو مذہبی تعلیم دینے کی ممانعت نہ ہوگی۔

نظری اور عملی اصولوں کی مباحث اور بنیادی حقوق کے بیان کے بعد پاکستان کے انتظامی ڈھانچے پر بھی ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں۔ پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہے جسے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آئین کا اطلاق پاکستان کے درج ذیل علاقوں پر ہوتا ہے۔

(الف) صوبہ ہائے بلوچستان، خیبر پختونخواہ، پنجاب اور سندھ

(ب) اسلام آباد کا علاقہ دارالحکومت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(ج) وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقے

(د) وہ تمام ریاستیں اور علاقے جو اس وقت پاکستان میں موجود ہیں یا جنہیں پاکستان میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ خواہ یہ شمول بصورت الحاق ہو یا کسی اور طریقے سے۔

اور آئین میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ مجلس شوری (پارلیمنٹ) مناسب شرائط وغیرہ کے تحت نئی ریاستوں یا علاقوں کو وفاق میں شامل کرسکتی ہے۔

صدر

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا سربراہ صدر مملکت ہوگا۔ جو مملکت کے اتحاد کا نمائندہ ہوگا۔ (۷) پاکستان کا موجودہ نظام حکومت چونکہ پارلیمانی طرز کا ہے اس لئے صدر مملکت کے اختیارات محدود ہیں اور اصل قدرت کا سرچشمہ وزیراعظم ہے جو قوم کا صحیح لیڈر اور قائد تصور ہوتا ہے۔

صدر کے انتخاب کی شرائط

پاکستان کے صدر کے انتخاب کے لئے درج ذیل شرائط رکھی گئی ہیں:

1۔ وہ مسلمان ہو

2۔ عمر پینتالیس سال سے کم نہ ہو۔

3 . قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کا اہل ہو یعنی قومی اسمبلی کی رکنیت کی شرائط پر پورا اترتا ہو۔ (۸)

صدارت کی میعاد

آئین کی رو سے صدر کے عہدے کی میعاد صدارت پر متمکن ہونے کے دن سے پانچ سال تک ہوگی۔ آئین کے آرٹیکل نمبر (1) 44 میں لکھا ہے: دستور کے تابع، صدر اس دن سے جس دن وہ اپنا عہدہ سنبھالے گا، پانچ سال کی مدت تک اپنے عہدے پر فائز رہے گا۔

صدر کے عہدے پر فائز کوئی شخص، اس عہدے کے لئے دوبارہ انتخاب کا اہل ہوگا لیکن کوئی شخص دو متواتر میعادوں سے زیادہ اس عہدے پر فائز نہیں ہوگا۔

صدر کے فرائض و اختیارات

پاکستان کا موجودہ دستور پارلیمانی نظام حکومت کا علمبردار ہے اور اس نظام میں صدر مملکت کے اختیارات بہت محدود ہیں۔ چنانچہ دستور کے آرٹیکل نمبر 48 کے شروع میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ صدر مملکت اپنے فرائض کی ادائیگی کے ضمن میں وزیر اعظم یا کابینہ کے مشوروں کا پابند ہوگا۔ 1985 کی آٹھویں ترمیم کے مطابق صدر، وزیر اعظم یا کابینہ کے کسی فیصلے کو نظر ثانی کیلئے واپس بھجوا سکتا ہے۔ البتہ نظر ثانی کے بعد اسے جو بھی مشورہ موصول ہو اس پر عمل درآمد کرنا ہی ہوگا۔

دستور کے آرٹیکل 54 کے مطابق وقتاً فوقتاً قومی اسمبلی یا سینٹ یا دونوں کے مشترکہ اجلاس بلانے اور ملتوی کرنے کا اختیار صدر کو حاصل ہے۔ صدر مملکت پارلیمنٹ کے کسی بھی ایوان سے خطاب کر سکتا ہے۔

قانون سازی کے ضمن میں بھی صدر کے اختیارات محدود ہیں۔ قانون سازی کے شعبے میں صدر کا صرف ایک اختیار حتمی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کسی معاملے میں یہ شبہ ہو کہ اس کا تعلق وفاقی فہرست کے حصہ اول سے ہے یا نہیں تو اس ضمن میں صدر کا فیصلہ آخری ہوگا۔

صدر مملکت کو حالات کے تقاضوں کے پیش نظر آرڈی نینس نافذ کرنے کا بھی اختیار دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ قومی اسمبلی کا اجلاس نہ ہو رہا ہو۔ آرڈیننس کی حیثیت قانون کی سی ہوتی ہے اور اس کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے۔

صدر، وزیر اعظم کے انتخاب کے بعد اسے وزارت بنانے کی دعوت دے گا اور تمام وزراء سے بشمول وزیر اعظم حلف وفاداری لے گا۔ اٹارنی جنرل اور گورنر کی تقرری کا اختیار بھی صدر کو حاصل ہوگا۔ علاوہ ازیں صدر قومی اقتصادی کونسل، کونسل برائے مشترکہ مفادات اور نیشنل فنانس کمیشن مقرر کرے گا۔ صدر کو اعلیٰ افسران کی تقرری کے ضمن میں یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ وزیر اعظم کے مشورے سے پاکستان کے آڈیٹر جنرل، چیف الیکشن کمشنر، اسلامی نظریاتی کونسل، چیف جسٹس اور سپریم کورٹ کے دوسرے ججوں کا تقرر کرے۔ افواج پاکستان کے ضمن میں صدر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کمیشن عطا کرے۔ بری، بحریہ اور فضائیہ کو ترقی دے اور انہیں قائم رکھے۔ علاوہ ازیں بری، بحریہ اور فضائیہ کے چیف آف دی سٹاف کا تقرر وزیر اعظم کے مشورے سے کرے۔ اسی طرح صدر مملکت صوبائی گورنر بھی وزیر اعظم کے مشورے سے ہی مقرر کرنے کا پابند ہے۔

دستور کے آرٹیکل نمبر 232 کے مطابق ملک میں ہنگامی حالات ایمرجنسی کے اعلان کا اختیار بھی صدر مملکت کو دیا گیا ہے۔ اگر صدر مطمئن ہو کہ ملک میں سنگین نوعیت کے ہنگامی حالات پائے جاتے ہیں اور وطن عزیز کا وجود خطرے میں ہے یا جنگ کے شعلے لپک رہے ہیں یا اندرونی خلفشار سنگین صورت اختیار کر گیا ہے اور حکومت حالات پر قابو نہیں پا سکی تو وہ ہنگامی حالات کا اعلان کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر صدر مملکت کو اطلاع ملے کہ کوئی صوبائی حکومت انتظامی مشینری کو آئین کے مطابق چلانے میں ناکام رہی ہے

یا اس ضمن میں پارلیمنٹ ریزولیشن پاس کرے تو صدر مملکت صوبائی حکومت کے اختیارات خود سنبھال سکتا ہے یا گورنر کو اپنی جانب سے یہ حکم دے سکتا ہے کہ وہ صوبائی حکومت کے اختیارات سنبھال لے۔

وزیر اعظم

پارلیمانی نظام حکومت میں وزیر اعظم اختیارات کا سرچشمہ ہوتا ہے وہ انتظامیہ کا سربراہ اور قوم کا قائد سمجھا جاتا ہے۔ وہ پارلیمنٹ میں اکثریتی جماعت کا لیڈر ہوتا ہے۔ اس لئے قوم کی رہنمائی کی ذمہ داری بھی اس پر عائد ہوتی ہے۔ وزیر اعظم وہ مرکزی نقطہ ہوتا ہے جس کے ارد گرد ملک کی ساری مشینری گھومتی ہے۔ اگرچہ وہ سربراہ مملکت نہیں ہوتا تاہم وہ صدر سے زیادہ بااختیار ہوتا ہے۔

1985ء میں دستور میں وزیر اعظم کے انتخاب کا طریقہ یہ ہے کہ صدر مملکت کسی ایسے رکن اسمبلی کو وزیر اعظم بننے کی دعوت دیں گے جسے واضح طور پر اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے قومی اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے گا اور آرٹیکل 91(2)(A) کے مطابق صدر مملکت کسی ایسے شخص کو وزیر اعظم بننے کی دعوت دے گا جسے اکثریت کی حمایت حاصل ہو۔ دوسرے الفاظ میں قومی اسمبلی میں جو سیاسی جماعت اکثریت کی حمایت رکھتی ہو یعنی اکثریتی پارٹی ہو اس کے سربراہ کو یہ دعوت دی جائے گی۔ کیونکہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہوتے ہیں اس لئے جو جماعت اکثریتی نشتیں حاصل کرتی ہے اس کا سربراہ ہی وزیر اعظم بنتا ہے۔

وزیر اعظم بے پناہ اختیارات کا حامل ہوتا ہے اس بات کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ باقی وزراء اس کے رحم و کرم پر ہوں گے اور وہ جس کو چاہے عہدے سے سبکدوش کر سکتا ہے۔

مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ)

پارلیمنٹ مملکت کا سب سے زیادہ بااختیار ادارہ تصور کی جاتی ہے۔ ملک کی انتظامیہ، وزیر اعظم اور دوسرے وزراء پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں اور پارلیمنٹ ہی وزیر اعظم منتخب کرتی ہے۔ انگلستان میں تو پارلیمنٹ کے اختیارات کے متعلق یہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ ہر قسم کا قانون بنا سکتی ہے حتیٰ کہ عورت کو مرد بھی کہہ سکتی ہے اور اسے بہر حال قانون کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ پاکستان کی پارلیمنٹ اسلام کے منافی کوئی قانون نہیں بنا سکتی اس لئے اسلامی جمہوریہ کی پارلیمنٹ اسلام کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے آزادی کے ساتھ قانون بنانے کی مجاز ہوگی۔

آرٹیکل نمبر 50 کے تحت پاکستان کی ایک مجلس شوری (پارلیمنٹ) ہوگی جو صدر اور دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی جو بالترتیب قومی اسمبلی اور سینٹ کے نام سے موسوم ہوں گے۔ اور آرٹیکل نمبر 52 کے مطابق قومی اسمبلی، تاوقتیکہ قبل از وقت توڑ نہ دی

جائے، اپنے پہلے اجلاس کے دن سے پانچ سال کی میعاد تک برقرار رہے گی اور اپنی میعاد کے اختتام پر ٹوٹ جائے گی۔

پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں سے قومی اسمبلی زیادہ بااختیار ادارہ ہے اور اسے قانون سازی اور مالی امور میں تقریباً فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔

اٹھارویں ترمیم کے تحت قومی اسمبلی کی نشستوں کی تعداد 342 ہے جس میں خواتین کے لئے اور غیر مسلموں کے لئے مخصوص نشستیں بھی شامل ہیں۔

مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے ارکان کے لئے اہلیت کی شرائط

آرٹیکل نمبر 62 کے مطابق کوئی شخص مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا رکن منتخب ہونے یا چنے جانے کا اہل نہیں ہوگا اگر:

(الف) وہ پاکستان کا شہری نہ ہو؛

(ب) وہ قومی اسمبلی کی صورت میں، پچیس سال سے کم عمر کا ہو اور کسی انتخابی فہرست میں ووٹر کی حیثیت سے۔۔۔

(اول) پاکستان کے کسی حصہ میں، کسی عام نشست یا غیر مسلموں کے لئے مخصوص کسی نشست پر انتخاب کے لئے درج نہ ہو؛ اور

(دوم) کسی صوبہ میں ایسے علاقہ میں جہاں سے وہ خواتین کے لئے مخصوص نشست پر انتخاب کے لئے رکنیت چاہتا ہو، درج نہ ہو،

(ج) وہ سینٹ کی صورت میں، تیس سال سے کم عمر کا ہو اور کسی صوبے میں کسی علاقے میں یا، جیسی بھی صورت ہو، وفاقی دارالحکومت یا وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات میں جہاں سے وہ رکنیت چاہتا ہو بطور ووٹر درج نہ ہو؛

(د) وہ اچھے کردار کا حامل نہ ہو اور عام طور پر احکام اسلام سے انحراف میں مشہور ہو؛

(ہ) وہ اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم نہ رکھتا ہو اور اسلام کے مقرر کردہ فرائض کا پابند نیز کبیرہ گناہوں سے مجتنب نہ ہو؛

(و) وہ سمجھدار، پارسا نہ ہو اور فاسق ہو اور ایماندار اور امین نہ ہو؛

(ز) کسی اخلاقی پستی میں ملوث ہونے یا جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں سزا یافتہ ہو؛

(ح) اس نے قیام پاکستان کے بعد ملک کی سالمیت کے خلاف کام کیا ہو یا نظریہ پاکستان کی مخالفت کی ہو؛

اسلامی دفعات والی شقیں غیر مسلم پر لاگو نہیں ہوں گی۔

نااہلیتیں

جہاں دستور میں رکن اسمبلی کے لئے کچھ شرائط رکھی جاتی ہیں وہاں ان خرابیوں کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو کسی شہری کو اس اعزاز سے محروم کر دیتی ہے۔ آرٹیکل نمبر 63 میں ان نااہلیتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اختصار کی بنا پر ان میں سے بعض کو ذکر کرتے ہیں۔ لہٰذا تفصیلی مطالعے کے لئے آئین پاکستان کا مطالعہ کیجئے۔

(1) کوئی شخص مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے رکن کے طور پر منتخب ہونے یا چنے جانے اور رکن رہنے کے لئے نااہل ہوگا، اگر۔۔۔

(الف) وہ فاتر العقل ہو اور کسی مجاز عدالت کی طرف سے ایسا قرار دیا گیا ہو؛ یا

(ب) وہ غیر برات یافتہ دیوالیہ ہو؛ یا

(ج) وہ پاکستان کا شہری نہ رہے اور کسی بیرونی ریاست کی شہریت حاصل کرے؛ یا

(د) وہ پاکستان کی ملازمت میں کسی منفعت بخش عہدے پر فائز ہو ماسوائے ایسے عہدے کے جسے قانون کے ذریعے ایسا عہدہ قرار دیا گیا ہو، جس پر فائز شخص نااہل نہیں ہوتا؛ یا

(ہ) اگر وہ کسی ایسی آئینی ہیئت یا کسی ایسی ہیئت کی ملازمت میں ہو جو حکومت کی ملکیت یا اس کے زیرِ نگرانی ہو یا جس میں حکومت تعدیلی حصہ یا مفاد رکھتی ہو؛ یا

(ز) وہ کسی ایسی رائے کی تشہیر کر رہا ہو یا کسی ایسے طریقے پر عمل کر رہا ہو جو نظریہ پاکستان یا پاکستان کے اقتدار اعلیٰ، سالمیت یا سلامتی یا اخلاقیات، یا امن عامہ کے قیام یا پاکستان کی عدلیہ کی دیانتداری یا آزادی کے لئے مضر ہو، یا جو پاکستان کی مسلح افواج یا عدلیہ کو بدنام کرے یا اس کی تضحیک کا باعث ہو؛

(ح) وہ کسی مجاز سماعت عدالت کی طرف سے فی الوقت نافذ العمل کسی قانون کے تحت بدعنوانی، اخلاقی پستی یا اختیار یا اتھارٹی کے بے جا استعمال کے جرم میں سزا یافتہ ہو؛

صوبائی گورنر

پاکستان چار صوبوں پر مشتمل ہے اور ان صوبوں کے سربراہ گورنر ہوتے ہیں، جن کا تقرر وزیر اعظم کے مشورے سے صدر مملکت کرتا ہے۔ صوبائی گورنر صوبوں میں صدر مملکت کے نمائندے ہوتے ہیں اور اسی کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ دستور کے مطابق صوبوں میں ان کی وہی سیاسی اور انتظامی حیثیت ہوتی ہے جو صدر مملکت کی پورے ملک میں ہوتی ہے۔ جس طرح صدر سے سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ عملی سیاست سے بلند ہو کر ملک کی تمام سیاسی جماعتوں اور عوام کے تمام طبقوں سے یکساں رویہ اور سلوک روا رکھے گا، بعینہ یہ توقع صوبائی معاملات میں گورنر سے وابستہ ہوتی ہے۔

وزیر اعلیٰ

صوبائی حکومت وزیر اعلیٰ اور دوسرے صوبائی وزراء پر مشتمل ہوگی اور یہ حکومت وزیر اعلیٰ کے ذریعے اپنے فرائض سرانجام دی گی۔ اسی طرح آئین کے مطابق صوبہ میں انتظامی اختیارات کا استعمال گورنر کے نام سے صوبائی حکومت کرے گی۔

چونکہ صوبائی حکومت وزیر اعلیٰ کی شخصیت کے گرد گھومے گی اس لئے درج بالا سطور سے وزیر اعلیٰ کی اہمیت و اختیارات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔صوبائی حکومت کے ضمن میں وزیر اعلیٰ کی تقریباً وہی حیثیت اور مقام ہوگا جو وفاقی حکومت میں وزیر اعظم کو میسر ہے۔گورنر کی حیثیت رسمی سربراہ کی ہوگی جبکہ اصلی اختیارات کا سرچشمہ وزیر اعلیٰ ہوگا جو قوم کا منتخب کردہ لیڈر اور صوبائی اسمبلی میں قائد ایوان بھی ہوگا۔

آرٹیکل نمبر 131 کے مطابق وزیر اعلیٰ پر لازم ہے کہ وہ گورنر کو ان تمام انتظامی امور، کابینہ کے فیصلوں اور قانون سازی کی تجاویز سے آگاہ رکھے، جو اس کی حکومت اسمبلی کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہے۔آئین کے مطالعے سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ گورنر اور وزیر اعلیٰ میں اس کے علاوہ اور کوئی رشتہ یا تعلق باقی نہیں رہتا سوائے اس کے کہ وہ گورنر کو حالات سے آگاہ رکھے۔

صوبائی اسمبلیاں

جہاں پارلیمنٹ سارے ملک کے لئے قانون ساز ادارہ ہوتی ہے، وہاں صوبائی اسمبلیاں اپنے اپنے صوبوں کے لئے دستور کی حدود میں قانون سازی کرتی ہیں اور عوام کی نمائندگی کرتی ہیں۔قانون سازی کے مقصد کے لئے دو فہرستیں تیار کرلی گئی ہیں۔جن کا نام وفاقی امور کی فہرست اور متصلہ امور کی فہرست ہے۔پارلیمنٹ دونوں فہرستوں کے اوپر قانون سازی کرسکتی ہے جبکہ صوبائی اسمبلی متصلہ امور پر قانون سازی کرسکتی ہے اور ان امور پر قانون سازی کا مکمل اختیار رکھتی ہے جن کا ذکر دونوں فہرستوں میں نہیں۔

پاکستان چار صوبائی اسمبلیوں پر مشتمل ہے۔صوبائی اسمبلی کی میعاد پانچ سال ہے جو اس کے پہلے اجلاس کے پہلے دن سے شمار ہوگی۔میعاد پر اسمبلی خود بخود ختم ہوجائے گی۔

آرٹیکل نمبر 113۔کے تحت صوبائی اسمبلی کی اہلیت اور نااہلیت کا معیار یوں ذکر کیا گیا ہے:

آرٹیکل 62 اور 63 میں مندرج قومی اسمبلی کی رکنیت کے لئے اہلیت اور نااہلیت کا کسی صوبائی اسمبلی کے لئے بھی اسی طرح اطلاق ہوگا گویا کہ اس میں قومی اسمبلی کا حوالہ صوبائی اسمبلی کا حوالہ ہو۔

عدلیہ

آزاد عدلیہ کسی بھی ملک میں جمہوریت کی روح اور عوام کے حقوق کی ضامن سمجھی جاتی ہے اس لئے عدلیہ کے مربوط نظام کے بغیر کوئی دستور مکمل دستور نہیں کہلا سکتا۔عدلیہ کی سب سے اہم ضرورت اور اہمیت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ یہ ان حقوق، آزادیوں اور مراعات کی حفاظت کرتی ہے جو دستور کی جانب سے عوام کو دیئے جاتے ہیں۔خاص طور پر بنیادی حقوق کی نگرانی تو عدلیہ کا بنیادی فرض ہے۔علاوہ ازیں عدلیہ ملکی قوانین کا تجزیہ کرتی ہے اور یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کوئی قانون دستور کے منافی تو نہیں۔

 اس طرح سے عدلیہ کا ایک اہم کام دستور کی حفاظت بھی ہوتا ہے۔صرف عدلیہ ہی ملک کے بڑے حاکم سے باز پرس کر سکتی ہے اور اس کے احکامات اور اقدامات کو، اگر وہ دستور کے منافی ہوں، تو غیر قانونی قرار دے سکتی ہے۔

پاکستان بنیادی طور پر وفاق ہے جو چار صوبوں پر مشتمل ہے۔ یہاں صوبوں کے مابین اور صوبوں اور مرکز کے مابین اکثر غلط فہمیوں کا امکان موجود رہتا ہے۔ دستور نے صوبوں اور مرکز کے دائرہ کار اور اختیارات کی تخصیص کر دی ہے اور اگر ان میں کسی معاملے پر اختلاف رائے ہو تو صرف سپریم کورٹ ہی فیصلہ صادر کر سکتی ہے۔ اس لئے عدلیہ کا وجود انتہائی اہم بلکہ ناگزیر ہے۔

اکثر وفاقی ممالک میں عدلیہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایک عدلیہ وفاقی قانون کے لئے اور دوسری صوبائی قوانین کے لئے۔لیکن پاکستان کے عدلیہ کے نظام کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہاں تمام ملک کے لئے عدلیہ کا ایک ہی مربوط نظام ہے جو صوبوں سے لے کر مرکز تک پھیلا ہوا ہے اور جسے سپریم کورٹ کنٹرول کرتی ہے۔

آئین پاکستان کے آرٹیکل نمبر 175 کے مطابق سارے ملک کے لئے ایک سپریم کورٹ ہو گی اور صوبوں کے لئے الگ الگ ہائی کورٹ ہوں گی۔عدالتوں کا دائرہ اختیار دستور اور قانون کے ذریعے متعین کیا جائے گا۔

سپریم کورٹ آف پاکستان

سپریم کورٹ ایک چیف جسٹس اور کچھ ججوں پر مشتمل ہو گی جن کی تعداد کا تعین پارلیمنٹ یا صدر مملکت کرے گا۔چیف جسٹس کا تقرر صدر مملکت کرے گا اور دوسرے ججوں کا تقرر صدر مملکت چیف جسٹس کے مشورے سے کرے گا۔

ہائی کورٹ

دستور کے مطابق صوبائی سطح پر ہائی کورٹ ہوتی ہے جو ایک چیف جسٹس اور کچھ ججوں پر مشتمل ہو گی، جن کی تعداد کا تعین قانون کے مطابق کیا جائے گا۔عام طور پر ہائی کورٹ کا دائرہ اختیار اپنے صوبے تک محدود ہوتا ہے۔لیکن آرٹیکل نمبر 192 کی شق نمبر 4 کے مطابق پارلیمنٹ قانون کے ذریعے ہائی کورٹ کا دائرہ اختیار کسی بھی علاقے تک پھیلا سکتی ہے۔

سپریم جوڈیشل کونسل

آئین پاکستان کے آرٹیکل نمبر 209 کے تحت سپریم جوڈیشل کونسل آف پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جو چیف جسٹس سپریم کورٹ کے علاوہ سپریم کورٹ کے دو سینئر ترین ججوں اور ہائی کورٹس کے دو سینئر ترین چیف جسٹسوں پر مشتمل ہو گی۔

وفاقی شرعی عدالت

پاکستان کے کسی شہری کی درخواست پر یا مرکزی یا صوبائی حکومت کی درخواست پر وفاقی شرعی عدالت اس مسئلے کا جائزہ لے کر فیصلہ کرے گی کہ آیا کوئی قانون یا قانونی شق، اسلامی قانون قرآن مجید یا سنت کے خلاف ہے۔ وفاقی شرعی عدالت آٹھ مسلمان ججوں پر مشتمل ہے جس میں چیف جسٹس بھی شامل ہے۔

حوالہ جات

(1) Sharif al Mujahid, Ideological foundations of Pakistan, Shariah Academy, Islamabad, 2nd Ed, 2012 p. 19-20.

(۲) ڈاکٹر صفدر محمود، آئین پاکستان 1973، جہانگیر بکس، ص 41۔

(۳) آرٹیکل نمبر 1۔

(۴) آرٹیکل نمبر 2۔

(۵) فرمان دستور (ترمیم سوم) 1980 فرمان صدر نمبر 14 مجریہ 1980ء) کے آرٹیکل 2 کی رو سے تشریح کا اضافہ کیا گیا۔

(۶) آرٹیکل نمبر 19۔

(۷) آرٹیکل نمبر 41۔(1)

(۸) آرٹیکل نمبر 41۔(2)

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

میڈیا کو جہت دینا

۲۰ ستمبر ۱۹۸۰ء کی رات جب امریکہ کے اشارہ پر عراق نے ایران پر جارحیت کی تو صبح کی نشریات میں بی بی سی نے حملہ کی خبر نشر کر دی۔ ڈاکٹر محمد علی نقوی ؒ اس وقت اپنے گھر میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ جونہی آپ نے عراقی جارحیت کی خبر سنی، ایک دم تڑپے اور ناشتہ چھوڑ دیا۔ پریشانی کے انہی لمحات میں آپ نے فوراً روزنامہ نوائے وقت لاہور کے چیف ایڈیٹر حمید نظامی کو فون کیا اور ان پر گفتگو کے دوران واضح کیا کہ "یہ جنگ سامراج کے اشارہ پر مسلط کی جارہی ہے اور امریکہ ایران سے نہیں بلکہ اسلام سے شکست کا بدلہ لینا چاہتا ہے لہٰذا ایسے میں بحیثیت ایک مسلم میں آپ سے اپیل کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ آپ اسلامی انقلاب کا بھرپور دفاع کریں اور مغربی ذرائع ابلاغ کا منہ توڑ جواب دیں"۔

شبہات اور ان کے جوابات

صحابہ کرامؓ کے بارے میں شیعوں کا کیا نظریہ ہے؟

جواب: شیعوں کے نزدیک پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھنے اور انکی مصاحبت سے شرفیاب ہونے والے افراد چند گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں لیکن اس بات کی وضاحت سے قبل بہتر یہ ہے کہ لفظ ''صحابی'' کو واضح کر دیا جائے صحابی پیغمبرؐ کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں یہاں ہم ان میں سے بعض تعریفوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ: ''صحابی'' وہ ہے جو ایک یا دو سال تک پیغمبر خداؐ کی خدمت میں رہا ہو اور اس نے آنحضرتؐ کی ہمراہی میں ایک یا دو جنگیں بھی لڑی ہوں۔(۱)

۲۔واقدی کہتے ہیں کہ: علماء کے نزدیک ہر وہ شخص رسولؐ کا صحابی شمار ہوتا ہے جس نے آنحضرتؐ کو دیکھا ہو اور اسلام کی طرف مائل ہوا اور اس نے دین اسلام کے سلسلے میں غور وفکر کرنے کے بعد اسے قبول کرلیا ہو اگر چہ وہ گھنٹہ بھر ہی آنحضرتؐ کے ہمراہ رہا ہو۔(۲)

۳۔محمد بن اسماعیل بخاری کہتے ہیں کہ: مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص جو آنحضرتؐ کی مصاحبت میں رہا ہو یا اس نے آپؐ کو دیکھا ہو وہ آنحضرتؐ کے اصحاب میں شمار ہوگا۔(۳)

۴۔احمد ابن حنبل کہتے ہیں کہ: ہر وہ شخص جو ایک ماہ یا ایک دن یا چند گھڑیاں پیغمبر اکرمؐ کے ہمراہ رہا ہو یا اس نے آنحضرتؐ کو دیکھا ہو وہ ان کے اصحاب میں شمار ہوگا۔(۴)

علمائے اہل سنت کے نزدیک ''عدالت صحابہ'' ایک متفق علیہ مسئلہ ہے اس کے مطابق جس شخص کو بھی پیغمبر اکرمؐ کی مصاحبت حاصل ہوئی ہو وہ عادل ہے!(۵)

یہاں پر ضروری ہے کہ اس نظریہ کا قرآنی آیات کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس بارے میں وحی الٰہی کے سرچشمہ سے حاصل شدہ شیعوں کے نقطہ نظر کا بھی تذکرہ کیا جائے۔

تاریخ نے بارہ ہزار سے زیادہ افراد کے نام اصحاب پیغمبرؐ کی فہرست میں درج کئے ہیں جنکے درمیان مختلف قسم کے چہرے دکھائی دیتے ہیں بے شک آنحضرتؐ کی مصاحبت ایک بہت بڑا افتخار تھا جو صرف چند افراد ہی کو نصیب ہوا اور امت اسلامی نے ہمیشہ ایسے افراد کو ادب و احترام کی نگاہوں سے دیکھا ہے کیونکہ انہی بزرگان نے آئین اسلام کی نمائندگی کرتے ہوئے سب سے پہلے اسلام کی عزت اور شوکت کے پرچم کو لہرایا ہے۔

قرآن مجید نے بھی ان کی تعریف کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے:

لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ

اور تم میں سے فتح سے پہلے انفاق کرنے والا اور جہاد کرنے والا اس کے جیسا نہیں ہوسکتا جو فتح کے بعد انفاق اور جہاد کرے پہلے جہاد کرنے والے کا درجہ بہت بلند ہے۔(٦)

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا اعتراف بھی کر لینا چاہیئے کہ پیغمبر خداؐ کی مصاحبت کوئی ایسا کیمیاوی نسخہ نہیں تھا جو انسانوں کی حقیقت کو بدل دیتا اور عمر کے آخری حصے تک ان کی زندگی کی ضمانت لیتا نیز انہیں ہمیشہ کے لئے عادلوں کی صف میں کھڑا کر دیتا۔

اس مسئلے کی وضاحت کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے درمیان قابل اعتماد کتاب قرآن مجید کا مطالعہ کریں اور اس سلسلے میں اس سے مدد حاصل کریں۔

صحابی قرآن مجید کی نگاہ میں

قرآن کے نکتہ نظر سے نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہونے اور آپؐ کی مصاحبت اختیار کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم

وہ ایسے اصحاب ہیں جن کی قرآن مجید کی آیتیں مدح و ستائش کرتی ہیں اور انہیں شوکت اسلام کا بانی قرار دیتی ہیں یہاں پر ہم صحابہ کرام کے ایسے گروہ سے متعلق چند آیتوں کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ دوسروں پر سبقت لے جانے والے

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے اور جن لوگوں نے نیکی میں ان کا اتباع کیا ہے ان سب

سے خدا راضی ہوگیا ہے اور یہ سب خدا سے راضی ہیں اور خدا نے ان کے لئے وہ باغات مہیا کئے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے ۔(۷)

۲۔درخت کے نیچے بیعت کرنے والے

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا

یقیناً خدا صاحبان ایمان سے اس وقت راضی ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے پھر اس نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو ان کے دلوں میں تھا تو ان پر سکون نازل کر دیا اور انہیں اس کے عوض قریبی فتح عنایت کر دی ۔ (۸)

۳۔مہاجرین

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ

یہ مال ان مہاجر فقراء کے لئے بھی ہے جنہیں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا اور ان کے اموال سے انہیں دور کر دیا گیا اور وہ صرف خدا کے فضل اور اس کی مرضی کے طلب گار ہیں اور خدا اور رسول کی مدد کرنے والے ہیں یہی لوگ دعوائے ایمان میں سچے ہیں ۔(۹)

۴۔اصحابِ فتح

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحم دل ہیں تم ان کو دیکھو گے کہ بارگاہ احدیت میں سرخم کئے ہوئے سجدہ ریز ہیں اور اپنے پروردگار سے فضل و کرم اور اس کی خوشنودی کے طلب گار ہیں کثرت سجود کی وجہ سے ان کے چہروں پر سجدہ کے نشانات پائے جاتے ہیں ۔(۱۰)

دوسری قسم

بزم رسالت میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جنہیں پیغمبر خداؐ کی مصاحبت تو حاصل ہوئی تھی مگر وہ یا تو منافق تھے یا پھر ان کے دل میں مرض تھا قرآن مجید نے پیغمبر اسلامؐ کے لئے ایسے افراد کی حقیقت کو نمایاں کیا ہے اور آنحضرتؐ کو یہ تاکید کی ہے کہ ان سے محتاط

 رہیں یہاں پر ہم اس سلسلے میں نازل ہونے والی آیتوں کے چند نمونے پیش کرتے ہیں :

ا۔معروف منافقین

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ

اے پیغمبر! یہ منافقین آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ بھی جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ (۱۱)

۲۔غیر معروف منافقین

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ

اور تم لوگوں کے گرد، دیہاتیوں میں بھی منافقین ہیں اور اہل مدینہ میں تو وہ بھی ہیں جو نفاق میں ماہر اور سرکش ہیں تم لوگ ان کو نہیں جانتے ہو لیکن ہم خوب جانتے ہیں۔(۱۲)

۳۔دل کے کھوٹے

وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا

اور جب منافقین اور جن کے دلوں میں مرض تھا یہ کہہ رہے تھے کہ خدا اور رسول نے ہم سے صرف دھوکا دینے والا وعدہ کیا ہے۔(۱۳)

۴۔گناہ گار

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

اور دوسرے وہ لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا کہ انہوں نے نیک اور بد اعمال مخلوط کر دیئے ہیں عنقریب خدا ان کی توبہ قبول کرلے گا وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔(۱۴)

قرآن مجید کی آیات کے علاوہ پیغمبر اکرمؐ سے بھی بعض صحابہ کی مذمت میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں ان میں سے ہم صرف دو روایتوں کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

ا۔ابو حازم، سہل بن سعد سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ نے ارشاد فرمایا:

أَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ مَنْ وَرَدَ شَرِبَ وَ مَنْ شَرِبَ لَمْ يَظْمَأْ أَبَداً وَ لَيَرِدَنَّ عَلَيَّ أَقْوَامٌ أَعْرِفُهُمْ وَ

یَعْرِفُونَنِی ثُمَّ یُحَالُ بَیْنِی وَ بَیْنَهُم
میں تم سب کو حوض کی طرف بھیجوں گا جو شخص بھی اس حوض تک پہنچے گا وہ اس میں سے ضرور پیئے گا اور جو بھی اس سے پیئے گا پھر وہ تا ابد پیاس محسوس نہیں کرے گا پھر ایک گروہ میرے پاس آئے گا جسے میں اچھی طرح پہچانتا ہوں گا اور وہ بھی مجھے پہچانتے ہوں گے اس کے بعد ان لوگوں کو مجھ سے جدا کر دیا جائے گا۔

ابوحازم کا بیان ہے کہ جس وقت میں نے نعمان ابن ابی عیاش کے سامنے یہ حدیث پڑھی تو انہوں نے مجھ سے کہا: کیا تم نے یہ حدیث سھل سے اسی طرح سنی ہے؟ میں نے کہا ہاں اس وقت نعمان بن ابی عیاش نے کہا کہ ابوسعید خدری نے بھی اس حدیث کو ان کلمات کے اضافے کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

إِنَّهُمْ أُمَّتِی فَیُقَالُ إِنَّکَ لَا تَدْرِی مَا عَمِلُوا بَعْدَکَ فَأَقُولُ سُحْقاً لِمَنْ بَدَّلَ بَعْدِی
یہ افراد مجھ سے ہیں پس کہا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کام انجام دیئے ہیں! پس میں کہوں گا ایسے لوگوں سے خدا کی رحمت دور ہو جائے جنہوں نے میرے بعد (احکام دین میں) تبدیلی کی۔(۱۵)

پیغمبر اسلامؐ کی اس حدیث میں ان دو جملوں ''جنہیں میں اچھی طرح پہچانتا ہوں گا اور وہ سب بھی مجھے پہچانتے ہو نگے'' اور ''میرے بعد تبدیلی کی'' سے صاف واضح ہے کہ آنحضرتؐ کی مراد آپکے وہ اصحاب ہیں جو کچھ مدت آنحضرتؐ کے ہمراہ رہے ہیں (اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے بھی نقل کیا ہے)

۲۔ بخاری اور مسلم، پیغمبر خداؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے:

یَرِدُ عَلَیَّ الْحَوْضَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ رَهْطٌ مِنْ أَصْحَابِی فَیُحَلَّئُونَ عَنِ الْحَوْضِ فَأَقُولُ یَا رَبِّ أَصْحَابِی فَیُقَالُ إِنَّهُ لَا عِلْمَ لَکَ بِمَا أَحْدَثُوا بَعْدَکَ إِنَّهُمْ ارْتَدُّوا عَلَی أَعْقَابِهِمُ الْقَهْقَرَی
قیامت کے دن میرے اصحاب میں سے ایک گروہ میرے پاس آئے گا پس ان کو حوض کوثر سے دور کر دیا جائے گا اس وقت میں کہوں گا اے میرے پروردگار! یہ میرے اصحاب ہیں تو خدا فرمائے گا آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیسے کیسے کام انجام دیئے ہیں بے شک یہ لوگ اپنی سابقہ حالت (زمانہ جاہلیت) پر لوٹ کر مرتد ہو گئے تھے۔(۱۶)

نتیجہ: قرآنی آیات اور سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصحاب اور وہ افراد جنہیں آنحضرتؐ کی مصاحبت کا شرف حاصل ہوا ہے وہ سب ایک ہی درجہ کے نہیں تھے ان میں بعض ایسے بلند مقام افراد تھے جن کی خدمات نے اسلام کے پھیلانے میں انتہائی مؤثر کردار ادا کیا ہے لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ابتداء ہی سے منافق، دل کے مریض

اور گمراہ تھے ۔(۱۷)

اسی بیان کے ساتھ صحابہ پیغمبرؐ کے بارے میں شیعوں کا نظریہ (جو درحقیقت قرآن اور سنت کا نظریہ ہے) واضح ہو جاتا ہے ۔

شیعہ خاک پر کیوں سجدہ کرتے ہیں؟

جواب: بعض لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ خاک یا شہیدوں کی تربت پر سجدہ کرنا ان کی عبادت کرنے کے برابر ہے اور یہ ایک قسم کا شرک ہے ۔اس سوال کے جواب میں اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ ان دو جملوں ''السجود للّٰہ'' و ''السجود علیٰ الأرض'' میں بڑا فرق ہے اور اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا ان دو جملوں کے درمیان موجود فرق کو نہیں سمجھ پایا ہے ۔

السجود للّٰہ کے معنی یہ ہیں کہ سجدہ خدا کے لئے ہوتا ہے اور السجود علیٰ الأرض یعنی سجدہ زمین پر ہوتا ہے ۔بہ الفاظ دیگر ہم زمین پر خدائے عظیم کا سجدہ بجالاتے ہیں اصولی طور پر دنیا کے سارے مسلمان کسی نہ کسی چیز کے اوپر سجدہ کرتے ہیں جبکہ وہ خدا کا سجدہ کرتے ہیں مسجد الحرام میں بھی لوگ پتھروں پر سجدہ کرتے ہیں جبکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدا کا سجدہ کر رہے ہیں ۔

اس بیان کے ساتھ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خاک یا پتوں یا کسی اور چیز پر سجدہ کرنا ان چیزوں کی عبادت نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ خدائے عظیم کے سامنے خود کو خاک سمجھتے ہوئے اس کے لئے سجدہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور اسی طرح یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خاک شفا پر سجدہ کرنا خاک شفا کو سجدہ کرنا نہیں ہے ۔قرآن مجید فرماتا ہے:

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اللہ ہی کو زمین و آسمان میں رہنے والے سب سجدہ کرتے ہیں ۔(۱۸)

نیز پیغمبرؐ اسلام فرماتے ہیں:

جُعِلَتْ لِی الأرض مَسْجِداً طَهُوراً

زمین میرے لئے جائے سجدہ اور پاک کرنے والی قرار دی گئی ہے ۔(۱۹)

لہذا ''خدا کے لئے سجدہ'' اور ''زمین یا خاک شفا پر سجدہ'' کے درمیان آپس میں پوری طرح سازگاری ہے کیونکہ خاک اور پتوں پر سجدہ کرنا خدائے عظیم کے سامنے انتہائی درجہ کے خضوع کی علامت ہے ۔اس بارے میں شیعوں کے نظریئے کی وضاحت کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم امام صادقؑ کے اس گہربار ارشاد کو پیش کریں:

قَالَ هِشَامُ بْنُ الْحَكَمِ لِأَبِي عَبْدِ اللهِ ع أَخْبِرْنِي عَمَّا يَجُوزُ السُّجُودُ عَلَيْهِ وَ عَمَّا لَا يَجُوزُ قَالَ السُّجُودُ لَا يَجُوزُ إِلَّا عَلَى الْأَرْضِ أَوْ عَلَى مَا أَنْبَتَتِ الْأَرْضُ إِلَّا مَا أُكِلَ أَوْ لُبِسَ فَقَالَ لَهُ جُعِلْتُ فِدَاكَ مَا الْعِلَّةُ فِي ذَلِكَ قَالَ لِأَنَّ السُّجُودَ خُضُوعٌ لِلّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ فَلَا يَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ عَلَى مَا يُؤْكَلُ أَوْ يُلْبَسُ لِأَنَّ أَبْنَاءَ

الدُّنْيَا عَبِيدُ مَا يَأْكُلُونَ وَ يَلْبَسُونَ وَ السَّاجِدُ فِي سُجُودِهِ فِي عِبَادَةِ اللهِ عَزَّوَ جَلَّ فَلَا يَنْبَغِي أَنْ يَضَعَ جَبْهَتَهُ فِي سُجُودِهِ عَلَى مَعْبُودِ أَبْنَاءِ الدُّنْيَا الَّذِينَ اغْتَرُّوا بِغُرُورِهَا وَ السُّجُودُ عَلَى الْأَرْضِ أَفْضَلُ لِأَنَّهُ أَبْلَغُ فِي التَّوَاضُعِ وَ الْخُضُوعِ لِلّٰهِ عَزَّوَ جَلَّ

ہشام بن حکم کہتے ہیں کہ میں نے امام صادق ؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ رہنمائی فرمائیں کہ کن چیزوں پرسجدہ کرنا صحیح ہے اورکن چیزوں پرصحیح نہیں ہے؟ امام ؑنے فرمایاسجدہ صرف زمین اور اس سے اگنے والی اشیاء پر ہوسکتا ہےلیکن کھانے اور پہننے والی اشیاء پرسجدہ نہیں کیا جاسکتا میں نے عرض کی: میں آپ پرقربان ہوجاؤں اس کا کیاسبب ہے؟ امامؑ نے فرمایا: سجدہ خداوندعز وجل کے لئے خضوع کا نام ہے پس یہ صحیح نہیں ہے کہ کھانے اور پہننے والی چیزوں پرسجدہ کیا جائے کیونکہ دنیا پرست افراد خوراک اورلباس کے بندے ہیں جبکہ انسان سجدے کی حالت میں اللہ عز وجل کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے ۔پس یہ مناسب نہیں ہے کہ اپنی پیشانی اس چیز پر رکھے جس کو دنیا پرست اپنا معبود سمجھتے ہیں اور وہ دنیا کے دھوکہ میں آگئے ہیں اور زمین پرسجدہ کرنا افضل ہے کیونکہ اس سے خدا کی بارگاہ میں زیادہ خضوع کا اظہار ہوتا ہے ۔(۲۰)

امامؑ کا یہ کلام اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ خاک پرسجدہ اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ یہ کام خدا کی بارگاہ میں تواضع کو ظاہر کرنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے ۔

یہاں پر ایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے کہ شیعہ صرف خاک اور بعض پتوں ہی پر کیوں سجدہ کرتے ہیں اور باقی چیزوں پرسجدہ کیوں نہیں کرتے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح یہ ضروری ہے کہ ہرعبادت کا حکم شریعت کی طرف سے ہم تک پہنچے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تمام شرائط، اجزاء، اوراس کا طریقہ بھی شریعت کو بیان کرنے والی شخصیت یعنی پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اقوال اور کردار کے ذریعے ہم تک پہنچے کیونکہ قرآن کے حکم کے مطابق تمام مسلمانوں کے لئے اسوہ اورنمونہ عمل فقط پیغمبر گرامیؐ کی ذات ہے ۔

اب ہم چندایسی احادیث ذکر کرتے ہیں جو اس بارے میں پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کو بیان کرتی ہیں یہ حدیثیں اس بات کو بیان کرتی ہیں کہ آنحضرتؐ خاک پر اور زمین سے اگنے والی بعض چیزوں جیسے چٹائی وغیرہ پرسجدہ فرماتے تھے اور آج شیعہ بھی اسی چیز کا عقیدہ رکھتے ہیں بہت سے مسلمان محدثین نے اپنی صحاح ومسانید میں آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے زمین کو اپنے لئے سجدہ کے عنوان سے پہچنوایا تھا آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

جعلت لی الأرض مسجدًا و طهورًا

زمین میرے لئے جائے سجدہ اور پاک کرنے والی قرار دی گئی ہے ۔(۲۱)

۱)اس حدیث میں لفظ ''جعلت'' قانون گزاری کے معنی میں ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مسئلہ دین اسلام کی پیروی کرنے والوں کے لئے ایک حکم الٰہی ہے اس حدیث سے خاک ،پتھر اور ہر اس چیز پر سجدے کا جائز ہونا ثابت ہوتا ہے کہ جس کو زمین کہا جا سکے ۔

۲)بعض دوسری روایات اس نکتے پر دلالت کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ سجدہ کرتے وقت اپنی پیشانیوں کو خاک پر رکھا کریں جیسا کہ زوجہ پیغمبرؐ ام سلمہ آنحضرتؐ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا:

ترّب وجهك للّه

اللہ کے لئے اپنے چہرے کو خاک پر رکھو۔(۲۲)

اس حدیث میں ''ترب'' کے لفظ سے دو نکتے سمجھ میں آتے ہیں ایک یہ ہے کہ انسان کو سجدہ کرتے وقت اپنی پیشانی کو خاک پر رکھنا چاہیے دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ''ترب'' صیغہ امر ہے لہذا خاک پر سجدہ کرنا واجب ہے ۔

۳)خود آنحضرتؐ کا عمل بھی خاک پر سجدے کے صحیح ہونے کا بہترین گواہ ہے وائل بن حجر کہتے ہیں :

رأيت النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إذا سجد وضع جبهته و أنفه على الأرض

میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہے کہ جب آپ سجدہ کرتے تھے تو اپنی پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھتے تھے ۔(۲۳)

انس بن مالک اور ابن عباس اور آپؐ کی ازواج جیسے عائشہ اور ام سلمہ اور بہت سے محدثین نے اس طرح روایت کی ہے :

كَانَ رَسول اللّه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يُصَلِّ عَلَى الْخُمْرَةِ

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چٹائی پر نماز پڑھتے تھے (ایسی چٹائی جو کہ کھجور کی پتیوں سے تیار کی جاتی تھی) (۲۴)

پیغمبر اکرمؐ کے صحابی ابو سعید کہتے ہیں کہ :

دخلت على رسول اللّه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وهو يصلي على حصير

میں رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ چٹائی پر نماز پڑھ رہے تھے ۔(۲۵)

یہ بات شیعوں کے نظریئے کے صحیح ہونے کی گواہی دیتی ہے کیونکہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ زمین سے اگنے والی ان اشیاء پر سجدہ صحیح ہے جو نہ تو کھائی جاتی ہوں اور نہ ہی پہنی جاتی ہوں ۔

۴)پیغمبر اسلامؐ کے اصحاب اور تابعین کی سیرت اور ان کے اقوال بھی اس بارے میں آنحضرت کی سنت کو بیان کرتے ہیں : جابر بن عبد اللہ انصاری کہتے ہیں :

كنت أصلي الظهر مع رسول اللّٰه صلی الله علیه وآله وسلم فأخذ قبضة من الحصاء لتبرد في كفي أضعها لجبهتي أسجد عليها لشدة الحرّ

جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز ظہر پڑھتا تھا تو اپنی مٹھی میں سنگ ریزے اٹھالیتا تھا تاکہ وہ میرے ہاتھ میں ٹھنڈے ہو جائیں اور انہیں سجدہ کے وقت اپنی پیشانی کے نیچے رکھ سکوں کیونکہ گرمی بہت شدید تھی۔(۲۶)

اور پھر خود راوی نے اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ اگر اپنے کپڑوں پر سجدہ کرنا جائز ہوتا تو یہ سنگریزوں کے اٹھانے اور انہیں سنبھالنے سے آسان تھا۔

ابن سعد (وفات ۲۰۹ھ) اپنی کتاب ''الطبقات الکبریٰ'' میں یوں لکھتے ہیں:

كان مسروق إذا خرج يخرج بلبنةٍ يسجد عليها في السفينة

مسروق ابن اجدع جس وقت سفر کے لئے نکلتے تھے تو اپنے ساتھ ایک کچی اینٹ رکھ لیتے تھے تاکہ کشتی میں اس پر سجدہ کرسکیں۔(۲۷)

مسروق بن اجدع پیغمبرؐ کے تابعین اور ابن مسعود کے اصحاب میں سے تھے،

کتاب ''الطبقات الکبریٰ'' کے مؤلف ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''وہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد اہل کوفہ میں سے طبقہ اول کے لوگوں میں سے تھے اور انہوں نے ابوبکر، عمر، عثمان، علیؑ اور عبداللہ بن مسعود سے روایتیں نقل کی ہیں۔''

اس کلام سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مٹی کی سجدہ گاہ کا ہمراہ رکھنا ہرگز شرک یا بدعت نہیں ہے کیونکہ صحابہ کرام بھی ایسا کرتے تھے۔(۲۸)

نافع کہتے ہیں:

ان ابن عمر كان اذا سجد وعليه العمامة يرفعها حتىٰ يضع جبهته بالأرض

عبداللہ بن عمر سجدہ کرتے وقت اپنے عمامے کو اوپر کرلیا کرتے تھے تاکہ اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ سکیں۔(۲۹)

رزین کہتے ہیں:

كتب إليّ عليّ بن عبد اللّٰه بن عباس أن أبعث إليّ بلوح من أحجار المروة أسجد عليها

علی بن عبداللہ بن عباس نے مجھے لکھا کہ مروہ پہاڑ کے ایک پتھر کی تختی میرے پاس بھیج دو تاکہ میں اس پر سجدہ کرسکوں۔(۳۰)

۵) دوسری طرف سے مسلمان محدثین نے کچھ روایتیں نقل کی ہیں جن کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے افراد کو ٹوکا ہے جو سجدہ کرتے وقت اپنی پیشانی اور زمین کے درمیان عمامے کے کپڑے کو حائل کر لیا کرتے تھے۔

صالح سبائی کہتے ہیں:

اِنّ رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رأی رجلاً یسجد علیٰ جنبہ و قد اعتم علیٰ جبھتہ فحسر رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیٰ جبھتہ

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پاس ایک ایسے شخص کو سجدہ کرتے دیکھا جس نے اپنی پیشانی پر عمامہ باندھ رکھا تھا تو آنحضرتؐ نے اس کے عمامے کو ہٹا دیا۔ (۳۱)

عیاض بن عبداللہ قرشی کہتے ہیں:

رأی رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رجلاً یسجد علیٰ کور عمامتہ فأومأ بیدہ ارفع عمامتك وأومأ الیٰ جبھتہ

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے عمامے کے ایک گوشے پر سجدہ کر رہا تھا تو آپ نے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر پیشانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اپنے عمامے کو اوپر اٹھاؤ۔ (۳۲)

ان روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول خداؐ کے زمانے میں زمین پر سجدہ کرنا ایک لازمی امر تھا اور جب بھی کوئی شخص عمامے پر سجدہ کرتا تو آنحضرتؐ اسے اس کام سے روکتے تھے۔

۶) شیعوں کے ائمہ اطہارؑ جو کہ حدیث ثقلین کے مطابق، قرآن مجید سے کبھی جدا نہ ہوں گے اور دوسری طرف وہ پیغمبر اکرمؐ کے اہل بیت ہیں انہوں نے زمین پر سجدہ کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے امام صادقؑ فرماتے ہیں:

السُّجُودُ عَلَى الْأَرْضِ فَرِيضَةٌ وَعَلَى الْخُمْرَةِ سُنَّةٌ

زمین پر سجدہ کرنا حکم الٰہی ہے اور چٹائی پر سجدہ سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ (۳۳)

اور ایک مقام پر فرماتے ہیں:

السُّجُودُ لَا يَجُوزُ إِلَّا عَلَى الْأَرْضِ أَوْ عَلَى مَا أَنْبَتَتِ الْأَرْضُ إِلَّا مَا أُكِلَ أَوْ لُبِس

سجدہ کرنا صحیح نہیں ہے سوائے زمین یا اس سے اگنے والی اشیاء پر لیکن کھائی اور پہننے والی اشیاء پر سجدہ نہیں ہو سکتا۔ (۳۴)

نتیجہ: گزشتہ دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف اہل بیتؑ کی روایات بلکہ رسول خداؐ کی سنت اور آنحضرتؐ کے اصحاب اور تابعین کی سیرت اس بات کی گواہ ہیں کہ سجدہ صرف زمین یا اس سے اگنے والی اشیاء (سوائے کھانے اور پہنے جانے والی اشیاء) پر ہی کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ بقیہ دوسری چیزوں پر سجدے کے جائز ہونے کے سلسلے میں اختلاف

پایا جاتا ہے لہٰذا اس احتیاط پر عمل کرتے ہوئے نجات اور کامیابی کی راہ صرف یہ ہے کہ ان چیزوں پر سجدہ کیا جائے جن پر سب کا اتفاق ہے آخر میں ہم اس نکتے کی یاد آوری ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بحث صرف ایک فقہی مسئلہ ہے اور اس قسم کے جزئی مسائل کے بارے میں مسلمان فقہاء کے درمیان بہت اختلافات ہیں لیکن اس قسم کے اختلافات کو کسی قسم کی پریشانی کا باعث نہیں بننا چاہیے کیونکہ اس قسم کے فقہی اختلافات اہل سنت کے چار فرقوں کے درمیان فراوان ہیں مثال کے طور پر مالکی کہتے ہیں کہ ناک کو سجدہ گاہ پر رکھنا مستحب ہے جب کہ حنبلی کہتے ہیں کہ یہ عمل واجب ہے اور اسے چھوڑنے کی صورت میں سجدہ باطل ہو جائے گا۔(۳۵)

کیا اولیائے خدا سے توسل کرنا شرک اور بدعت ہے؟

جواب: توسل کے معنی یہ ہیں کہ تقرب الٰہی کے لئے کسی محترم مخلوق کو اپنے اور خدا کے درمیان وسیلہ قرار دیا جائے۔

ابن منظور لسان العرب میں لکھتے ہیں:

توسّل الیه بکذا، تقرب الیه بحرمة آصرة تعطفه علیه

اس نے فلان چیز کے ذریعہ اس شخصیت سے توسل کیا یعنی اس نے اس چیز کی حرمت کے ذریعہ اس ذات سے قربت اختیار کی جب کہ اس کی حرمت سے اپنی قلبی محبت کو اپنے اندر محسوس کیا۔(۳۶)

قرآن مجید فرماتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو کہ شاید اس طرح کامیاب ہو جاؤ۔(۳۷)

جوہری "صحاح اللّغۃ" میں "وسیلہ" کی تعریف کو یوں بیان کرتے ہیں:

"الوسیلة ما یتقرّب به الی الغیر"

وسیلہ ایسی چیز ہے جسکے ذریعہ کسی دوسرے کے قریب ہوا جائے اس اعتبار سے بعض اوقات انسان کے نیک اعمال اور خدا کی خالص عبادت اس کیلئے وسیلہ بنتے ہیں اور کبھی کبھی خدا کے محترم اور مقدس بندے انسان کے لئے وسیلہ قرار پاتے ہیں۔

توسل کی قسمیں

توسل کی تین قسمیں ہیں:

۱۔نیک اعمال سے توسل؛ جلال الدین سیوطی نے اس آیت "وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ" کے ذیل میں اس روایت کا

 ذکر کیا ہے:

عن قتادۃ فی قولہ تعالیٰ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ قال تقرّبوا الی اللّٰہ بطاعتہ والعمل بما یرضیہ

{وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ} اس آیت کے متعلق قتادۃ کا بیان ہے۔کہ خدا کی اطاعت اور اس کو خوشنود کرنے والے عمل کے ذریعہ خدا سے قربت اختیار کرو۔(۳۸)

۲۔خدا کے نیک بندوں کی دعاؤں سے توسل! قرآن مجید نے جناب یوسفؑ کے بھائیوں اور جناب یعقوبؑ کی گفتگو کو یوں بیان کیا ہے:

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ ○ قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ

ان لوگوں نے کہا باباجان اب آپ ہمارے گناہوں کیلئے استغفار کریں ہم یقینا خطا کار تھے انہوں نے کہا کہ میں عنقریب تمہارے حق میں استغفار کروں گا کہ میرا پروردگار بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔(۳۹)

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جناب یعقوبؑ کے بیٹوں نے اپنے والد کی دعا اور ان کے استغفار سے توسل کیا تھا حضرت یعقوبؑ نے بھی نہ صرف ان کے توسل پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ ان سے وعدہ بھی کیا کہ وہ ان کے حق میں دعا اور استغفار کریں گے۔

۳۔قرب الٰہی کے حصول کیلئے خداوند کریم کے محترم اور مقدس بندوں سے توسل:

اس قسم کے توسل کی مثالیں، اوائل اسلام میں آنحضرتؐ کے اصحاب کی سیرت میں دکھائی دیتی ہیں اب ہم یہاں اس مسئلے کی دلیلوں کو احادیث اور سیرت صحابہ کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔

احمد ابن حنبل نے اپنی کتاب مسند میں عثمان بن حنیف سے یہ روایت نقل کی ہے:

اِن رجلاً ضریر البصر أتی النبیّ صلی اللّٰه علیه وآله وسلم فقال ادع اللّٰہ أن یعافینی قال اِن شئت دعوت لك و اِن شئت أخرت ذاك فهو خیر فقال ادعه فأمره أن یتوضأ فیحسن وضوئه فیصلی رکعتین و یدعو بهذا الدعاء اللّٰهم اِنیّ أسئلك و أتوجه اِلیك بنبیك محمدٍ نبیّ الرحمة یا محمد اِنیّ توجّهت بك اِلی ربیّ فی حاجتی هذه، فتقضی لی اللّٰهم شفّعه فیّ

ایک نابینا شخص رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپؐ پروردگار سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے شفا بخشے آنحضرت نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو میں تمہارے لئے دعا کرتا ہوں لیکن اگر چاہو تو اس سلسلے میں کچھ تاخیر کر دی جائے اور یہی بہتر بھی ہے اس نے عرض کیا کہ آپؐ دعا فرما دیں تو پیغمبر خداؐ نے اس شخص کو حکم دیا کہ وہ وضو کو اچھے طریقے سے انجام دے اور پھر دو رکعت نماز بجالائے اور یہ

دعا پڑھے: اے معبود میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں تیرے پیغمبر نبی رحمتؐ حضرت محمدؐ کے وسیلے سے اے محمدؐ میں آپکے وسیلے سے اپنی اس حاجت میں اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ آپ میری حاجت کو قبول فرمائیں اے معبود ان کو میرے لئے شفیع قرار دے۔(۴۰)

محدثین نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب مستدرک میں اس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ ''یہ ایک صحیح حدیث ہے'' ابن ماجہ نے بھی ابو اسحاق سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ''یہ روایت صحیح ہے'' اسی طرح ترمذی نے اپنی کتاب ''ابواب الادعیۃ'' میں اس حدیث کے صحیح ہونے کی تائید کی ہے ''محمد بن نسیب الرفاعی'' نے بھی اپنی کتاب ''التوصل الی حقیقۃ التوسل'' میں یوں بیان کیا ہے

لا شك إن هذا الحديث صحيح و مشهور ۔۔۔ و قد ثبت فيه بلا شك ولا ريب ارتداد بصر الأعمى بدعاء رسول اللّه صلى الله عليه وآله وسلم

بے شک یہ حدیث صحیح اور مشہور ہے ۔۔۔ بہ تحقیق اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کے نتیجے میں اس اندھے شخص کی بصارت لوٹ آئی تھی اس حدیث سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حاجات کے لئے پیغمبر خداؐ کو وسیلہ بنا کر ان سے توسل کرنا ایک جائز عمل ہے کیونکہ رسول خدا نے اس نابینا شخص کو حکم دیا تھا کہ وہ اس طرح دعا کرے اور حضور (ص) کو اپنے اور پروردگار کے درمیان وسیلہ قرار دے اس طرح یہ حدیث اولیائے الٰہی سے توسل کو ثابت کرتی ہے۔(۴۱)

۲۔ابو عبداللہ بخاری کا اپنی کتاب صحیح میں بیان ہے:

إن عمر بن الخطاب رضى اللّه عنه كان إذا قحطوا استسقىٰ بالعباس بن عبد المطلب فقال اللّهم إن كنّا نتوسّل إليك بنبيّنا فتسقينا و إنّا نتوسّل إليك بعمّ نبيّنا فاسقنا قال، فيُسقون

جب قحط پڑتا تھا تو عمر ابن خطاب ہمیشہ عباس ابن عبد المطلب کے وسیلے سے بارش کیلئے دعا کرتے تھے اور کہتے تھے ''خدایا! پیغمبر کے زمانے میں ہم آنحضرتؐ سے متوسل ہوتے تھے اور تو ہم پر بارش نازل کرتا تھا اب ہم پیغمبرؐ کے چچا کے وسیلے سے تجھ سے توسل کر رہے ہیں تاکہ تو ہمیں سیراب کر دے'' چنانچہ اس طرح وہ سیراب کر دیئے جاتے تھے۔(۴۲)

۳۔صدر اسلام کے مسلمانوں کے درمیان اولیائے الٰہی سے توسل اس حد تک رائج تھا کہ وہ لوگ اپنے اشعار میں بھی حضورؐ کے وسیلہ ہونے کا تذکرہ کرتے تھے بطور مثال سواد ابن قارب کا یہ قصیدہ ملاحظہ فرمائیں جس میں انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح سرائی کی ہے:

واشهد أن لا ربّ غيره وأنك مأمون على كل غالب

وأنك أدنى المرسلين وسيلة إلى اللّه يابن الأكرمين الأطائب

میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے علاوہ کوئی پروردگار نہیں ہے اور آپؐ ہر پوشیدہ چیز کے لئے امین ہیں اور اے مکرم اور پاک طینت افراد کے فرزند میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ تمام نبیوں کے درمیان پروردگار کا نزدیک ترین وسیلہ ہیں ۔(۴۴)

پیغمبر خدا نے سواد بن قارب سے یہ قصیدہ سنا تھا لیکن اس کے اشعار پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور نہ ہی سواد کے اس کام کو شرک و بدعت قرار دیا تھا۔

امام شافعی نے بھی اپنے ان اشعار میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے:

آل النبيّ ذريعتي هم اليه وسيلتي

أرجوبهم أعطى غدًا بيدي اليمين صحيفتي

پروردگار تک پہنچنے کے لئے پیغمبر کی آل میرے لئے وسیلہ ہیں میں ان کی وجہ سے امیدوار ہوں کہ میرا نامہ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔(۴۵)

اولیائے الٰہی سے توسل کے جائز ہونے کے سلسلے میں بہت سی روایات آئی ہیں اور انہی روایات کی روشنی میں پیغمبر خداؐ صحابہ اور علمائے اسلام کا اس موضوع سے متعلق نظریہ معلوم ہو جاتا ہے اور مزید گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہتی ہے ۔ہمارے اسی بیان سے ان لوگوں کا یہ کلام کہ خدا کے محترم بندوں سے توسل کرنا شرک اور بدعت ہے، باطل ہو جاتا ہے ۔

شیعہ پانچ نمازوں کو تین اوقات میں کیوں پڑھتے ہیں؟

جواب: بہتر ہے کہ اس بحث کی وضاحت کے لئے سب سے پہلے اس بارے میں فقہاء کے نظریات بیان کردیئے جائیں:

۱۔سارے اسلامی فرقے اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ میدان ''عرفات'' میں ظہر کے وقت نماز ظہر اور نماز عصر کو اکٹھا اور بغیر فاصلے کے پڑھا جاسکتا ہے اسی طرح ''مزدلفہ'' میں عشاء کے وقت نماز مغرب اور عشاء کو ایک ساتھ پڑھنا جائز ہے ۔

۲۔حنفی فرقہ کا کہنا ہے کہ: نماز ظہر وعصر اور نماز مغرب وعشاء کو اکٹھا ایک وقت میں پڑھنا صرف دو ہی مقامات ''میدان عرفات'' اور ''مزدلفہ'' میں جائز ہے اور باقی جگہوں پر اس طرح ایک ساتھ نمازیں نہ پڑھی جائیں ۔

۳۔حنبلی، مالکی اور شافعی فرقوں کا کہنا ہے کہ: نماز ظہر وعصر اور نماز مغرب وعشاء کو ان گزشتہ دو مقامات کے علاوہ سفر کی حالت میں بھی ایک ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے ان فرقوں میں سے کچھ لوگ بعض اضطراری موقعوں جیسے بارش کے وقت یا نمازی کے بیمار ہونے پر یا پھر دشمن کے ڈر سے ان نمازوں کو ساتھ میں پڑھنا جائز قرار دیتے ہیں (۴۴)

۴۔شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نماز ظہر وعصر اور اسی طرح نماز مغرب وعشاء کے لئے ایک ''خاص وقت'' ہے اور ایک ''مشترک وقت'':

الف: نماز ظہر کا خاص وقت شرعی ظہر (زوال آفتاب) سے لیکر اتنی دیر تک ہے جس میں چار رکعت نماز پڑھی جاسکے۔

ب: نماز عصر کا مخصوص وقت وہ ہے کہ جب غروب آفتاب میں اتنا وقت باقی بچا ہو کہ اس میں چار رکعت نماز پڑھی جاسکے۔

ج: نماز ظہر وعصر کا مشترک وقت نماز ظہر کے مخصوص وقت کے ختم ہونے اور نماز عصر کے مخصوص وقت کے شروع ہونے تک ہے۔

شیعہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان تمام مشترک اوقات میں نماز ظہر وعصر کو اکٹھا اور فاصلے کے بغیر پڑھ سکتے ہیں۔

لیکن اہل سنت کہتے ہیں: کہ نماز ظہر کا مخصوص وقت، شرعی ظہر (زوال آفتاب) سے لیکر اس وقت تک ہے جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو جائے اس وقت میں نماز عصر نہیں پڑھی جاسکتی اور اس کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک نماز عصر کا مخصوص وقت ہے اس وقت میں نماز ظہر نہیں پڑھی جاسکتی۔

د: نماز مغرب کا مخصوص وقت شرعی مغرب کی ابتدا سے لے کر اس وقت تک ہے کہ جس میں تین رکعت نماز پڑھی جاسکتی ہے۔اس وقت میں صرف نماز مغرب ہی پڑھی جاسکتی ہے۔

ھ: نماز عشاء کا مخصوص وقت یہ ہے کہ جب آدھی رات میں صرف اتنا وقت رہ جائے کہ اس میں چار رکعت نماز پڑھی جاسکے تو اس کوتاہ وقت میں صرف نماز عشاء ہی پڑھی جائے گی۔

و: مغرب وعشاء کی نمازوں کا مشترک وقت نماز مغرب کے مخصوص وقت کے ختم ہونے سے لے کر نماز عشاء کے مخصوص وقت تک ہے۔

شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس مشترک وقت کے اندر مغرب وعشاء کی نمازیں ایک ساتھ اور بغیر فاصلے کے ادا کی جاسکتی ہیں لیکن اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ نماز مغرب کا مخصوص وقت غروب آفتاب سے لے کر مغرب کی سرخی زائل ہونے تک ہے اور اس وقت میں نماز عشاء نہیں پڑھی جاسکتی پھر مغرب کی سرخی کے زائل ہونے سے لیکر آدھی رات تک نماز عشاء کا خاص وقت ہے اور اس وقت میں نماز مغرب ادا نہیں کی جاسکتی۔

نتیجہ: یہ نکلتا ہے کہ فقہ جعفریہ کے نظریئے کے مطابق شرعی ظہر کا وقت آجانے پر نماز ظہر بجالانے کے بعد بلا فاصلہ نماز عصر ادا کر سکتے ہیں نماز ظہر کو اس وقت نہ پڑھ کر نماز عصر کے خاص وقت تک پڑھتے ہیں۔اس طرح کہ نماز ظہر کو نماز عصر کے خاص وقت کے پہنچنے سے پہلے ختم کر دیں اور اس کے بعد نماز عصر پڑھ لیں اس طرح نماز ظہر وعصر کو جمع کیا جاسکتا ہے اگر چہ مستحب یہ ہے کہ نماز ظہر کو زوال کے بعد ادا کیا جائے اور نماز عصر کو اس وقت ادا کیا جائے کہ جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو جائے۔

اسی طرح شرعی مغرب کے وقت نماز مغرب کے بجالانے کے بعد بلا فاصلہ نماز عشا پڑھ سکتے ہیں یا پھر اگر چاہیں تو نماز

مغرب کو نماز عشاء کے خاص وقت کے قریب پڑھیں وہ اس طرح کہ نماز مغرب کو نماز عشاء کے خاص وقت کے پہنچنے سے پہلے ختم کردیں اور اس کے بعد نماز عشاء پڑھ لیں اس طرح نماز مغرب وعشاء کو ساتھ میں پڑھا جاسکتا ہے۔ اگر چہ مستحب یہ ہے کہ نماز مغرب کو شرعی مغرب کے بعد ادا کیا جائے اور نماز عشاء کو مغرب کی سرخی کے زائل ہوجانے کے بعد بجالایا جائے یہ شیعہ کا نظریہ تھا۔

لیکن اہل سنت کہتے ہیں کہ نماز ظہر وعصر یا مغرب وعشاء کو کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت میں ایک ساتھ ادا کرنا صحیح نہیں ہے اس اعتبار سے بحث اس میں ہے کہ کیا ہر جگہ اور ہر وقت میں دونمازیں ایک ساتھ پڑھی جاسکتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے میدان عرفہ اور مزدلفہ میں دونمازوں کو ایک ساتھ ایک ہی وقت میں پڑھا جاتا ہے۔

۵۔ سارے مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے دونمازیں ایک ساتھ پڑھی تھیں لیکن اس روایت کی تفسیر میں دو نظریے پائے جاتے ہیں:

الف: شیعہ کہتے ہیں کہ اس روایت سے مراد یہ ہے کہ نماز ظہر کے ابتدائی وقت میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد نماز عصر کو بجالایا جاسکتا ہے اور اسی طرح نماز مغرب کے ابتدائی وقت میں مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد نماز عشا کو پڑھا جاسکتا ہے اور یہ مسئلہ کسی خاص وقت اور کسی خاص جگہ یا خاص حالات سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت میں ایک ساتھ دونمازیں ادا کی جاسکتی ہیں۔

ب: اہل سنت کہتے ہیں مذکورہ روایت سے مراد یہ ہے کہ نماز ظہر کو اس کے آخری وقت میں اور نماز عصر کو اس کے اول وقت میں پڑھا جائے اور اسی طرح نماز مغرب کو اس کے آخری وقت میں اور نماز عشاء کو اس کے اول وقت میں پڑھا جائے۔

اب ہم اس مسئلے کی وضاحت کے لئے ان روایات کی تحقیق کرکے یہ ثابت کریں گے کہ ان روایات میں دونمازوں کو جمع کرنے سے وہی مراد ہے جو شیعہ کہتے ہیں۔ یعنی دونمازوں کو ایک ہی نماز کے وقت میں پڑھا جاسکتا ہے اور یہ مراد نہیں ہے کہ ایک نماز کو اس کے آخری وقت میں اور دوسری نماز کو اس کے اول وقت میں پڑھا جائے:

روایات میں دونمازوں کے ایک ہی ساتھ پڑھنے کا تذکرہ

۱۔ احمد ابن حنبل نے اپنے کتاب مسند میں جابر بن زید سے روایت کی ہے

أخبرني جابر بن زيد أنه سمع ابن عباس يقول صلّيت مع رسول اللّه صلى الله عليه وآله وسلم ثمانيًا جميعًا، و سبعًا جميعًا قال قلت له يا أبا الشعثاء أظنّه أخّر الظهر وعجّل العصر و أخّر المغرب وعجّل العشاء قال وأنا أظن ذلك

جابر بن زید کا بیان ہے کہ انہوں نے ابن عباس سے سنا ہے کہ وہ کہہ رہے تھے: میں نے پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ آٹھ رکعت نماز (ظہر وعصر) اور سات رکعت نماز (مغرب وعشاء) کو ایک ساتھ پڑھا ہے ابن عباس کہتے

ہیں کہ میں نے ابوشعثاء سے کہا: میرا یہ گمان ہے کہ رسول خداؐ نے نماز ظہر کو تاخیر سے پڑھا ہے اور نماز عصر کو جلد ادا کیا ہے اسی طرح نماز مغرب کو بھی تاخیر سے پڑھا ہے اور نماز عشاء کو جلدی ادا کیا ہے ابوشعثاء نے کہا میرا بھی یہی گمان ہے۔(۴۶)

اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ اور بغیر فاصلے کے پڑھا تھا۔

۲۔احمد ابن حنبل نے عبداللہ بن شقیق سے درج ذیل روایت نقل کی ہے:

خطبنا ابن عباس یومًا بعد العصر حتی غربت الشمس و بدت النجوم و علق الناس ینادونه الصلاة و فی القوم رجل من بنی تیم فجعل یقول الصلاة الصلاة قال فغضب قال أتعلّمنی بالسنة؟ شهدت رسول اللّه ﷺ جمع بین الظهر والعصر والمغرب والعشاء ۔ قال عبداللہ فوجدت فی نفسی من ذلك شیئًا فلقیت أباهریرة فسألته فوافقه

ایک دن عصر کے بعد ابن عباس نے ہمارے درمیان خطبہ دیا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوگیا اور ستارے چمکنے لگے اور لوگ نماز کی ندائیں دینے لگے ان میں سے بنی تیم قبیلے کا ایک شخص ''نماز'' ''نماز'' کہنے لگا ابن عباس نے غصے میں کہا کیا تم مجھے سنت پیغمبرؐ کی تعلیم دینا چاہتے ہو؟ میں نے خود رسول خداؐ کو ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھتے دیکھا ہے عبداللہ نے کہا اس مسئلے سے متعلق میرے ذہن میں شک پیدا ہوگیا تو میں ابوہریرہ کے پاس گیا اور ان سے سوال کیا تو انہوں نے ابن عباس کی بات کی تائید کی۔(۴۷)

اس حدیث میں دو صحابی ''عبداللہ ابن عباس'' اور ''ابوہریرہ'' اس حقیقت کی گواہی دے رہے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو ایک ساتھ پڑھا ہے اور ابن عباس نے بھی پیغمبر اکرمؐ کے اس عمل کی پیروی کی ہے۔

۳۔مالک بن انس کا اپنی کتاب ''موطا'' میں بیان ہے:

صلّی رسول اللّه صلی اللہ علیه وآله وسلم الظهر والعصر جمیعًا والمغرب والعشاء جمیعًا فی غیر خوف ولا سفر

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھی تھیں جبکہ نہ تو کسی قسم کا خوف تھا اور نہ ہی آپؐ سفر میں تھے۔(۴۸)

۴۔محمد زرقانی نے موطأ کی شرح میں ابن شعثا سے یوں روایت نقل کی ہے

اِنّ ابن عباس صلّی بالبصرة الظهر والعصر لیس بینهما شیء والمغرب والعشاء لیس بینهما شیء

بے شک ابن عباس نے بصرہ میں نماز ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور بغیر فاصلے کے پڑھا تھا اور اسی طرح نماز مغرب وعشاء کو بھی اور بغیر فاصلے کے بجالائے تھے (۴۹)

۵۔زرقانی نے طبرانی سے اور انھوں نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے:

جمع النبیّ صلی الله علیه وآله وسلم بین الظهر والعصر و بین المغرب والعشاء فقیل له فی ذلك فقال صنعت هذا لئلا تحرج أمتی

پیغمبر اکرمؐ نے جب نماز ظہر وعصر اور نماز مغرب وعشاء کو ایک ساتھ پڑھا تو آنحضرتؐ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا(۵۰)

جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اس عمل کو اس لئے انجام دیا ہے تاکہ میری امت مشقت میں نہ پڑ جائے۔

۶۔مسلم نے اپنی کتاب صحیح میں سعید بن جبیر سے اور انہوں نے ابن عباس سے یوں روایت نقل کی ہے:

جمع رسول اللّه صلی الله علیه وآله وسلم بین الظهر والعصر والمغرب والعشاء فی المدینة من غیر خوف ولا مطر

پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ منورہ میں بغیر خوف اور بارش کے نماز ظہر وعصر اور نماز مغرب وعشاء کو اکٹھا پڑھا تھا۔(۵۱)

اس وقت سعید ابن جبیر نے ابن عباس سے پوچھا کہ پیغمبر اکرمؐ نے اس طرح کیوں کیا؟ تو ابن عباس نے کہا آنحضرتؐ اپنی امت کو زحمت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔(۵۲)

۷۔ابوعبداللہ بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں اس سلسلے میں ''باب تاخیر الظہر الی العصر'' کے نام سے ایک مستقل باب قرار دیا ہے۔(۵۳)

یہ خود عنوان اس بات کا بہترین گواہ ہے کہ نماز ظہر میں تاخیر کرکے اسے نماز عصر کے وقت میں اکٹھا بجالایا جاسکتا ہے اس کے بعد بخاری نے اسی مذکورہ باب میں درج ذیل روایت نقل کی ہے:

إنّ النبیّ صلی الله علیه وآله وسلم صلّیٰ بالمدینة سبعًا و ثمانیًا الظهر والعصر والمغرب والعشاء

بہ تحقیق پیغمبر اکرم نے مدینہ میں سات رکعت (نماز مغرب وعشاء) اور آٹھ رکعت (نماز ظہر وعصر) پڑھی ہیں۔(۵۴)

اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ جس طرح نماز ظہر میں تاخیر کرکے اسے نماز عصر کے وقت میں نماز عصر

کے ساتھ بجالایا جاسکتا ہے، اسی طرح سیاق حدیث میں موجود قرینہ اور پیغمبر اکرمؐ کی سیرت سے سمجھ میں آتا ہے کہ نماز مغرب میں بھی دیر کر کے اسے نماز عشاء کے وقت میں نماز عشاء کے ساتھ بجالایا جاسکتا ہے۔

۹۔مسلم بن حجاج نے اپنی کتاب صحیح میں بیان کیا ہے:

قال رجل لابن عباس الصلاة فسکت ثم قال الصلاة فسکت ثم قال الصلاة فسکت ثم قال لا أم لك أتعلمنا بالصلوٰة و کنّا نجمع بین الصلاتین علیٰ عهد رسول اللّه ۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ایک شخص نے ابن عباس سے کہا: ''نماز'' تو ابن عباس نے کچھ نہ کہا اس شخص نے پھر کہا ''نماز'' پھر بھی ابن عباس نے اسے کوئی جواب نہ دیا تو اس شخص نے پھر کہا ''نماز'' لیکن ابن عباس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا جب اس شخص نے چوتھی مرتبہ کہا: ''نماز'' تب ابن عباس بولے او بے اصل! تم ہمیں نماز کی تعلیم دینا چاہتے ہو؟ جبکہ ہم پیغمبر خداؐ کے زمانے میں دو نمازوں کو ایک ساتھ بجالایا کرتے تھے۔(۵۵)

۱۰۔متقی ہندی اپنی کتاب ''کنز العمال'' میں لکھتے ہیں:

قال عبداللّه جمع لنا رسول اللّه صلی الله علیه وآله وسلم مقیمًا غیر مسافر بین الظهر والعصر والمغرب والعشاء فقال رجل لابن عمر لم تری النبیّ صلی الله علیه وآله وسلم فعل ذلك؟ قال لِأن لایحرج اُمته ان جمع رجل

عبداللہ ابن عمر نے کہا: کہ پیغمبر خداؐ نے بغیر سفر کے نماز ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو اکٹھا پڑھا تھا ایک شخص نے ابن عمر سے سوال کیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے ایسا کیوں کیا؟ تو ابن عمر نے جواب دیا کہ آنحضرتؐ اپنی امت کو مشقت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے تا کہ اگر کوئی شخص چاہے تو دو نمازوں کو ایک ساتھ بجالائے۔(۵۷)

۱۱۔اسی طرح کنز العمال میں یہ روایت بھی موجود ہے:

عن جابر أنّ النبیّ صلی الله علیه وآله وسلم جمع بین الظهر والعصر بأذان وإقامتین

نبی اکرمؐ نے ظہر وعصر کی نمازوں کو اکٹھا ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھا تھا۔

۱۲۔کنز العمال میں درج ذیل روایت بھی موجود ہے:(۵۸)

عن جابر أنّ رسول اللّه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غربت له الشمس بمکة فجمع بینهما بسرف

جابر بن عبداللہ سے منقول ہے کہ مکہ میں ایک دفعہ جب آفتاب غروب ہوگیا تو رسول خداؐ نے ''سرف'' (۵۸) کے مقام پر نماز مغرب وعشاء کو اکٹھا پڑھا تھا۔(۵۹)

نتیجہ: اب ہم گزشتہ روایات کی روشنی میں دونمازوں کوجمع کرنے کے سلسلے میں شیعوں کے نظریہ کے صحیح ہونے پر چند دلیلیں پیش کریں گے:

۱۔ دونمازوں کوایک وقت میں ایک ساتھ بجالانے کی اجازت نمازیوں کی سہولت اورانہیں مشقت سے بچانے کے لئے دی گئی ہے۔

متعدد روایات میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر نماز ظہر وعصر یا مغرب و عشاءکوایک وقت میں بجالانا جائز نہ ہوتا تو یہ امر مسلمانوں کے لئے زحمت ومشقت کا باعث بنتا اسی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ نے مسلمانوں کی سہولت اورآسانی کے لئے دونمازوں کوایک وقت میں بجالانے کو جائز قرار دیا ہے

واضح ہے کہ اگر ان روایات سے یہ مراد ہو کہ نماز ظہر کو اسکے آخری وقت (جب ہر چیز کا سایہ اسکے برابر ہوجائے) تک تاخیر کر کے پڑھا جائے اور نماز عصر کو اسکے اول وقت میں بجالایا جائے اس طرح ہر دونمازیں ایک ساتھ مگر اپنے اوقات ہی میں پڑھی جائیں (اہل سنت حضرات ان روایات سے یہی مراد لیتے ہیں) تو ایسے کام میں کسی طرح کی سہولت نہیں ہوگی بلکہ یہ کام مزید مشقت کا باعث بنے گا جبکہ دونمازوں کوایک ساتھ بجالانے کی اجازت کا یہ مقصد تھا کہ نمازیوں کیلئے سہولت ہو۔

اس بیان سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ گزشتہ روایات سے مراد یہ ہے کہ دونمازوں کوان کے مشترک وقت کے ہر حصے میں بجالایا جاسکتا ہے اب نماز گزار کو اختیار ہے کہ وہ مشترک وقت کے ابتدائی حصے میں نماز پڑھے یا اس کے آخری حصے میں اوران روایات سے یہ مراد نہیں ہے کہ ایک نماز کواس کے آخری وقت میں اور دوسری کواس کے اول وقت میں ادا کیا جائے۔

۲۔ روز عرفہ دونمازوں کو اکٹھا پڑھنے کے حکم سے باقی دنوں میں نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک عرفہ کے دن ظہر وعصر کی نمازوں کوایک وقت میں بجالانا جائز ہے (۶۰)

مزید براں گزشتہ روایات میں سے بعض اس بات کی گواہ ہیں کہ میدان عرفات کی طرح باقی مقامات پر بھی نمازوں کو اکٹھا بجالایا جاسکتا ہے اب اس اعتبار سے روز عرفہ اور باقی عام دنوں کے درمیان یا عرفات کی سرزمین اور باقی عام جگہوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لہذا جس طرح مسلمانوں کے متفقہ نظرئیے کے مطابق عرفہ میں ظہر وعصر کی نمازوں کوظہر کے وقت پر ایک ساتھ پڑھا جاتا ہے اسی طرح عرفہ کےعلاوہ بھی ان نمازوں کوظہر کے وقت اکٹھا پڑھنا بالکل صحیح ہے۔

۳۔ سفر کی حالت میں دونمازوں کو ایک پڑھنے کے حکم سے غیر سفر میں بھی نمازوں کے ایک ساتھ بجالانے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف سے حنبلی، مالکی، اور شافعی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حالت سفر میں دونمازوں کو اکٹھا بجالایا جاسکتا ہے اور دوسری طرف گزشتہ روایات صراحت کے ساتھ کہہ رہی ہیں کہ اس اعتبار سے سفر اور غیر سفر میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے دونوں حالتوں میں نمازوں کو اکٹھا پڑھا تھا۔

اس بنیاد پر (فقہ جعفریہ کے مطابق) جس طرح حالت سفر میں دونمازوں کو اکٹھا بجالانا صحیح ہے اسی طرح عام حالات میں بھی دونمازوں کو اکٹھا پڑھا جاسکتا ہے۔

۴۔اضطراری حالت میں دونمازوں کے اکٹھا پڑھنے کے حکم سے عام حالت میں بھی نمازوں کے اکٹھا پڑھنے کا جواز معلوم ہوجاتا ہے۔اہل سنت کی صحیح اور مستند کتابوں میں سے بہت سی روایات اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اصحاب نے چند اضطراری موقعوں پر جیسے بارش کے وقت یا دشمن کے خوف سے یا بیماری کی حالت میں نمازوں کو ایک ساتھ اور ایک ہی وقت میں (ٹھیک اسی طرح جیسے شیعہ کہتے ہیں) پڑھا تھا اور اسی وجہ سے مختلف اسلامی فرقوں کے فقہاء نے بعض اضطراری حالات میں دونمازوں کو ایک ساتھ پڑھنا جائز قرار دیا ہے جب کہ گزشتہ روایات اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کررہی ہیں کہ اس سلسلے میں اضطراری اور عام حالت میں کوئی فرق نہیں ہے۔اور پیغمبر اکرمؐ نے دونوں حالتوں میں اپنی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا ہے۔

۵۔اصحاب پیغمبرؐ کی روش سے دونمازوں کے ایک ساتھ بجالانے کا جواز معلوم ہوتا ہے:

گزشتہ روایات میں یہ نکتہ موجود ہے کہ آنحضرتؐ کے بہت سے اصحاب دونمازوں کو ایک وقت میں بجالاتے تھے جیسے کہ عبداللہ ابن عباس نے نماز مغرب میں اتنی دیر کردی تھی کہ اندھیرا چھا گیا تھا اور آسمان پر ستارے چمکنے لگے تھے اور لوگوں نے نماز کی صدائیں دینا شروع کردی تھیں مگر ابن عباس نے ان کی طرف توجہ نہیں کی تھی سرانجام جب رات کا کچھ حصہ گزرگیا تب انہوں نے نماز مغرب وعشاء پڑھی تھی۔اور اعتراض کرنے والوں کو یہ جواب دیا تھا: میں نے پیغمبر اسلامؐ کو اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے نیز ابوہریرہ نے بھی ابن عباس کی اس بات کی تائید کی تھی۔

گزشتہ روایات کی روشنی میں اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ پیغمبر اسلامؐ کے صحابی ابن عباس نے شیعوں کی طرح دونمازوں کو ایک وقت میں پڑھا تھا۔

۶۔پیغمبر اسلامؐ کی سیرت سے دونمازوں کو ایک ساتھ بجالانے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔احادیث کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ نماز مغرب کے وقت پیغمبر اکرمؐ مکہ مکرمہ میں تشریف فرما تھے لیکن آنحضرتؐ نے نماز مغرب میں تاخیر کی تھی اور ''سرف'' نامی علاقہ (جو مکہ سے نو میل کے فاصلے پر واقع تھا) میں پہنچ کر نماز مغرب وعشاء کو ایک ساتھ پڑھا تھا جب کہ یہ واضح ہے کہ اگر آنحضرت مکہ سے مغرب کے اول وقت میں چلے ہوں گے تو اس زمانے کی کم رفتار سواری کے ذریعے سفر کرنے کی وجہ سے یقیناً رات کا کافی حصہ گزرجانے کے بعد ہی سرف کے مقام تک پہنچے ہوں گے اسی وجہ سے حضورؐ نے مغرب وعشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھا تھا اہل سنت حضرات کی صحیح اور مستند کتابوں سے منقول روایات شیعوں کے نظریئے (ظہر وعصر یا مغرب وعشاء کی نمازوں کو ہر وقت، ہر جگہ اور ہر طرح کی صورتحال میں ایک ساتھ پڑھنا جائز ہے) کے صحیح ہونے کی گواہی دیتی ہیں۔

تقیہ کیا ہے؟

دشمنوں کے مقابلے میں دنیاوی اور دینی نقصانات سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے باطنی عقیدے اور ایمان کو چھپانے کا نام تقیہ ہے تقیہ ہر مسلمان شخص کا ایک ایسا شرعی فریضہ ہے جس کا سرچشمہ قرآنی آیات ہیں:

تقیہ قرآن کی نگاہ میں

قرآن مجید میں تقیہ سے متعلق بہت سی آیات ہیں ان میں سے یہاں ہم بعض کا ذکر کرتے ہیں:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ

مومنوں کو چاہیے کہ وہ اہل ایمان کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی اور دوست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہوگا مگر یہ کہ تمہیں کفار سے خوف ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔(۶۱)

یہ آیت بخوبی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ کفار کے ساتھ دوستی رکھنا جائز نہیں ہے لیکن اگر جان خطرہ میں ہو تو تقیہ کرتے ہوئے ان سے ظاہری طور پر دوستی کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ

جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لے سوائے اس کے جسے کفر پر مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو (تو کوئی حرج نہیں ہے) لیکن وہ شخص جس کے سینہ میں کفر کے لئے کافی جگہ پائی جاتی ہو اس کے اوپر خدا کا غضب ہے اور اس کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔(۶۲)

مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے: ایک دن کفار نے جناب عمار ابن یاسر کو ان کے ماں باپ کے ہمراہ گرفتار کر لیا اور ان سے کہنے لگے کہ اسلام کو چھوڑ کر کفر و شرک اختیار کر لو تو عمار بن یاسر کے ہمراہ افراد نے ان کے جواب میں توحید و رسالت کی گواہیاں دینا شروع کر دیں جس پر کفار نے ان میں سے بعض کو شہید کر ڈالا اور بعض پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھانے لگے اس وقت جناب عمار نے اپنے باطنی عقیدے کے برخلاف تقیہ اختیار کر کے ظاہری طور پر کفر کے کلمات کو اپنی زبان پر جاری کیا تو کفار نے انہیں چھوڑ دیا پھر اسکے بعد جناب عمار انتہائی پریشانی کے عالم میں رسول خدا کی خدمت میں پہنچے تو آنحضرت نے انہیں تسلی دی اور پھر اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی۔(۶۳)

اس آیت اور اس کی تفسیر سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر خداؐ کے زمانے میں اصحاب بھی جان و مال کی حفاظت کے لئے اپنے باطنی عقیدے کو چھپا کر تقیہ کرتے تھے۔

بنی امیہ اور بنی عباس کے ظالم حکمران ہمیشہ شیعوں سے برسر پیکار رہے ہیں اور انہوں نے شیعوں کے قتل عام میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے (۶۴)

اس بنا پر اس زمانے میں شیعوں نے قرآن مجید کے حکم کے مطابق انتہائی سخت حالات میں اپنے سچے عقائد چھپا کر اپنی اور دوسرے مسلمان بھائیوں کی جانیں محفوظ کی تھیں واضح ہے کہ اس ظلم وستم کی فضا میں شیعوں کے لئے تقیہ کے علاوہ کوئی ایسا چارۂ کار نہیں تھا جو شیعوں کو نابودی سے بچا تا لہذا اگر وہ ظالم حکام شیعوں کے دشمن نہ ہوتے اور شیعوں کا بے گناہ قتل عام نہ کرتے تو ہرگز شیعہ تقیہ اختیار نہ کرتے یہاں پر اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ تقیہ صرف شیعوں سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسرے مسلمان بھی جب اپنے ایسے دشمنوں کے مقابلے میں قرار پاتے ہیں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے دشمن ہیں (جیسے کہ خوارج اور وہ ظالم حکومتیں جو ہر حرام کام کو جائز سمجھتی ہیں) اور ان سے مقابلہ کی طاقت بھی نہیں ہوتی تو وہ اپنی جان کی حفاظت کی خاطر تقیہ کا سہارا لیتے ہیں اس بنیاد پر اگر اسلامی معاشرے کے تمام افراد اپنے فقہی مذاہب میں اتفاق رائے رکھتے ہوئے وحدت واخوت کی زندگی گزارنا شروع کر دیں تو پھر ہرگز انھیں تقیہ کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

نتیجہ: گزشتہ بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

۱۔تقیہ کی اساس قرآن مجید پر ہے اور صدر اسلام میں پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب بھی تقیہ کرتے تھے اور آنحضرتؐ ان کے اس عمل کی تائید فرماتے تھے یہ سب تقیہ کے جائز ہونے کی دلیلیں ہیں۔

۲۔شیعہ اپنے مذہب کو بچانے اور دشمنوں کے سفاکانہ قتل عام سے محفوظ رہنے کے لئے تقیہ کرتے تھے۔

۳۔تقیہ صرف شیعوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسرے مسلمان بھی تقیہ کرتے ہیں۔

۴۔تقیہ کرنا اور اپنے باطنی عقائد چھپانا صرف کفار کے مقابلے میں ہی انجام نہیں پاتا بلکہ تقیہ کا معیار (مسلمانوں کی جان بچانا) عمومیت رکھتا ہے اور ہر ایسے ظالم دشمن کے سامنے کہ جس کے ساتھ مقابلے کی قدرت نہ ہو یا اس سے جہاد کرنے کی شرائط پوری نہ ہو رہی ہوں تقیہ ضروری ہو جاتا ہے۔

۵۔اگر مسلمانوں میں مکمل وحدت اور ہم فکری پیدا ہو جائے تو ہرگز ان کے درمیان تقیہ کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

حوالہ جات

(۱)اسد الغابۃ جلد ا ص ۱۱، ۱۲ طبع مصر

(۲) گذشتہ حوالہ

(۳)اسد الغابۃ جلد ا ص ۱۱، ۱۲

(۴) گذشتہ حوالہ

(۵) الاستعیاب فی اسماء الاصحاب جلد ا ص ۲ ''الاصابۃ'' کے حاشیے میں اسد الغابۃ جلد ا صفحہ ۳ میں ابن اثیر سے نقل کرتے ہوئے۔

(۶)سورہ حدید آیت: ۱۰

(۷)سورہ توبہ آیت: ۱۰۰

(۸)سورہ فتح آیت: ۱۸

(۹)سورہ حشر آیت: ۸

(۱۰)سورہ فتح آیت: ۲۹

(۱۱)سورہ منافقون آیت: ۱

(۱۲)سورہ توبہ آیت: ۱۰۱

(۱۳)سورہ احزاب آیت: ۱۲۔

(۱۴)سورہ توبہ آیت: ۱۰۲۔

(۱۵) جامع الاصول (ابن اثیر) جلد ۱۱ کتاب الحوض فی ورود الناس علیہ ص ۱۲۰ حدیث نمبر ۷۹۷۲۔

(۱۶) جامع الاصول جلد ۱۱ ص ۱۲۰ حدیث ۷۹۷۳

(۱۷) اس بارے میں مزید وضاحت کے لئے سورہ منافقون ملاحظہ کریں

(۱۸)سورہ رعد آیت: ۱۵

(۱۹) صحیح بخاری کتاب الصلوۃ ص ۹۱

(۲۰) بحار الانوار جلد ۸۵ ص ۱۴۷ ''علل الشرائع'' سے نقل کرتے ہوئے

(۲۱)سنن بیہقی جلد ا ص ۲۱۲ (باب التیمم بالصعید الطیب) صحیح بخاری جلد ا کتاب الصلوۃ ص ۱۹۱ اقتضاء

الصراط المستقیم (ابن تیمیہ) ص ۳۳۲۔

(۲۲) کنز العمال جلد ۷ ص ۴۶۵ حدیث نمبر ۱۹۸۰۹ کتاب الصلوۃ السجود وما یتعلق بہ

(۲۳) احکام القرآن (جصاص حنفی جلد ۳ ص ۲۰۹ باب السجود علی الوجہ)

(۲۴) سنن بیہقی جلد ۲ ص ۴۲۱ کتاب الصلوۃ علی الخمرہ۔

(۲۵) گذشتہ حوالہ۔

(۲۶) سنن بیہقی جلد ۱ ص ۴۳۹ کتاب الصلوۃ باب ماروی فی التعجیل بھافی شدۃ الحر۔

(۲۷) "الطبقات الکبری" جلد ۶ ص ۷۹ طبع بیروت مسروق بن اجدع کے حالات کو بیان کرتے ہوئے۔

(۲۸) اس سلسلے میں مزید شواہد کے لئے علامہ امینیؒ کی کتاب "سیرتنا" کی طرف مراجعہ فرمائیں۔

(۲۹) سنن بیہقی جلد ۲ ص ۱۰۵ (مطبوعہ حیدرآباد دکن) کتاب الصلوۃ باب الکشف عن السجدۃ فی السجود

(۳۰) ازرقی، اخبار مکہ جلد ۳ ص ۱۵۱

(۳۱) سنن بیہقی جلد ۲ ص ۱۰۵

(۳۲) گذشتہ حوالہ

(۳۳) وسائل الشیعہ جلد ۳ ص ۵۹۳ کتاب الصلوۃ ابواب مایسجد علیہ، حدیث نمبر ۷۔

(۳۴) وسائل الشیعہ جلد ۳ ص ۵۹۱ کتاب الصلوۃ ابواب مایسجد علیہ، حدیث نمبر ۱۔

(۳۵) الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۱ ص ۱۶۱ طبع مصر کتاب الصلوۃ، بحث سجود۔

(۳۶) لسان العرب، جلد ۱۱ ص ۴۳۷۔

(۳۷) سورہ مائدہ آیت: ۳۵۔

(۳۸) تفسیر درالمنثور جلد ۲ ص ۲۸۰ مطبوعہ بیروت اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

(۳۹) سورہ یوسف آیت نمبر ۹۷ اور ۹۸۔

(۴۰) مسند احمد بن حنبل، جلد ۴ ص ۱۳۸ روایات عثمان بن حنیف، مستدرک حاکم؛ جلد ۱ کتاب صلوۃ التطوع طبع بیروت ۳۱۳، سنن ابن ماجہ جلد ۱ ص ۴۴۱ طبع دار احیاء الکتب العربیہ "التاج" جلد ۱ ص ۲۸۶، الجامع الصغیر (سیوطی) ص ۵۹، التوسل والوسیلہ (ابن تیمیہ) ص ۹۸ طبع بیروت۔

(۴۱) التوصل الی حقیقۃ التوسل ص ۱۵۸ طبع بیروت۔

(۴۲) صحیح بخاری جز ۲ کتاب الجمعہ باب الاستسقاء ص ۲۷ طبع مصر۔

(۴۳) الدرالسنیہ، مؤلفہ سید احمد بن زینی دحلان ص ۲۹ طبرانی سے نقل کرتے ہوئے۔

(۴۴)الصواعق المحرقہ،مؤلفہ ابن حجر عسقلانی ص ۱۷۸ طبع قاہرہ۔

(۴۵)"الفقہ علی المذاھب الاربعہ" کتاب الصلوۃ الجمع بین الصلاتین تقدیمًا وتاخیرً ا، سے اقتباس

(۴۶)مسند احمد ابن حنبل، جلد ا ص ۲۲۱

(۴۷)مسند احمد، جلد ا ص ۲۵۱۔

(۴۸)موطأ مالک،کتاب الصلوۃ طبع ۳(بیروت)ص ۱۲۵ حدیث ۱۷۸ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۵۱ طبع بیروت، باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر۔

(۴۹)موطأ پر زرقانی کی شرح، جزاول باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر والسفر ص ۲۹۴ طبع مصر۔

(۵۰)گزشتہ حوالہ۔

(۵۱)صحیح مسلم جزء ۲ ص ۱۵۲ باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر،طبع مصر

(۵۲)یہ مطلب گزشتہ کتاب کے صفحہ ص ۱۵۲ میں اسی حدیث کے ذیل میں مذکور ہے۔

(۵۳)صحیح بخاری جزاول ص ۱۱۰ کتاب الصلوۃ باب تاخیر الظہر الی العصر طبع مصر نسخہ امیریہ ۱۳۱۴ھ۔

(۵۴)گزشتہ حوالہ۔

(۵۵)صحیح مسلم جز ۲ ص ۱۵۳ باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر

(۵۶)کنز العمال کتاب الصلوۃ، باب الرابع فی صلاۃ المسافر باب جمع جلد ۸ ص ۲۴۶ طبع احلب ۱۳۹۱ھ

(۵۷)کنز العمال کتاب الصلوۃ، باب الرابع فی صلوۃ المسافر باب جمع جلد ۸ ص ۲۴۷ طبع احلب۔

(۵۸)گزشتہ حوالہ۔

(۵۹)سرف مکہ سے نو میل کے فاصلے پر واقع مقام کا نام ہے (یہ بات کنز العمال سے اسی حدیث کے ذیل سے ماخوذ ہے)

(۶۰)الفقہ علی المذاھب الاربعہ،کتاب الصلوۃ،الجمع بین الصلوٰتین تقدیما وتاخیرا۔

(۶۱) سورہ آل عمران آیت:۲۸۔

(۶۲) سورہ نحل آیت:۱۰۶

(۶۳)اس سلسلے میں جلال الدین سیوطی کی تفسیر درالمنثور جلد ۴ ص ۱۳۱ (طبع بیروت) کا مطالعہ کیجئے۔

(۶۴)بنی امیہ اور بنی عباس کے حکام کے حکم پر شیعوں کے بے رحمانہ قتل عام کے سلسلے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لئے ان کتابوں "مقاتل الطالبین" (مصنفہ ابوالفرج اصفہانی) "شہداء الفضیلۃ (مصنفہ علامہ امینی)"، "الشیعہ والحاکمون" (مصنفہ محمد جواد مغنیہ) کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

آیات موضوعی

صلہ رحم

الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَ يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُوْلَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُون

جو اللہ کے ساتھ محکم عہد باندھنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں اور اللہ نے جس رشتے کو جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے قطع کر دیتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔(بقرہ:۲۷)

سلام کا جواب دینا

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّواْ بِأَحْسَنَ مِنهَا أَوْ رُدُّوهَا إِنَّ اللهَ كَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا

اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر سلام کرو یا انہی الفاظ سے جواب دو اللہ یقیناً ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔(نساء:۸۶)

دوسروں کے معبودوں کو گالی دینے سے منع

وَلَا تَسُبُّواْ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللهِ فَيَسُبُّواْ اللهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ

گالی مت دو ان کو جن کو یہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں مبادہ وہ عداوت اور نادانی میں اللہ کو برا کہنے لگیں۔

(انعام:۱۰۸)

اسراف سے منع

كُلُواْ وَاشْرَبُواْ وَلَا تُسْرِفُواْ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ

کھاؤ اور پیو مگر اسراف نہ کرو اللہ اسراف کرنے والوں کو یقیناً دوست نہیں رکھتا(اعراف:۳۱)

تقویٰ، سب سے بہترین لباس

يَابَنِي ءَادَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِى سَوْءَاتِكُمْ وَ رِيشًا وَ لِبَاسُ التَّقْوَى ذَالِكَ خَيْرٌ ذَالِكَ مِنْ ءَايَاتِ اللهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُون

اے فرزندان آدم ہم نے تمہارے لیے لباس نازل کیا جو تمہارے شرم کے مقامات کو چھپائے اور تمہارے لیے آرائش بھی ہو اور سب سے بہترین لباس تو تقویٰ ہے، یہ اللہ کی نشانیوں سے ہے شاید یہ لوگ نصیحت حاصل کریں (اعراف:۲۶)

مومن کی علامت

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَ إِذَا تُلِيَتْ عَلَيهِمْ ءَايَاتُهُ زَادَتهمْ إِيمَانًا وَ عَلَىَ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُون

مومن تو صرف وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں ۔(انفال:۲)

تحصیل علم دین

وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُواْ كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كلُ فِرْقَةٍ مِّنهُمْ طَائفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُواْ فِى الدِّينِ وَ لِيُنذِرُواْ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُواْ إِلَيهِمْ لَعَلَّهُمْ يحذرون

اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب مومنین نکل کھڑے ہوں، پھر کیوں نہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے تا کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو انہیں عذاب الٰہی سے ڈرائے کہ شاید وہ اسی طرح ڈرنے لگیں ۔(توبہ:۱۲۳)

ذکر خدا، باعث اطمینان قلب

الَّذِينَ ءَامَنُواْ وَ تَطْمَئنِ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللهِ أَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئنِ الْقُلُوب

(یہ لوگ ہیں) جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل یادِ خدا سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور یاد رکھو! یاد خدا سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے ۔(رعد:۲۸)

اللہ کی بے شمار نعمتیں اور انسان کی ناشکری

وَ ءَاتَىٰكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللهِ لَا تُحْصُوهَا إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّار

اور اس نے تمہیں ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہ کر سکو گے انسان یقینا بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔(ابراہیم:۳۴)

فضول خرچ، شیطان کا بھائی

وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَ كَانَ الشَّيْطَٰنُ لِرَبِّهِ كَفُورًا

اور فضول خرچی نہ کیا کرو فضول خرچی کرنے والے یقینا شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔(اسراء:۲۶،۲۷)

پاکدامنی

قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ إِنَّ اللهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ○ وَ قُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَ لَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَ لَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ

آپ مومن مردوں سے کہہ دیجئے، وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے پاکیزگی کا باعث ہے اللہ کو ان کے اعمال کا یقینا خوب علم ہے اور مومنہ عورتوں سے بھی کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زیبائش (کی جگہوں) کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے کہ جو اس میں سے خود ظاہر ہو اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رکھیں اور اپنی زیبائش کو ظاہر نہ ہونے دیں (نور:۳۰،۳۱)

مقام شہید

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ

اور جو لوگ راہ خدا میں مارے گئے ہیں قطعاً انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس سے رزق پا رہے ہیں۔(آل عمران:۱۶۹)

حق کی مخالفت کرنے والوں کی سزا

وَ مَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكاً وَ نَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمَى

اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اسے یقینا ایک تنگ زندگی نصیب ہوگی اور بروز قیامت ہم اسے اندھا محشور کریں گے۔(طٰہٰ:۱۲۴)

دین خدا کو جزء جزء کرنا دشمن کی سازش

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَالِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَ مَا اللهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُون

کیا تم کتاب کے کچھ حصے پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصے سے کفر اختیار کرتے ہو؟ پس تم میں سے جو ایسا کرے دنیاوی زندگی میں اس کی سزا رسوائی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے اور آخرت میں ایسے لوگ سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔(بقرہ:۸۵)

مشاورت

وَ الَّذِينَ اسْتَجَابُواْ لِرَبِّهِمْ وَ أَقَامُواْ الصَّلَوٰةَ وَ أَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُون

اور جو اپنے پروردگار کو لبیک کہتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات باہمی مشاورت سے انجام دیتے ہیں اور ہم نے جو رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں

(شوریٰ:۳۸)

صاحبان عقل

الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُوْلَئِكَ الَّذِينَ هَدٰهُمُ اللهُ وَ أُوْلَئِكَ هُمْ أُوْلُواْ الْأَلْبَاب

جو باتوں کو سنتے ہیں اور اس میں سے بہتر کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی صاحبان عقل ہیں (زمر:۱۸)

آزمائش، فلسفۂ خلقت انسان

الَّذِی خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الحیوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ أَیُّکُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَ ھُوَ الْعَزِیزُ الْغَفُور

اس نے موت اور حیات کو اس لئے پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے عمل کے اعتبار سے کون بہتر ہے اور وہ بڑا غالب آنے والا، بخشنے والا ہے۔ (ملک: ۲)

توبہ کا اثر

مَن تَابَ وَ ءَامَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُوْلَئکَ یُبَدِّلُ اللهُ سَیَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَ کَانَ اللهُ غَفُورًا رَّحِیمًا

جنہوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور نیک عمل انجام دیا تو اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے اور اللہ تو بڑا غفور و رحیم ہے (فرقان: ۷۰)

قیامت کے دن ہر شخص اپنے امام کے ساتھ محشور ہوگا

یَوْمَ نَدْعُوا کُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِم

قیامت کے دن ہر گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے (اسراء: ۷۱)

دنیا میں بے بصیرتی، آخرت کی بے بصیرتی کا باعث

وَ مَن کَانَ فِی هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِی الْأَخِرَةِ أَعْمَى وَ أَضَلُّ سَبِیلا

اور جو شخص اس دنیا میں اندھا (بے بصیرت) رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ اندھے سے بھی زیادہ گمراہ ہوگا۔ (اسراء: ۷۲)

تنظیمی اقدار از سفیر انقلاب

Time Management

ڈاکٹر محمد علی نقوی ؒ وقت کو اتنا استعمال کرتے کہ وقت تھک کر آپ کی گود میں آرام کرتا تھا۔ کھانا کھاتے، غسل کرتے، کپڑے بدلتے، احباب سے ملتے، یہاں تک کہ گاڑی چلاتے تو آپ کو ہر پل وقت کا خیال رہتا۔ کپڑے بدل کر شیشے کے سامنے دیکھنا یا زلفیں سنوارنا تو آپ کے آئین حیات کے منافی تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ آپ گھر میں کپڑے بدلتے بدلتے بیلٹ ہاتھ میں لیتے، بالوں پر ہاتھ مارتے ہوئے گھر سے جلدی نکلتے، بیلٹ اور جوتوں کے تسمے گاڑی میں ٹھیک کرتے۔ ایک مرتبہ بوٹوں کے بارے میں کسی دوست نے کہا کہ جوتے اچھے ہیں، آپ کہنے لگے دوڑنے میں مدد دیتے ہیں مگر خامی یہ ہے کہ تسمے باندنے میں وقت ضائع ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ پسندیدہ عمل

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

قال اللہ عزوجل مَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدٌ بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ

خدا وند تعالیٰ فرماتا ہے: کوئی شخص واجبات پر عمل پیرا ہوئے بغیر مجھ سے زیادہ نزدیک نہیں ہوسکتا۔(یعنی واجبات کی ادائیگی خداوندعالم کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ عمل ہے)

(کافی: ج ۲ص ۲۵۲)

ماں باپ کی اہمیت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

رِضَا الرَّبِّ فِي رِضَا الْوَالِدَيْنِ وَسَخَطُهُ فِي سَخَطِهِمَا

اللہ کی خوشنودی ماں باپ کی خوشی میں ہے اور اس کا غضب و ناراضگی والدین کی ناراضگی میں ہے۔

(نہج الفصاحۃ: ص ۵۰۳)

نماز کا مقام

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَوْضِعُ الصَّلَاةِ مِنَ الدِّينِ كَمَوْضِعِ الرَّأْسِ مِنَ الْجَسَدِ

نماز کا مقام دین میں ایسے ہی ہے جیسے سر کا مقام بدن پر ہوتا ہے۔

(مواعظ العددیہ: ص ۶۹)

پہلے سلام پھر کلام

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ابْدَءُوا بِالسَّلَامِ قَبْلَ الْكَلَامِ فَمَنْ بَدَأَ بِالْكَلَامِ قَبْلَ السَّلَامِ فَلَا تُجِيبُوه

بات کرنے سے پہلے سلام کرو۔ جو سلام کے بغیر بات شروع کرے اسکی بات کا جواب نہ دو۔

(کافی: ج ۲، ص ۶۴۴)

ترک گناہ، مغفرت کا سبب

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

مَرَّ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ (علیهما السلام) عَلَى قَوْمٍ يَبْكُونَ فَقَالَ عَلَى مَا يَبْكِي هَؤُلَاءِ فَقِيلَ يَبْكُونَ عَلَى ذُنُوبِهِمْ قَالَ فَلْيَدَعُوهَا يُغْفَرْ لَهُمْ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک گروہ کے پاس سے گزر ہوا جو رو رہے تھے۔ پوچھا کیوں رو رہے ہو۔ جواب دیا اپنے گناہوں پر رو رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر ان گناہوں کو ترک کر دو تو (یہ ترک کرنا) ان گناہوں کی مغفرت کا سبب بنے گا۔

(بحارالانوار: ج ۶، ص ۲۰)

بعض گناہوں کے آثار

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

نَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الذُّنُوبِ الَّتِي تُعَجِّلُ الْفَنَاءَ وَ تُقَرِّبُ الْآجَالَ وَ تُخْلِي الدِّيَارَ وَ هِيَ قَطِيعَةُ الرَّحِمِ وَ الْعُقُوقُ وَ تَرْكُ الْبِرِّ

ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں ان گناہوں سے جو بہت جلد نابود کرتے ہیں اور موت کو قریب کرتے ہیں اور گھروں کو ویران کر دیتے ہیں۔ اور یہ گناہ قطع رحم، ماں باپ کی نافرمانی اور نیکی اور احسان کو ترک کرنا ہے۔

(کافی: ج ۲، ص ۴۴۸)

اہلبیت علیہم السلام کی اطاعت کا ثمرہ

حضرت زہراء سلام اللہ علیہا نے فرمایا:

فَفَرَضَ اللهُ طَاعَتَنَا نِظَاماً لِلْمِلَّةِ، وَإِمَامَتَنَا أَمَاناً مِنَ الْفُرْقَةِ

خداوند عالم نے ہم اہلبیتؑ کی اطاعت اور پیروی کو امت اسلامی کا نظم و نسق برقرار رکھنے اور ہماری امامت کو تفرقہ اور اختلاف سے محفوظ رہنے کا سبب قرار دیا۔

(بحارالانوار: ج۲۹،ص۲۴۱)

لمبی آرزو آخرت کی فراموشی کا سبب

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِيَ الْهَوَى وَ طُولُ الْأَمَلِ أَمَّا الْهَوَى فَإِنَّهُ يَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَ أَمَّا طُولُ الْأَمَلِ فَيُنْسِي الْآخِرَةَ

مجھے میری امت پر سب سے زیادہ خوف، ہوائے نفس اور لمبی آرزوؤں کا ہے۔ اس لیے کہ ہوائے نفس راہ حق سے روک دیتی ہے اور لمبی آرزوئیں آخرت کو بھلا دیتی ہے۔

(وسائل الشیعہ: ج۲،ص۴۳۸)

بندگی پانچ چیزوں میں ہے

امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

الْعُبُودِيَّةُ خَمْسَةُ أَشْيَاءَ خَلَاءُ الْبَطْنِ وَ قِرَاءَةُ الْقُرْآنِ وَ قِيَامُ اللَّيْلِ وَ التَّضَرُّعُ عِنْدَ الصُّبْحِ وَ الْبُكَاءُ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ

اطاعت اور بندگی پانچ چیزوں میں ہے:؛ پیٹ خالی رکھنا،؛ قرآن کریم کی تلاوت کرنا،؛ رات کو عبادت کرنا،؛ صبح کے وقت تضرع اور گریہ کرنا (سحر خیزی)،؛ خوف خدا سے گریہ و زاری کرنا۔

(مستدرک الوسائل: ج۱۱،ص۲۴۴)

ولایت اور اطاعت

امام رضا علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ كَانَ مِنَّا لَمْ يُطِعِ اللهَ فَلَيْسَ مِنَّا وَ أَنْتَ إِذَا أَطَعْتَ اللهَ فَأَنْتَ مِنَّا أَهْلَ البيتْ

جو شخص اپنے آپ کو ہم میں سے سمجھے اور خدا کی اطاعت نہ کرے ہم میں سے نہیں ہے۔ اور اگر تم اللہ کی اطاعت کرتے ہو تو ہم اہلبیت میں سے ہو۔ (بحار الانوار: ج ۴۳ ص ۲۳۰)

ترک گناہ کی فضیلت

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَا الْمُجَاهِدُ الشَّهِيدُ فِي سَبِيلِ اللهِ بِأَعْظَمَ أَجراً مِمَّنْ قَدَرَ فَعَفَّ لَكَادَ الْعَفِيفُ أَنْ يَكُونَ مَلَكاً مِنَ الْمَلَائِكَةِ

وہ شخص جو جہاد کرے اور جام شہادت نوش کرے اس شخص سے بلند مقام نہیں رکھتا جو گناہ پر قدرت رکھتا ہو لیکن اپنے دامن کو گناہ سے آلودہ نہ کرے۔ ممکن ہے کہ وہ پاکدامنی کے اس مقام پر پہنچ جائے کہ ملائکہ میں سے ایک ملک ہو جائے۔ (نہج البلاغہ: حکمت ۴۷۴)

خالصانہ عمل

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں:

مَنْ أَصْعَدَ إِلَى اللهِ خَالِصَ عِبَادَتِهِ أَهْبَطَ اللهُ عَزَّوَ جَلَّ إِلَيْهِ أَفْضَلَ مَصْلَحَتِهِ

ہر وہ شخص جو اپنے خالصانہ عمل کو خداوند عالم کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے خدا بھی اپنی بہترین مصلحت اس کے حق میں قرار دیتا ہے۔ (بحار الانوار: ج ۶۸، ص ۲۴۹)

دنیا اور آخرت کیلئے عمل

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

اعْمَلْ لِدُنْيَاكَ كَأَنَّكَ تَعِيشُ أَبَداً وَ اعْمَلْ لِآخِرَتِكَ كَأَنَّكَ تَمُوتُ غَداً

اپنی دنیا کے لئے اس طرح عمل کرو کہ گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، اور اپنی آخرت کے لئے ایسے عمل کرو کہ گویا تمہیں کل ہی مر جانا ہے۔ (من لا یحضرہ الفقیہ: ج ۳ ص ۱۵۶)

حضرت امام مہدیؑ اور آپ کی معرفت کا فائدہ

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اِعْرِفْ إِمَامَكَ فَإِنَّكَ إِذَا عَرَفْتَ لَمْ يَضُرَّكَ تَقَدَّمَ هٰذَا الْأَمْرُ أَوْ تَأَخَّرَ

اپنے امام کی معرفت حاصل کرو کیونکہ جب تم اپنے امام کی معرفت حاصل کرلو گے تو پھر آپ کے لئے فرق نہیں کرنا کہ آپ کا ظہور جلدی ہو یا دیر سے ہو۔

(کافی: ج۳، ص۱۷۱)

مومن اور منافق کی شناخت

حضرت امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِيَّاكَ وَ مَا تَعْتَذِرُ مِنْهُ فَإِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يُسِيءُ وَ لَا يَعْتَذِرُ وَ الْمُنَافِقُ يُسِيءُ كُلَّ يَوْمٍ وَ يَعْتَذِرُ

تم ہر اس چیز سے بچو جس پر تمہیں معذرت کرنا پڑے۔ مومن نہ برائی کرتا ہے نہ ہی عذر پیش کرتا ہے جب کہ منافق ہر روز برائی کرتا ہے اور ہر روز عذر خواہی کرتا ہے۔

(وسائل الشیعہ: ج۱۶، ص۱۵۹)

دوست اور دشمن

حضرت امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ أَحَبَّكَ نَهَاكَ وَ مَنْ أَبْغَضَكَ أَغْرَاكَ

دوست وہ ہے جو تمھیں برائی سے بچائے دشمن وہ ہے جو تمھیں برائیوں کی ترغیب دلائے۔

(بحارالانوار: ج۷۵، ص۹۰)

غیبت

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِيَّاكَ وَ الْغِيبَةَ فَإِنَّهَا إِدَامُ كِلَابِ النَّارِ

غیبت کرنے سے پرہیز کرو کیوں کہ یہ جہنم کے کتوں کی خوراک ہے۔

(بحارالانوار: ج۷۲، ص۱۶۲)

بغیر توقع کے عطا

حضرت امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنَّ أَجْوَدَ النَّاسِ مَنْ أَعْطَى مَنْ لَا يَرْجُوه

سب سے بڑا سخی وہ انسان ہے جو کسی ایسے کو عطا کرے جس سے کسی قسم کی توقع نہ ہو۔

(بحارالانوار: ج ۱۷، ص ۴۰۰)

زبان کی حفاظت گناہ سے بچاؤ

امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

لَا يَسْلَمُ أَحَدٌ مِنَ الذُّنُوبِ حَتَّى يَخْزُنَ لِسَانَهُ

کوئی بھی شخص گناہوں سے نہیں بچ سکتا مگر یہ کہ وہ اپنی زبان کی حفاظت کرے۔

(بحارالانوار: ج ۷۵، ص ۱۷۸)

خدا کا محبوب عمل

امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

مَا مِنْ شَيْءٍ أَحَبَّ إِلَى اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ مِنْ عَمَلٍ يُدَاوَمُ عَلَيْهِ وَإِنْ قَلَّ

خدا کی نزدیک اس عمل سے زیادہ محبوب کوئی عمل نہیں ہے جس پر مداومت کی جائی اور پابندی کے ساتھ بجالایا جائے خواہ وہ عمل کم ہی کیوں نہ ہو۔

(کافی: ج ۲، ص ۸۲)

دعائے وحدت

اَللّٰہُ اَکبَر اَللّٰہُ اَکبَر اَللّٰہُ اَکبَر

لا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ اِلھاً واحِداً و نَحنُ لَہُ مُسلِمونَ

لا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ و لا نَعبُدُ اِلاَّ ایّاہُ مُخلِصینَ لَہُ الدّینَ وَ لو کَرِہَ المُشرِکونَ

لا اِلٰہَ الاَّ اللّٰہُ رَبُّنا و رَبُّ ابائِنَا الاَوَّلینَ

لا اِلٰہَ الاَّ اللّٰہُ وَحدَہُ وَحدَہُ وَحدَہُ اَنجَزَ وَعدَہُ و نَصَرَ عَبدَہُ

وَ اَعَزَّ جُندَہُ وَ ھَزَمَ الاَحزابَ وَحدَہُ

فَلَہُ اَلمُلکُ و لَہُ الحَمدُ

یُحیی و یُمیتُ و یُحیی وَ ھُوَ حَیٌّ لا یَموُتُ

بِیَدِہِ الخَیرُ و ھُوَ عَلٰی کُلِ شَیءٍ قَدیرٌ